آگے سمندر ہے
اِنتظار حسین

آگے سمندر ہے

اِنتظار حسین

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Intizar Hussain
Aagay samunder hai/
Intizar Hussan. - Lahore :
Sang-e-Meel Publications,1998.
323p
1- Urdu adab . 2 . Novel.
1 .Title.

1998
نیاز احمد نے
سنگِ میل پبلی کیشنز
سے شائع کی۔

قیمت =/ ۲۱۰ روپے

ISBN - 969 - 35 - 0616 - 2

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
Sang-e-Meel Publications
25-Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O BOX 997 Lahore 54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax:7245101
http://www.sang-e-meel.com email: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan.
Phone : 7667970

آر، آر پرنٹرز، لاہور

وہی گلشن ہے لیکن وقت کی رفتار تو دیکھو
کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

احمد مشتاق

(1)

"یہ اصل میں اس زمانے کا ذکر ہے جب عبدالرحمٰن اول کے بوئے ہوئے کھجور کے درخت پر سوا دو سو برس گزر چکے تھے اور اس کے آس پاس کتنے درخت اگ چکے تھے۔ صحرائے عرب کی حور اندلس میں رچ بس چکی تھی۔ قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، طلیطلہ کے گھروں کے صحن اب اس کے اپنے گھر تھے۔ اور اشبیلیہ میں بیٹھے ہوئے بزرگ شیخ ابوالحجاج یوسف الشربولی کے کچے گھر کے صحن میں کنوئیں کے برابر کھڑی کھجور اتنی پھیل گئی تھی کہ مریدوں کو وضو کے لئے کنوئیں سے------"

"یار جواد" مجو بھائی نے مجھے گھور کے دیکھا اور میری بات بیچ کی بیچ ہی میں رہ گئی۔ "تم عجیب آدمی ہو۔"

"کیوں، کیا ہوا۔"

"بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور تم اسے کہاں لے گئے۔ بات کو گول کرنا کوئی تم سے سیکھے۔"

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی، اب میں خود مخمصہ میں پڑ گیا۔ اصل میں بات درختوں پر آ جائے تو پھر میرے لئے اور سب باتیں پیچھے چلی جاتی ہیں۔ تو اب میری دانست میں تو بات درختوں ہی سے شروع ہوئی تھی۔ مگر آخر اس سے پہلے بھی تو کوئی بات ہوئی ہوگی جس سے درختوں کے ذکر کی تقریب پیدا ہوگئی۔ مگر اس طرح سے دیکھیں تو پھر تو کسی بات کی ابتداء کا پتہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ ہر بات سے پہلے بھی

کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ تو بس سمجھ لیجئے کہ بات درختوں سے چلی تھی۔ عجب بات ہے، بات کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔ مگر ختم کہاں ہوتی ہے۔ یہی تو مسئلہ ہے، کاش کہیں جا کر ختم بھی ہو جایا کرتی۔ تو اصل میں بات درختوں ہی سے چلی تھی۔ بلی کی بات تو بعد میں نکلی، بالکل اسی طرح جیسے بات سے بات نکلتی ہے۔ کہیں بعد میں جا کر وہ میرے لئے ماجرا بنی۔ اس دھرتی پر سب سے بڑا ماجرا تو درخت ہے۔ دیکھنے میں جھاڑ جھنکاڑ، کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی۔ بس کھڑے ہیں، مگر کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کوئی درخت ایک ماجرا بن جائے۔ بھاری کولھوں لمبی سڈول رانوں والی تاراولی اپنے سوامی کے سنگ چلی جا رہی تھی کہ بیچ رستے میں ایکا ایکی آندھی چل پڑی۔ پھر کیا ہوا۔ آندھی جب تھمی تو تاراولی نے دیکھا کہ اس کا سوامی آس پاس کہیں نہیں ہے اور وہ بن میں اکیلی ہے۔ سوامی تم کہاں ہو۔ بہت پکارا، بہت بلاپ کیا، بیاکل بن بن ماری پھری۔ سوامی کا کہیں کھوج نہ ملا۔ ماری ماری پھر رہی تھی کہ ایک برکش کو دیکھ کے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ سوگندھت پھولوں سے لدا ہوا تھا اور مکھیاں ان پھولوں پہ بھنبھنا رہی تھیں۔ پھولوں کو دیکھ کے وہ موہت ہو گئی۔ پھر کیا ہوا، برکش کی سوگندھ اس پہ ایسی چھائی کہ وہ مکھی بن گئی۔ مکھی بن کے وہ بھی مکھیوں کے سنگ اڑ کے ایک پھول پہ جا بیٹھی۔ مکھی بن گئی پر سوامی کو نہیں بھولی، پھول پہ بیٹھے بیٹھے وہ سوامی کو یاد کر کے روئی۔ آنکھ سے جو آنسو ٹپکا اس سے وہ پھول تر بتر ہو گیا۔ اسی آن اس نے دیکھا کہ اس کا سوامی تو اسی برکش کی چھاؤں میں بسرام کر رہا ہے۔ وہ تو پھول سماں کھل اٹھی اور آن کی آن میں پھر مکھی سے تاراولی بن گئی۔ بچھڑے مل گئے اور اپنے رستے پہ چل پڑے۔ پھر کیا ہوا، وہ جو ایک پھول تاراولی کے آنسو سے شرابور ہو گیا تھا اس سے ایک پھل پھوٹ پڑا۔ اور ایسا ہوا کہ اس گھڑی جب ایک جوگی اس برکش کے پاس سے ہو کر جا رہا تھا وہ پھل پک کے گرا اور گر کے پھٹ گیا۔ پھٹا تو اس کے بھیتر سے ایک سندری نکلی، کولھے بھاری، گات پھولوں کی کیاری، بال گھٹا سے، گال لال لال، ہونٹ رس بھرے، نین مرگ کے سے، ہاتھ جوڑ کے جوگی جی کو پرنام کیا اور چرن چھوئے، جوگی نے اسے دیکھ کے اچرج کیا، پر ترنت ہی اپنی ودیا سے اسے پہچان لیا "یہ سندری تو تاراولی کی کنیا ہے۔"

"ہے مہاراج، کون تاراولی۔"

"ارے وہی بھاری کولھوں لمبی سڈول رانوں والی تاراولی جو مکھی بن گئی تھی۔ اس بھید بھرے برکش کے موہ میں جو پھنس گئی تھی۔ مکھی بن کے پھول پہ بیٹھی، اس سنجوگ سے پھول پھل لایا اور اس سے تو جنمی۔ اچھا تو تیرا نام ونے وتی ہے آج سے۔ چل میرے ساتھ اور میری کٹیا میں میری پتری بن کر رہ۔ تیرا سوامی بھی بس آتا ہی ہو گا۔"

"مہاراج، میرا سوامی تو کوئی نہیں۔"

"تو نے تو ابھی آنکھ کھولی ہے۔ تجھے کیا پتہ، پر وہ ہے۔ اسی بن میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ ابھی آئے گا، اور پھر اس سے تیرا بواہ ہو گا۔"------ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، کسی ملک میں تھا، کوئی بادشاہ۔ ایک ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ ہاں یہ کہانی مجھے پھوپھی اماں نے سنائی تھی۔ پھوپھی اماں کو کہانیاں بہت یاد تھیں۔ میمونہ اور میں دونوں، وہ ان کی اس بغل میں اور میں ان کی اس بغل میں۔ نہیں پھوپھی اماں، پہلے وہ لکڑہارے والی کہانی۔ ہاں ہاں وہی لکڑہارے والی کہانی ہے۔ اس ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ وہیں کہیں ایک لکڑہارا بھی رہتا تھا۔ بادشاہ کی ایک بیٹی تھی۔ نازوں کی پلی شہزادی، مگر بیچاری ملکہ مر گئی۔ شہزادی یتیم ہو گئی۔ بادشاہ نے دوسری شادی کر لی۔ اے بھیا وہ جو دوسری ملکہ محل میں آئی تو اس نے تو یتیم بچی پہ ایسے ستم ڈھائے کہ روز نو کوڑی بانس اسے لگواتی۔ ایک دن تنگ آ کے وہ شہزادی گھر سے بھاگ جنگل میں نکل گئی۔ پیچھے پیچھے سوتیلی ماں کے بھیجے ہوئے سپاہی۔ کیا کرے کہاں جائے۔ سامنے ایک درخت دکھائی دیا۔ بہت اونچا بہت گھنا۔ جا کے اس سے بولی کہ "اے درخت، تو ہی مجھے چھپا لے۔" اے لو اس درخت کا تو تنا ایک دم سے چٹاخ سے پھٹا۔ وہ جھٹ پٹ اس تنے میں گھس گئی۔ تنا پھر ویسا کا ویسا ہی۔

اب لکڑہارے کی سنو۔ اس کے ایک بیٹا تھا۔ اب وہ جوان ہو چلا تھا۔ باپ نے کہا کہ بیٹا اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ بلے سے لگو۔ یہ کہہ کے اس نے اسے آری کلہاڑی دی اور کہا کہ جنگل میں جا اور درخت کاٹ۔ لکڑہارے کا بیٹا آری کلہاڑی لے کر جنگل میں نکل گیا۔ دیکھا کہ درختوں میں ایک درخت سب سے اونچا سب سے گھنا ہے۔ بس

اس پہ کلہاڑی ماری۔ اندر سے میٹھی سی آواز آئی۔ دھیرے دھیرے۔ پہلے وہ ٹھٹھکا، حیران ہوا۔ خیر ہمت کر کے تنے کو آہستہ آہستہ کاٹنا شروع کیا۔ اندر سے آواز آتی رہی، دھیرے دھیرے۔ جب تنا کٹا تو اے لو اندر سے شہزادی نکلی، چندے آفتاب، چندے ماہتاب، لکڑہارے کے بیٹے کا تو نصیبا جاگ اٹھا۔

"یار جواد" مجو بھائی کتنی دیر سے کسمسا رہے تھے۔ آخر بولے۔ "یہ اپنی بر کش کتھا بند کرو اور اصلی بات بتاؤ۔"

"اصلی بات؟" میری بات کٹ گئی تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔"

"ہاں اصلی بات۔ چھپانے کی کوشش مت کرو۔ اصلی بات بتاؤ۔"

"مجو بھائی کونسی اصلی بات؟"

"آخر تم یہ جو اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو صرف درختوں ہی کو دیکھتے رہے۔ یہ سفر تم نے درختوں کے لئے کیا تھا؟"

اس سوال کا میرے پاس واقعی کوئی جواب نہیں تھا۔ آخر یہ سفر میں نے کیوں کیا تھا۔ اتنے زمانے بعد جو میں ادھر گیا تھا تو کیوں گیا تھا۔ بس درختوں کو دیکھنے؟ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس سفر کا مقصد کیا تھا۔ درختوں کا درشن؟ مگر کیا مضائقہ ہے، آخر میں نے سوچا۔ درختوں کے لئے کیا سفر نہیں کیا جا سکتا اور مجھے پھر کہانیاں یاد آنے لگیں۔ بزرگ نے کہا کہ اے جوان عزیز، مجھے تیری جوانی پہ ترس آتا ہے۔ اب بھی وقت ہے لوٹ جا۔ اے بزرگ، سر میں اب یہی سودا سمایا ہے۔ جو ہو سو ہو۔ تو اے جوان سن، یہاں سے سات سمندر پار ایک گھنا جنگل ہے۔ اس جنگل کے بیچ ایک اونچا گھنا درخت ہے کہ کھکھل میں اس کی ایک اژدھا رہتا ہے اور اس کی سب سے اونچی شاخ میں ایک پنجرا لٹکا ہے۔ پنجرے میں ایک طوطا ہے۔ طوطے میں اس دیو کی جان ہے۔ مگر، اور میرا ذہن یہاں سے اچانک اچٹ کر کہیں اور جا نکلا۔ ابو الحجاج یوسف عجیب بزرگ تھے۔ ایک عمر گزر گئی۔ اور انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ان کے صحن میں ایک کھجور کا پیڑ کھڑا ہے اور اتنا بڑھ پھیل گیا ہے کہ ان کے مریدوں کے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب عبدالرحمٰن اول کے بوئے ہوئے کھجور کے درخت پر سوا دو سو برس گزر چکے تھے اور اس کے آس پاس کتنے درخت اگ چکے تھے۔ صحرائے عرب کی حور اندلس میں رچ بس چکی تھی۔ اب قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کے گھروں کے صحن اس کا اپنا گھر تھے۔ اور اشبیلیہ میں ابوالحجاج یوسف کے کچے گھر کے صحن میں کنوئیں کے برابر کھڑی کھجور اتنی پھیل گئی تھی کہ مریدوں کو وضو کے لئے کنوئیں سے پانی بھرنے میں بہت دشواری پیش آتی تھی۔ تب ایک دن ایک مرید نے یوں عرض کی کہ یا شیخ، یہ کھجور اب اتنی پھیل گئی ہے کہ وضو کے لئے کنوئیں سے پانی بھرنا ہمارے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ شیخ نے مرید کا کلام تعجب سے سنا اور اپنی سفید پلکیں کھول کر سامنے کھڑے کھجور کے گھنے پیڑ کو دیکھا۔ کمال حیرت سے دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ لمبے تامل کے بعد زبان کھولی اور یوں گویا ہوئے کہ خدائے واحد کی قسم، میری عمر انہیں در و دیوار کے بیچ بسر ہوئی ہے، مگر یہ میں آج دیکھ رہا ہوں کہ اس صحن میں ایک نخیل بھی ہے۔

یہ کہہ کر شیخ نے آنکھیں موند لیں اور گود میں بیٹھی کالی بلی کی بالوں بھری پشت پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اسی آن قرطبہ سے چل کر آنے والے ایک خدا رسیدہ بزرگ نے دروازے پر دستک دی۔ تب وہ بلی شیخ کی گود سے اٹھ دروازے پر گئی۔ پچھلے دونوں پنجوں پہ کھڑے ہو کر بزرگ سے گلے ملی۔ تب شیخ بھی اس بزرگ سے اسی محبت سے بغل گیر ہوئے۔

شیخ یوسف عجب تھے۔ بلی سے اتنی الفت اور گھر میں لگی کھجور سے اتنی بے تعلقی، ایک ام رقیہ تھی کہ اپنے شجر کو دیکھ کر جیتی تھی۔ ام رقیہ قرطبہ میں ابوالمنصور کے محل کی دیوار کے پیچھے اپنے چھوٹے سے گھر میں اپنی کھجور کے ساتھ رہتی تھی۔ والی کا سایہ اٹھ جانے کے بعد اب یہی ایک سایہ اس کے سر پر رہ گیا تھا۔ کن امیدوں کے ساتھ آتے موسم اس کے بار آور ہونے کا انتظار کھینچتی۔ پھر کس شوق سے سبز سے زرد ہوتے اثمار کی دید کرتی اور جب کھجوریں اترتیں تو نہال ہو جاتی۔ مگر ایک دن جب اس پیڑ پر کھجوریں پکنے لگی تھیں ابوالمنصور کے آدمی آ کر عجب حکم سنا گئے کہ ام رقیہ پریشان حال قاضی کے پاس پہنچی اور یوں فریاد کناں ہوئی کہ "اے قرطبہ کے مبارک

شہر کے بزرگ قاضی، تو میرے اور ابن ابی عامر کے بیچ منصفی کر۔"

"منصفی؟ تیرے اور ابو المنصور کے بیچ؟" قاضی نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں میرے اور ابی عامر کے بیٹے کے بیچ۔"

"مگر کس باب میں؟"

ام رقیہ نے گریہ کیا اور گلوگیر آواز میں کہا کہ "اے بزرگ قاضی، ابن ابی عامر کا قلب تنگ اور قصر پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کی ماں اس کے سوگ میں بیٹھے اب میرے گھر کا صحن اس کی زد میں ہے۔ میر عمارت نے قصر کی توسیع کے لئے لازم جانا ہے کہ میرے گھر کی دیوار گرائی جائے اور میری آنکھوں کے نور میری کھجور کو کاٹ دیا جائے۔"

قاضی نے تامل کیا۔ پھر سوال کیا "اے شریف خاتون، کیا ابو المنصور کو تیرے صحن کی زمین کے مطلوبہ ٹکڑے کا معاوضہ ادا کرنے میں تامل ہے۔"

اس پر ام رقیہ قدرے برہم ہوئی اور بولی کہ "اے منصفی کرنے والے، تو نے یہ عجب سوال کیا۔ ابی عامر کا بیٹا میرے صحن کے اس ٹکڑے کی قیمت تو ادا کر دے گا۔ مگر کیا میرے شجر کی بھی کوئی قیمت لگائی جا سکتی ہے۔"

قاضی نے یہ سنا اور سر جھکا لیا۔ وہ لاجواب ہو گیا تھا۔

مگر مجو بھائی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ یا پھر وہ مجھے زچ کرنا چاہتے تھے۔ کہنے لگے "یار جواد، میں تم سے کیا پوچھ رہا تھا اور تم کدھر نکل گئے۔ اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ وہاں کیا تم اندلس کی تاریخ پڑھنے گئے تھے۔ مگر اندلس کی تاریخ کو تم نے نچوڑ کر نکالا کیا، ایک کالی بلی اور کھجور کا پیڑ۔"

مجو بھائی نے میری ساری بات کو کتنا مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ میں نے زچ ہو کر کہا "مجو بھائی، میں تاریخ پر بات تو نہیں کر رہا تھا۔"

"اور کیا کر رہے تھے۔ ویسے مجھے تاریخ پر بات کرنے پر فی نفسہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ تاریخ پر بات کرنی ہی ہے تو ایسے بات کرو جیسے تاریخ پر بات کی جاتی ہے۔"

"تاریخ پر کیسے بات کی جاتی ہے، یعنی کہ علامہ بن کر اس پر بات کروں۔" میں

نے چڑ کر کہا۔

"یار، تم تو لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے تو سیدھی سی بات کی تھی، اول تو ہر بات کا موقعہ محل ہوتا ہے۔ اب دیکھو بات ہو رہی تھی اپنے وہاں کی۔ اور اصل بات تم بتا نہیں رہے تھے۔ میں نے تم سے ایک سیدھی سی بات پوچھی۔ تم نے زقند لگائی اور پہنچ گئے اندلس میں۔ اچھا یونہی سہی۔ مگر یہ جو تم نے کھجور کے پیڑ پر لا کر تان توڑی ہے، اس میں کیا رمز ہے۔"

"کوئی رمز نہیں ہے۔" میں نے وضاحت کی۔ "ذاتی طور پر مجھے اس درخت سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہے۔ کبھی نہیں رہی۔ وہ اور درخت ہیں جن سے میری یادیں وابستہ ہیں۔ وہ میرے اپنے درخت ہیں یا کہہ لو کہ تھے۔" اور یہ کہتے کہتے ایک پورا جنگل میرے تصور میں پھر گیا۔ کیا درخت تھے، ڈراتے بھی تھے، رجھاتے بھی تھے۔ کتنے اونچے کتنے گھنے۔ کھجور کی طرح نہیں کہ جیسے کسی نے لٹھ گاڑ دیا ہو۔ ان کی شان تو یہ تھی کہ جتنے بلند اتنے ہی جھکے ہوئے۔ پروقار بلندی، اسی حساب سے انکساری، ٹہنیوں میں سو اینچ پینچ، جیسے سبزی اور شادابی تہہ در تہہ ہو۔ بیچ میں سے جب چڑیاں بھرا کر کھا کر نکلتیں اور فضا میں پھیل جاتیں تو پتہ چلتا کہ ان ٹہنیوں کے بیچ تو پورا شہر آباد ہے۔ رنگارنگ آوازوں چہچہوں سے گونجتا ہوا۔ یہ درخت دن میں اپنی گھنی چھاؤں کے ساتھ مشفق بزرگ کی مثال کھڑے نظر آتے۔ رات کو لگتا کہ بھوت کھڑے ہیں۔ وہ جو دھرم شالا کے اس طرف پیپل کھڑا تھا وہ تو رات کو بالکل یوں دکھائی دیتا جیسے کالا دیو کھڑا ہے۔ دن میں ایسے لگتا کہ جیسے کوئی رشی کھڑا ہے جیسے سارے نگر پر اس کا سایہ ہے۔ کیتھوں کا درخت بھی کم اونچا نہیں تھا۔ اور پھر کیتھوں سے کتنا لدا رہتا تھا جیسے کیتھیں نہ ہوں کرنچ کی سفید سفید گیندیں ٹہنیوں میں لٹکا دی گئی ہوں۔ اور وہ جو املی کے پیڑ تھے وہ تو سچ مچ آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ آسمان کی نیلاہٹ میں تحلیل ہوتی ہوتی سبز ٹہنیاں، ٹہنیوں میں لہراتی کتاریں۔ کھجور کے درخت تو وہاں صرف دو تھے۔ وہ جو بھونڑ میں سب درختوں سے الگ کھڑے تھے۔ جیسے یہ سوچ کر خود ہی الگ جا کھڑے ہوئے ہوں کہ اردگرد کھڑے درختوں کی برادری سے ان کا کوئی ناتا نہیں ہے۔ پرندوں سے بھی کوئی ناتا نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے تو کبھی طوطوں کی کسی ڈار

کو ان پر اترتے دیکھا نہیں۔ نہ کبھی کسی بلبل نے ان کی کسی شاخ پہ کوئی گھونسلہ بنایا۔ واقعی غریب الوطن نظر آتے تھے۔ اندلس میں تو وہ غریب الوطن نہیں تھے۔ وہاں تو وہ ایسے رچ بس گئے تھے کہ سارے اندلس پہ چھائے نظر آئے تھے۔ مگر یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک کھڑا تھا۔ اور ایسے پیڑ کہ جڑیں پاتال میں اور پھننگیں آسمان پر۔ یہ پیڑ بھلا انہیں یہاں کیسے چھانے دیتے، نیم، املی، آم، جامن، پیپل اور سب سے بڑھ کر برگد کہ اپنی ذات میں پورا جنگل ہوتا ہے۔ یا ایک پورا شہر، یہی تو برگد کی صفت ہے۔ کبھی جنگل نظر آتا ہے کبھی ایک پورا شہر۔ مگر مجھے جلدی احساس ہو گیا کہ میں بھٹکنے لگا ہوں۔ یہ میرا اپنا جنگل ہے میں نے سوچا، میں اگر ان درختوں کے بیچ دو قدم اور چلا تو واپسی مشکل ہو جائے گی۔ میں فوراً ہی پلٹ آیا "تو مجو بھائی، بات یہ ہے کہ کھجور کا پیڑ مسئلہ ام رقیہ کا تھا میرا نہیں۔"

"ویسے یار، عبدالرحمٰن اول نے کھجور کا پیڑ بو کر اچھا نہیں کیا۔ طارق بن زیاد کے سارے منصوبے پہ پانی پھیر دیا۔ واپسی کا رستہ پھر سے کھول دیا۔ ہر کھجور ایک سرنگ تھی کہ اس میں اترو اور اپنے صحرا میں جا نکلو۔"

"ہاں درختوں کی گرفت بہت مضبوط ہوتی ہے۔" یہ کہتے کہتے میں پھر اپنے درختوں میں جا نکلا۔ وہ جو پرانی حویلی کی پرلی طرف پیپل کھڑا تھا وہ کتنا اونچا تھا۔ شاید اپنے نگر کا سب سے اونچا پیڑ وہی تھا۔ اور اس میں پتنگیں کتنی لٹکی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ پیپل نہ ہو پتنگوں کا پیڑ ہو۔ بلندیوں پر جو پتنگ کٹتی تھی وہ اوپر ہی اوپر ڈگمگ کرتی جھکولے کھاتی چلی جاتی تھی۔ اونچے درختوں، اونچی عمارتوں سے بالا بالا، مگر جب اس پیپل کے قریب آتی تو پھر اسے اس پیڑ کو عبور کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ سو بلندیوں میں کٹنے والی ہر پتنگ جو اس راہ سے گزرتی وہ اس پیپل میں آ کر الجھ جاتی اور رفتہ رفتہ ٹہنیوں پتوں کے ساتھ اتنی گھل مل جاتی کہ لگتا کہ انہیں کے بیچ سے پھوٹی ہے۔ بلندیوں میں اڑنے والی کسی چیل کا بھی جب ستانے کو جی چاہتا تو تھوڑا نیچے اتر کر اسی کی کسی پھننگ پر اتر کر ٹک جاتی اور اس طرح ٹکتی جیسے اب یہاں سے نہیں اڑے گی۔ پھر کوئی فاختہ دور سے اڑتی آتی اور وہ بھی یہاں آ کر اس اطمینان سے آ کر بیٹھتی جیسے یہ اس کا آخری پڑاؤ ہے۔ اس کے اطمینان کی تو شاید یہ وجہ تھی کہ کسی غلیل سے نکلنے والا کوئی

غلہ مشکل ہی سے اس پیپل کی اونچی پھننگ تک پہنچ سکتا تھا۔

مگر مجو بھائی کو ان قصوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مجھ سے کچھ اور ہی اگلوانا چاہتے تھے۔ مگر میرے پاس کچھ اگلنے کے لئے ہوتا تو میں اگلتا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں جان کر ان سے کچھ چھپا رہا ہوں۔ "یار، تم کچھ چھپا رہے ہو۔ آخر پتہ تو چلنا چاہئے کہ اصلی بات کیا تھی۔" اور یہ فقرہ انہوں نے اتنی بار کہا کہ آخر میں بھی شک میں پڑ گیا کہ آخر اصلی بات تھی کیا۔ اور یہ کہ کیا میں بیچ میں سے کچھ بھول گیا ہوں۔ اور جب میں نے یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ اصلی بات کیا تھی تو کتنا کچھ یاد آتا چلا گیا۔ یادوں کے انبار لگ گئے۔ لیجئے کیا بات یاد آئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری عمر ابھی------ اب کہاں یاد ہے کہ اس وقت میری عمر کیا تھی۔ بچپن میں آدمی عمر کے متعلق کہاں سوچتا ہے۔ اور سوچتا بھی ہے تو یہ کہ جلدی سے بڑا ہو جاؤں۔ اچھا خیر۔ کیا بات یاد آئی تھی۔ ہاں وہ جو ہماری پرانی حویلی تھی اس کے عین سامنے ایک دکان تھی جہاں آتے جاڑوں ایک دھنیا بیٹھتا تھا۔ کیا مجال کہ ادھر ادھر دیکھے۔ اپنی دھن میں مگن روئی دھنکار رہتا تھا۔ راچھ مستقل چل رہی ہے۔ تانت بج رہی ہے اور دھنکی ہوئی روئی کا ڈھیر لگتا چلا جا رہا ہے۔ اس دھنکنے میں روئی کے گالے اتنے اڑتے کہ اوپر سے نیچے تک ساری دکان سفید سفید گالوں سے اٹی نظر آتی۔ خود وہ دھنیا ان گالوں کی گرد میں سفید سفید نظر آتا، جیسے گوشت پوست کا نہیں، روئی کی گرد سے بنا آدمی ہو۔ میں کتنی کتنی دیر تک اپنی ڈیوڑھی میں کھڑا اسے تکتا رہتا۔ کتنی حیرت ہوتی تھی اسے دیکھ کر، مگر اب تو میں خود ویسا ہی بن گیا تھا۔ میں یادوں کا دھنیا بن چکا تھا۔ کب کب کی کہاں کہاں کی یادوں کا انبار لگا ہوا تھا اور میں انہیں دھنک رہا تھا۔

"یار تم بیمار آدمی ہو۔" مجو بھائی نے بالآخر میرے اس مشغلہ سے تنگ آکر کہا۔

"مجو بھائی، آپ کو یاد ہے کہ جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی اور مجھ سے آپ نے پوچھا تھا کہ اماں کہاں کے رہنے والے ہو تو میں نے کیا جواب دیا تھا۔"

"استاد، ہر بات یاد رکھنے کے لئے نہیں ہوتی۔"

مجو بھائی بھول گئے تھے۔ مجھے وہ بات یاد تھی۔ وہ میری خود فراموشی کا زمانہ تھا۔ شاید وہی اچھا زمانہ تھا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اس شہر

میں میرا دن کافی ہاؤس میں اور رات جگی میں بسر ہوتی تھی۔ اپنی بستی، اپنا گھر، اپنا خاندان سب کچھ اچانک ماضی بن گیا تھا۔ جو پیچھے رہ گیا سو ماضی، سو اس سے رشتہ القط، اور سب ہی کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ بس خالی اپنے وجود کو لئے میں اس شہر میں پھر رہا تھا۔ دن بھر مارے مارے پھرنا، شام پڑے رات گئے پھر اپنی جگی میں مگر جگی بھی تو قسمت والوں کو ملتی تھی۔ مجھے ایسے ہی تھوڑا ہی مل گئی تھی۔ میں تو سٹیشن پہ پڑا تھا اور بے ٹھکانہ پھر رہا تھا۔ کہیں مصباح سے میری مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ عجیب زمانہ تھا وہ۔ اجنبی شہر میں پھرتے پھراتے ایسے ہی کوئی آشنا چہرہ نظر آ جاتا۔

"ارے تم؟ کب آئے۔ کیسے پہنچے۔ کونسی سپیشل سے؟ حملہ تو نہیں ہوا تھا۔" ایک دم سے اتنے بہت سے سوال۔ ملنے والے کو صحیح و سالم دیکھ کر کتنی حیرت ہوتی اور کتنی خوشی۔ پھر تھوڑی سی رقت، تھوڑا بے سروسامانی کا تذکرہ۔ اس حد تک ایک دوسرے سے ملنا کتنا اچھا لگتا تھا۔ بچھڑے ہوئے اس حد تک خلوص سے ملتے تھے۔ مگر جب درمیان میں تھوڑی مدد اور سہارے کا سوال آ جاتا تو پھر اسی تیزی سے یار ایک دوسرے سے کنی کاٹ جاتے۔ کون کس کی مدد کرتا۔ سب کو اپنی پڑی تھی۔ مگر مصباح دوسرے مزاج کا نکلا۔ اصل میں ہم دونوں کا کالج میں ساتھ رہا تھا اور ایک ہی قافلہ میں شامل ہو کر سپیشل میں سوار ہوئے تھے۔ صرف دو نہیں اچھا خاصا ایک گروپ تھا۔ لاہور تک کا پر خطر سفر اکٹھے کیا۔ لاہور سٹیشن پر اتر کر تتر بتر ہو گئے۔ جس کی جدھر سینگ سمائے ادھر نکل گیا۔ گھوم پھر کر خواری کے بعد سب ہی کراچی پہنچ گئے۔ مگر اب ہم سب ایک دوسرے سے بے تعلق اور بے خبر تھے۔ مصباح ایک روز اچانک دکھائی دیا۔ ٹریم میں ہماری مڈھ بھیڑ ہوئی۔ "ارے جواد تم۔" میں نے پلٹ کر دیکھا تو مصباح تھا۔ کتنے خوش ہوئے ہم ایک دوسرے سے مل کر۔ اور ایک دم سے ہم نے ایک دوسرے سے کتنے سوال پوچھ ڈالے اور ایک دوسرے کو کتنا کچھ بتا ڈالا۔

"اچھا یہ بتاؤ، کیا کر رہے ہو۔" مصباح نے پوچھا۔

"فی الحال کچھ نہیں۔"

"کہاں رہتے ہو؟"

"کہیں بھی نہیں۔"

"کیا؟"

"ہاں بے ٹھکانہ ہوں۔"

"اچھا۔" رکا۔ پھر بولا "میری جھگی میں آجاؤ۔ اکیلا ہوں، اچھا ہے ایک سے دو ہوجائیں گے۔ بستر تو ہے نا؟"

"ہاں بستر تو ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ کام چل جائے گا۔"

تو میں مصباح کے ساتھ جھگی میں رہنے لگا۔ ارد گرد کتنی جھگیاں تھیں۔ کیسا کیسا اینٹھے خاں، جنٹلمین، چھیل چھکنیا، طرم باز، رئیس زادہ، شائستہ طبع، نفاست پسند، خوش پوش، کج کلاہ، ان جھگیوں میں گزارہ کر رہا تھا۔ جھگی پر قبضہ کے لئے کیسے کیسے جتن کرنے پڑتے تھے اور کیا کیا لڑائیاں ہوتی تھیں۔ جو جھگی پر قابض ہو جاتا جانتا کہ اس نے ملک فتح کرلیا۔ وہ جھگی کال تھا، اور اس کے بطن میں ایک نیا زمانہ کلبلا رہا تھا۔ فلیٹوں، کوٹھیوں، پلازاؤں کا زمانہ، تو یہ اسی زمانے کی بات ہے۔ یا شاید اس کے بعد تھوڑے دنوں بعد کی۔ کیونکہ وہ زمانہ لمبا تو نہیں کھنچا تھا۔ بہت ہی زٹیل ہوں گے کہ جھگیوں میں پڑے رہ گئے۔ ورنہ یاروں نے دیکھتے دیکھتے آسمان میں تھگلی لگائی اور مقامات بلند کو جا چھوا۔ تو جھگیوں کا زمانہ مختصر تھا۔ مگر اس میں کتنا کچھ پوشیدہ تھا۔ کتنے امکانات اس کی تہہ میں تھرتھرا رہے تھے۔ کوئی کوئی زمانہ ہوتا تو ہے مختصر مگر لگتا ہے کہ وہ ایک پورا عہد تھا۔ تو جھگیوں کا زمانہ دیکھنے میں مختصر تھا مگر وہ ایک عہد ساز دور تھا۔ اور اگر مجو بھائی کی بات مان لی جائے تو کراچی کا اصلی زمانہ وہی تھا۔ "پیارے یہ جو آج کا کراچی ہے وہ تو جھگیوں کے خمیر سے اٹھا ہے۔"

"سبحان اللہ" میں ہنس پڑا۔

"ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ جو ایرا غیرا اپنے آپ کو کراچی والا بتانے لگتے ہیں ان پر مت جاؤ۔ اصلی کراچی والا وہ ہے جس نے جھگی میں بسر کی ہے۔"

"جو پرانے کراچی والے ہیں وہ تو کراچی والے نہ ہوئے۔"

"یار جواد، یہ تمہاری بہت بری عادت ہے۔ بیچ میں ٹوک دیتے ہو۔ میں تو تازہ

واردان بساط ہوائے دل کی بات کر رہا ہوں۔ چار دن کراچی میں رہتے ہیں۔ پانچویں دن کراچی والے بن جاتے ہیں۔"

"مجو بھائی، اس میں کچھ کراچی کا بھی تو قصور ہوگا۔ لاہور میں تو کوئی چار دن رہ کر لاہوریا نہیں بن سکتا۔ اور دلی جو ایک شہر تھا وہاں باہر سے آنے والوں کی نسلیں گزر جاتی تھیں اور دلی والے انہیں دلی والا مان کر نہیں دیتے تھے۔ تو آپ آدمی کی جڑیں شہر میں تلاش کرتے ہیں۔ مگر شہر کی اپنی بھی تو جڑیں ہونی چاہئیں۔

"اماں باولے ہوئے ہو۔ سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی کہیں جڑیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ تو پانی پہ تیرتا ہے۔"

بہر حال میرے کراچی والا ہونے سے تو مجو بھائی انکار نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے تو جھگی میں بسر کی تھی اور اگر مجو بھائی مجھے نہ ورغلاتے تو پتہ نہیں کتنے دنوں اور جھگی میں بسر کرتا۔ مصباح تو اپنے صاحب رسوخ عزیزوں کے آجانے کے بعد جلدی ہی وہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں اس جھگی کا بلا شرکت غیرے مالک بن گیا تھا۔ ایسے وقت میں جب خلقت کو پاؤں ٹکانے اور سر چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ ایک عدد جھگی میری ملکیت میں تھی۔ میں جھگی میں رہتا عرش میں جھولتا تھا۔ لگتا تھا کہ میں اس شہر میں جڑ پکڑ رہا ہوں۔ مگر مجو بھائی نے مجھے وہاں سے اکھاڑ دیا۔ مجو بھائی سے انہیں دنوں میری مڈھ بھیڑ کافی ہاؤس میں ہوئی تھی۔ تنگ موری والا پاجامہ، بو والا کالا پمپ، بر میں علی گڑھ کٹ سیاہ شیروانی، سر پہ ترچھی ٹوپی رامپور والی، کیسے بانکے نظر آرہے تھے۔ کئی شاعر ارد گرد اکٹھے تھے، کوئی امروہوی، کوئی بدایونی، کوئی گلاوٹھوی، کوئی ایٹھوی، کافی چل رہی تھی اور غزل پر گفتگو۔ میں اپنی نئی نئی انٹلکچولزم کے زور میں ان سے بھڑ گیا۔ بیچارے غزل گو تھے۔ بحث کیا کرتے مجو بھائی خاموش سگریٹ پیتے رہے، مجھے دیکھتے رہے۔ دیر بعد بولے "اماں یہ بحث پھر کبھی کے لئے اٹھا رکھو۔ اس وقت تو تم ہمیں اپنے شعر سناؤ۔"

"شعر تو میں نہیں کہتا۔"

"شعر نہیں کہتے؟ گویا خالی انٹلکچوئل بحثوں پہ گزارہ ہے۔"

"جی معاف کیجئے، میں شاعری پڑھتا ہوں، کرتا نہیں۔"

"پھر کرتے کیا ہو۔"

"کچھ نہیں۔"

"ٹھکانا؟"

"کہیں نہیں۔"

"کب وارد ہوئے اس شہر میں۔"

"انہیں دنوں۔"

"اکیلے آئے ہو یا۔۔۔۔۔"

"اکیلا۔"

"کس شہر سے وارد ہوئے ہو۔"

"جو بھی شہر تھا پیچھے رہ گیا۔ اب تو اسی شہر میں ہوں۔"

"صاجزادے، یہ شہر ناپرساں ہے۔"

"جانتا ہوں۔"

"ابھی کہاں جانا ہے۔ جانو گے۔ ویسے رات کو کہیں تو سر چھپاتے ہو گے۔"

"جھگی میں بسیرا کرتا ہوں۔"

"تو یوں کہو، جھگی والے ہو۔"

لیجئے اس روز سے میں جواد سے جواد جھگی والا بن گیا۔ کوئی پوچھتا کہ کون جواد، یاروں کی طرف سے جواب ملتا۔ جواد جھگی والا۔ میں زچ ہو گیا۔ تب مجو بھائی تھوڑے نرم پڑے "اماں یہ کیا تم نے جھگی کا دم چھلا اپنے ساتھ لگا رکھا ہے۔"

"میں نے لگا رکھا ہے۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

"میاں آخر کب تک وہاں پڑے رہو گے۔ لعنت بھیجو اس جھگی پہ۔"

"پھر کہاں جاؤں، سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ ہے۔"

"اماں یوں کرو کہ بستر بوریا لے کے تم میری طرف آ جاؤ۔ ہم بھی چھڑے تم بھی چھڑے۔ خوب گزرے گی۔"

نیکی اور پوچھ پوچھ۔ جھٹ پٹ جھگی کی زندگی کو سلام کیا۔ بستر بوریا باندھ اس خرابے سے نکل مجو بھائی کے ٹھکانے پہ پہنچا اور وہاں پسر گیا۔

ساتھ آ کر رہا تو جانا کہ مجو بھائی کیا شئے ہیں۔ ویسے تو نیم نام بہت تھی۔ کس ٹھسے سے کافی ہاؤس میں بیٹھتے تھے۔ مجال تھی کہ ناک پہ مکھی بیٹھ جائے۔ مگر استاد بیچ میں سے پھانک نکلے۔ اتوار کا دن تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے پلنگ پہ پڑے اینڈ رہے تھے۔ اچانک انہوں نے جھرجھری لی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے "اماں، کافی ہاؤس نہیں چلنا، یا اتوار کا سارا دن اینڈ اینڈ کر ہی گزارو گے۔

"ہاں چلنا تو چاہئے۔ آج تو زیادہ ہی جمگھٹا ہو گا۔"

"پھر بے چونی اٹھنی، بس کا کرایہ تو جیب میں ہونا ہی چاہئے۔"

میں نے جیب ٹٹولی۔ "ہاں اتنا تو نکل آئے گا۔ مگر کافی، سگریٹ، پان، اس کے لئے بھی تو جیب میں کچھ پیسہ دھیلا ہونا چاہئے۔"

"اماں اس کی بھلی فکر کی۔ بس کافی ہاؤس تک پہنچنا شرط ہے۔"

بس ہم فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

مجو بھائی چھڑے چھانٹ، فکر معاش سے آزاد مگر خدا مسبب الاسباب تھا۔ جیب کبھی بھاری کبھی خالی۔ مگر ان کی خالی جیب کا علم تو صرف مجھے ہوتا تھا۔ کافی ہاؤس میں بیٹھی ہوئی ٹولیوں کے تو فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہوئی۔ روز کونسا بل ادا کرتے تھے۔ مہینے دو مہینے میں جب جیب بھاری ہوئی حساب چکا دیا۔ بلکہ کڑاکے کے دنوں میں تو پان سگریٹ، ٹیکسی کا کرایہ، یہ سارا حساب دین محمد ویٹر کے ذمے ہوتا تھا۔ سواری کا معاملہ یہ تھا کہ جب جیب بھاری سے ہلکی ہونے لگتی تو مجو بھائی پھر ٹیکسی کو چھوڑ کر بس پر آ جاتے۔ مگر جیب بالکل خالی ہو جاتی تو پھر ٹیکسی ہی سے رجوع کرتے۔ ٹیکسی کافی ہاؤس کے سامنے جا کر رکتی اور دین محمد آ کر اس کی ادائیگی کرتا۔ ایک مرتبہ ہاتھ کشادہ ہوا تو انہوں نے دوسری عیاشیوں کی ساتھ ایک عیاشی سائیکل خریدنے کی بھی کر ڈالی۔ اور مجھے مژدہ سنایا "لو بھائی میں نے بسوں، ٹیکسیوں کی جھمیلے سے تو چھٹکارے کی صورت پیدا کر لی۔ سائیکل خرید لی ہے۔"

"مجو بھائی، یہ آپ نے اچھا کیا۔ کنوینس کی پریشانی تو ختم ہوئی۔"

مگر مجو بھائی زیادہ عرصے تک سائیکل کے ساتھ نباہ نہیں کر سکے۔ تنگی کا پیریڈ شروع ہوا تو انہوں نے مجھے قائل کرنا شروع کیا "جواد، خیر سے تمہیں نوکری مل گئی

ہے۔ مگر یار صبح کو تو سواری ملنی بڑی مشکل ہوتی ہے۔"

"ہاں مجو بھائی، وہ تو ہے۔ صبح کو بسیں بھری ہوئی چلتی ہیں۔ بہت رش ہوتا ہے، اور ٹیکسی روز تو نہیں کی جا سکتی۔ اور ٹیکسی بھی ان اوقات میں کہاں ملتی ہے۔"

"مجھے اس کا اندازہ ہے۔ یار ایسا کرو کہ ایک سائیکل خرید لو۔"

"مجو بھائی، سائیکل پوری ایک تنخواہ لے جائے گی۔"

"یار سیکنڈ ہینڈ خریدو۔ ایک مہینہ تنگی ترشی میں گزرے گا۔ مگر اس سے آرام کتنا ہو جائے گا۔"

بات دل کو لگتی تھی۔ میں قائل ہو گیا۔ کئی سیکنڈ ہینڈ سائیکلیں دیکھیں، کوئی جچی نہیں۔ مجو بھائی بولے "یار چھوڑو اس چکر کو۔ تم میری سائیکل لے لو۔ میں نے تو سائیکل خرید کر تکلف ہی کیا۔ مجھ سے یہ سواری کھنچتی نہیں۔"

تو مجو بھائی نے اپنی سائیکل میرے سر منڈھ کر دام کھرے کر لئے۔ اور چند دنوں کے لئے امیر بن گئے۔ پہلے میں ان کے پیچھے کیریئر پر بیٹھ کر کافی ہاؤس جاتا تھا۔ اب وہ میرے پیچھے کیریئر پر بیٹھ کر کافی ہاؤس جانے لگے۔ مگر یہ سنگت بھی زیادہ دن نہیں چلی۔ تنگی ترشی کا دور جب پھر شروع ہوا تو کہنے لگے کہ "یار، اپنا وہ اپنا پہلا ہی ٹھکانا جیسا بھی تھا اچھا تھا۔ یہ مکان کرائے پر لے کر تو ہم مشکل میں پڑ گئے۔ مکان دار بہت ذلیل ہے۔ کرایہ جب تک وصول نہیں کر لے گا۔ جینے نہیں دے گا۔ اور ادھر اپنا ہاتھ ان دنوں بہت تنگ جا رہا ہے۔"

واقعی پریشانی کی بات تو تھی۔ میں نے کہا "مجو بھائی، ادھر میرا معاملہ بھی یہ ہے کہ تنخواہ سب ختم کر بیٹھا اور پہلی ابھی دور ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔" مجو بھائی سوچ میں ڈوب گئے۔

"بس یہی ہو سکتا ہے کہ میں اپنی سائیکل بیچ دوں۔" یونہی میرے منہ سے نکل گیا۔

"نہیں یار۔ پھر تم دفتر کیسے جاؤ گے۔"

"جیسے پہلے جاتا تھا۔"

"نہیں یار۔" مجو بھائی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ مگر دوسرے تیسرے ہی

دن انہوں نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔ "یار جواد، ایک بھلا مانس میرے گلے پڑ گیا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے کوئی اچھی سی سیکنڈ ہینڈ سائیکل دلوا دو۔ میں تو کہتا ہوں کہ اچھا موقع ہے۔ اس سائیکل کے ٹائر تو ویسے ہی جواب دے گئے ہیں۔ اچھے پیسے مل جائیں گے۔ پیسے کھرے کرو اور اس جنجال سے پیچھا چھڑاؤ۔"

پہلے میں نے ہیر پھیر کی۔ مگر مجو بھائی نے مجھے قائل کر ہی لیا۔ تو سائیکل بیچ کھوچ کر مکان کا کرایہ ادا کیا۔ تھوڑا حساب دین محمد کا صاف کیا اور ہم دونوں پھر پیدل کے پیدل۔ ویسے تو خوشحالی کا دور پھر جلدی ہی آ گیا۔ مختصر مدت ہی کے لئے سہی مگر آیا اور ایسا آیا کہ مجو بھائی ایک ایک کی جگہ چار چار خرچ کرنے لگے۔ کافی کے آرڈر بھی زیادہ دیئے جا رہے تھے کہ نیازمندوں کا حلقہ اچانک زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ مگر مجو بھائی اپنی سواری کے خیال سے تائب ہو چکے تھے۔ اس لئے دوبارہ سائیکل خریدنے کا خیال انہیں سرے سے آیا ہی نہیں۔ اب ایک دوسرا ہی مسئلہ انہیں پریشان کر رہا تھا۔ کہنے لگے "یار بازار کا کھانا کب تک کھائیں۔ ہوٹل کا کھانا بھی سالا کوئی کھانا ہوتا ہے۔"

"پھر کیا ہو سکتا ہے مجو بھائی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ جو شاعرات ہیں اور آپ کے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہیں ان میں سے کل کلاں کو کوئی دانہ آپ کے نکاح میں آ کر اس گھر کی زینت بن جائے۔ پھر ہوٹل کے کھانے سے نجات مل سکتی ہے۔"

مجو بھائی نے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھا۔ "میرے نکاح میں یا تمہارے نکاح میں۔" رک کر بولے "جواد میاں، یہ سب خرافات ہیں۔ ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا۔" پھر تھم کر بولے۔ "میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟"

"یار خانساماں نہ رکھ لیں؟"

اب میرے چونکنے اور حیران ہونے کی باری تھی "خانساماں؟ کیا کہہ رہے ہو مجو بھائی۔ خانساماں رکھنا تو گھر پہ ہاتھی باندھنے کے مترادف ہے۔

"ہاں بھئی یہ تو ہے۔ مگر جواد یہ جو سالے کاروں پہ بیٹھ کر کافی ہاؤس آتے ہیں اور جن کی بیگمات کسی نہ کسی بہانے اپنے خانساماں کا ذکر ضرور کرتی ہیں تو کیا یہ لوگ بہت اینٹھے خاں ہیں۔ اور ہم کیا کسی سے پتلا موتتے ہیں۔"

میں نے تامل کیا۔ پھر جھجکتے ہوئے کہا "مجو بھائی، میری کتنی تنخواہ ہے، یہ تو آپ کو پتہ ہی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ تم مجھے اتنا گھٹیا آدمی سمجھتے ہو۔ میں خانساماں کی تنخواہ تم سے دلواؤں گا۔ تو بھائی اب تو خانساماں ضرور رکھا جائے گا۔"

اور واقعی چند دنوں ہی میں ایک بھلا سا خانساماں اس مختصر سے گھر میں جس میں ہم اب آکر رہے تھے آن موجود ہوا۔ گھر میں ایک ڈائننگ ٹیبل بھی آگئی۔ اور ساتھ ہی نئی کراکری بھی۔ تو چند دن گھر میں خوب اچھی جمی رہی۔ ڈائننگ ٹیبل پر روز ایک نئی ڈش ہوتی۔ اور اتوار کی دوپہر کو تو ڈشوں کی بہار ہوتی۔ ہم دونوں تو بالالتزام گھر پہ ہوتے ہی تھے۔ مجو بھائی کے چیلے چانٹوں میں سے ایک دو آن ٹپکتے تھے۔

ویسے یہ زمانہ لمبا نہیں کھنچا۔ مجو بھائی کی تو ہتھیلی میں چھید تھا۔ رقم جو مجو بھائی کی مٹھی میں غیب سے آئی تھی اگر وافر بھی تھی تو کتنے دن ٹک سکتی تھی۔ تو جیب جلدی ہی بھاری سے ہلکی ہونے لگی۔ اور مجو بھائی نے جلدی ہی یہ جتانا شروع کر دیا کہ مرغن غذاؤں سے ان کا جی بھر گیا ہے۔ "یار روز گوشت حد ہے۔ بھلے آدمیوں کو اتنا تو مسلمان نہیں ہونا چاہئے۔" اور فوراً ہی انہوں نے خانساماں کو ہدایت کی۔ "خانساماں یہ مرغی ورغی کا چکر چھوڑو۔ روز وہی ایک ڈش۔"

"جی بکری کا گوشت لے آؤں۔"

"نہیں بھائی، گوشت بہت ہوگیا۔ کچھ دال ترکاری پکاؤ۔ آج تو یوں کرو کہ مسور کی دال پکا لو۔ آخر دال بھی تو کھانی چاہئے۔"

مسور کی دال ایسی پکی کہ پھر سات دن تک وہی ہنڈیا پکتی چلی گئی۔ اور جب اتوار کا دن آیا تو مجو بھائی نے خانساماں سے کہا کہ آج ہم سیر گشت کے لئے نکل رہے ہیں۔ باہر ہی کھانا کھائیں گے۔ تم اپنے لئے کچھ دال دلیا کر لینا۔

اس دوپہر کو مجو بھائی نے کافی ہاؤس میں کافی کے ساتھ ایک آملیٹ اور چھ سلائس کا آرڈر دیا۔ یوں ہماری پیٹ پوجا کا انتظام ہوا۔ ادھر خانساماں نے بھی اب ہماری اوقات کو جان لیا تھا۔ بس دوسرے تیسرے دن ہی اس نے مجو بھائی کو سلام کر لیا اور مہینے کی پہلی کو تنخواہ کی ادائیگی کا وعدہ لے کر رخصت ہوگیا۔ اور مجو بھائی نے اطمینان کا

لمبا سانس لیا۔ "یار یہ خانساماں بھی جھمیلا ہی ہوتا ہے۔ ہم جیسے چھڑی چھانٹ مخلوق کے بس کا یہ کاروبار نہیں ہے۔ چلا گیا۔ اچھا ہوا۔"

پھر وہی پچھلا معمول۔ مجو بھائی صبح ہی صبح اٹھ کر چائے بناتے۔ سلائس سینکتے، مجھے پکارتے "جواد میاں آ جاؤ۔ جلدی کرو، تمہارے دفتر کا وقت ہو رہا ہے۔" اور جب آ کر ناشتہ کرنے لگتا تو دلاسہ دیتے "یار رات میں انڈے لانا بھول گیا۔ سالا مکھن بھی ختم ہو گیا۔ چلو آج تو گزارہ کر لو۔ جو بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے مجو بھائی، ناشتہ تو سادہ ہی ہونا چاہئے۔ ویسے میں آج دفتر سے واپس آتے ہوئے کچھ انڈے اور مکھن کی ٹکیا لیتا آؤں گا۔"

"اچھا یار۔ بہت سخی بن رہے ہو۔ اچھا چلو یوں ہی سہی۔"

بس اس طور زندگی گزر رہی تھی۔ مجو بھائی کبھی دھنا سیٹھ کبھی پھانک، ہاں پھانک ہونا تو سمجھ میں آتا تھا مگر وہ دھنا سیٹھ کیسے بن جاتے تھے، کسی پہ یہ راز کبھی کھلا نہیں۔ کام کے نام تو مجو بھائی نے کبھی پتہ نہیں ہلایا۔ ہمارے دور کے رشتے سے ایک خالو جان تھے۔ کام دھام کچھ نہیں کرتے تھے۔ نوکری چاکری سے بے نیاز، نہ زمینداری نہ دکانداری۔ مگر خالہ اماں کہا کرتی تھیں کہ "بی بی، اللہ کا فضل ہے۔ ہم دونوں وقت گوشت روٹی کھاتے ہیں۔ اور گوشت بھی بکری کا۔ ہاں کبھی کبھی اچھن کے ابا اپنے شوق سے خاص طور پر بنوا کے گائے کا گوشت لے آتے ہیں۔ میں بگڑتی ہوں کہ گائے کا گوشت ہمارے گھر میں کیوں آیا تو کہتے ہیں کہ اچھن کی ماں آج کینی گائے ہوئی تھی تو میں نے سوچا کہ سینے کا گوشت بنوا لوں۔ مولی کے ساتھ اس کا ذائقہ نکلتا ہے۔ تو آج مولی گوشت پکاؤ۔"

سننے والیاں سنتیں اور چندرا چندرا کر کہتیں کہ "گوڑا گھی دو روپے سیر ہو گیا اور آٹا اب روپے کا سولہ سیر مل رہا ہے۔ شرفاء کے لئے گزارہ مشکل ہو رہا ہے۔ خالو جان کمانے نہ دھمانے، خالہ اماں کیسے دونوں وقت گوشت روٹی کھالیوے ہیں۔"

پھر معمہ یوں سلجھایا جاتا کہ "خالو جان نے جلالی وظیفہ پڑھا تھا۔ ان کے موکل رات کو آوے ہیں۔ صبح کو اٹھ کے جب وہ تکیہ اٹھاوے ہیں تو اس کے نیچے سے دو چاندی کے روپے نکلے ہیں۔"

مجو بھائی کی شہرت بھی ان دنوں رفتہ رفتہ کچھ اسی قسم کا رنگ پکڑتی چلی گئی۔ نئے زمانے کے نئے وظیفے نئے جن۔ اغیار نے پہلے آپس میں سرگوشیاں کیں کہ مجو بھائی کا کوئی ذریعہ روزگار تو ہے نہیں۔ مگر رہتے ہیں ٹھاٹ باٹ سے۔ اور کیا اللے تللے ہیں کہ ادھر ٹکڑی میز پہ آئی ادھر کافی کا آرڈر دیا گیا۔ ایک ٹکڑی، دوسری ٹکڑی، تیسری ٹکڑی، اور کافی ہے کہ آئے چلی جا رہی ہے۔ آخر یہ چکر کیا ہے؟ کانا پھوسی، پھر شک بھرے سوالات، پھر انکشاف کہ یہ سب غیبی کمائی کا کرشمہ ہے۔

"آخر مجو بھائی جو وقت بے وقت کافی ہاؤس میں پائے جاتے ہیں تو اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔"

"یار، میں تو اس پہ حیران ہوں کہ ہم کافی ہاؤس میں بیٹھ کر جو بات کرتے ہیں اس کی خبر دوسرے دن کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ آخر ہمیں میں سے کوئی پہنچاتا ہوگا۔"

"ہاں ہمیں میں سے کوئی ہونا چاہئے۔"

معنی خیز خاموشی، کوئی اڑتا سا اشارہ۔ کسی کا کچھ کہنے لگنا اور کہتے کہتے بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو جانا۔ پھر کسی کا ٹھنڈا سانس بھرنا اور اپنے حال پر افسوس کرنا "یار ہم تو کنوئیں کے مینڈک ہیں۔ کافی ہاؤس کے ساتھ چپک کر رہ گئے ہیں۔"

"یار کافی ہاؤس میں بیٹھنے کا یہ مطلب تو نہیں ہونا چاہئے کہ آدمی اپنے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جائے۔ یہ آخر مجو بھائی بھی تو ہیں۔"

"یار واقعی۔ ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ ایک میرے دوست نے کہا کہ کیا یار کافی ہاؤس میں بیٹھے رہتے ہو۔ چلو میرے ساتھ۔ دیکھو میں تمہیں کیسے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاتا ہوں۔ وہ مجھے ایک ڈنر میں لے گیا کسی بزنس مین کی طرف سے تھا۔ کھانے کے ساتھ محفل موسیقی بھی تھی۔ شہر کی بڑی بڑی شخصیت رونق افروز تھی۔ افسر حضرات معہ بیگمات کے بیچ میں اپنے مجو بھائی بھی دھرے ہوئے تھے۔"

"واقعی؟"

"واقعی۔ ہمیں تو انہوں نے گھاس ڈالی نہیں۔ افسروں کے بیچ میں گھسے ہوئے تھے۔ کتنی دیر تک کمشنر صاحب کے ساتھ چپکے رہے۔ بڑی راز و نیاز کی باتیں ہو رہی

تھیں۔"

"خوب۔"

"بڑی شئے ہیں اپنے مجو بھائی۔"

اصل میں مجو بھائی نے اپنے دشمن بھی تو اچھے خاصے پیدا کر لئے تھے۔ کچھ انہوں نے اپنی خرد ماغی سے پیدا کئے۔ کچھ بوجوہ پیدا ہوتے چلے گئے۔ بیٹھے بیٹھے کیا سوجھی کہ اعلان کر دیا کہ ہماری محفل میں شریک ہونے والے شاعروں کے لئے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ پڑھے لکھے ہونے کی وضاحت چاہی گئی تو کہا کہ کم از کم بی اے تو ہو۔ میں نے اس وقت ٹوکا بھی "مجو بھائی، یہ تو آپ نے عجیب شرط لگائی ہے۔ کیا شاعر کے لئے گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔"

بولے "اماں، تم نہیں سمجھتے۔ اس طرح للوؤں پنجوؤں سے تو نجات ملے گی۔"

ہاں کسی حد تک نجات ملی تو سہی۔ لیکن جن سے نجات ملی انہوں نے باتیں بنانی شروع کر دیں۔ پھر حلقہ میں شامل شاعروں میں سے جس کسی کو بھی احساس ہوا کہ مجو بھائی نے مشاعرے والوں سے اس کی سفارش نہیں کی اس نے بھی در پردہ اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ مجو بھائی بیشک شاعر نہ ہوں (اگرچہ یقین سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔) مگر شاعروں کے استاد اور مربی بنے بیٹھے تھے۔ مشاعروں سے آگے ریڈیو کے پروگراموں کے لئے بھی ان کی سفارش چلتی تھی۔ ان کے نیازمند تو وہاں بھی موجود تھے۔ اور شاعری کا معاملہ بھی یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ انہوں نے بہت کہا، مگر کبھی سنایا نہیں۔ بلکہ کبھی کسی کو اپنے شاعر ہونے کی ہوا ہی نہیں دی۔

ویسے اس میں شک نہیں کہ مجو بھائی کی رسائی تھی دور دور تک۔ افسروں پہ موقوف نہیں، ہر طرح کی شخصیت سے ربط و ضبط تھا اور ایسا ویسا ربط و ضبط، خاندانوں کے اندر گھسے ہوئے تھے۔ لکھنؤ اور دلی تو خیر ہوئے مگر وہاں تو یہ عالم تھا کہ یوپی کے کسی مرے گرے قصبے سے بھی کوئی صاحب حیثیت خاندان ہجرت کر کے اس شہر میں آن پہنچا تو بس ہفتے عشرے میں مجو بھائی اس کے جملہ کوائف معلوم کر لیتے اور پھر اس خاندان کا شجرۂ نسب ایسے بیان کرتے جیسے اس سے پشتوں سے ان کے تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ کونسا ایسا صاحب حیثیت مہاجر خاندان تھا جہاں ان کے مرید اور مداح نہیں

تھے۔ ہر گھر میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ ختنوں اور عقیقہ سے لے کر شادی بیاہ تک ان کے ہر کام کاج میں شریک، ہر دکھ درد میں شامل، شادی غمی کے موقعوں پر منتظم، فیصلوں کے موقعوں پر مشیر۔

مجو بھائی کی یہی خوبی ان کا عیب بن گئی۔ اغیار نے کس کس خفیہ کارخانے سے ان کا رشتہ جوڑا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ شہر میں جو فتنہ بھی اٹھتا اور اس فتنہ کا جس خفیہ کارخانے سے جا کر رشتہ ملتا اس کا پانی ہر پھر کر مجو بھائی کے نشیب میں مرتا۔

غیبی امداد کے معمہ کو بھی یاروں نے اپنے حساب سے حل کر لیا۔ "تو تم سمجھتے ہو کہ یہ بھی کوئی کھل جا سم سم والا چکر ہے۔"

"اگر یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔"

"یار یہ پرمٹوں لائسنسوں کا چکر ہے۔"

"خیر یہ تو کوئی چکر نہیں ہے۔ ادھر لیا ادھر بیچ دیا۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری، رنگ چوکھا۔"

بس ایسی ہی باتیں ہو رہی تھیں اور میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو ایک سے الجھ پڑا۔ بات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ مجو بھائی تک پہنچی۔ انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ "اماں، تم کوئی خدائی فوجدار ہو۔ اگر کسی کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے تو تمہیں کیا۔"

میرا بھی اس وقت پارہ چڑھا ہوا تھا۔ میں مجو بھائی پر برس پڑا۔ "مجو بھائی، یہ جو آپ نے سانپوں کو دودھ پلانے کا شیوہ اختیار کر رکھا ہے یہ آخر کیا ہے۔ آپ سے سفارشیں کراتے ہیں، فائدے اٹھاتے ہیں اور پھر شگوفے چھوڑتے ہیں۔"

"استاد آج تو تمہارا پارہ بہت چڑھا ہوا ہے۔" مجو بھائی خود فوراً ٹھنڈے ہو گئے اور اب مجھے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ "مگر یار، اس میں اتنے غصے کی کیا بات ہے۔ کووں کے ڈھول بجانے سے کوئی مرا کرتا ہے۔ چلو چل کر کافی پیتے ہیں۔"

خیر۔ ذکر تو میں اپنا کر رہا تھا۔ بیچ میں مجو بھائی کا ذکر نکل آیا۔ نکلنا ہی تھا۔ اپنی زندگی کو کسی بھی زاویئے سے دیکھوں مجو بھائی ہمیشہ اس میں شامل نظر آئے۔ اور خاص طور پر ان شروع کے دنوں میں۔ بس جیسے میں ان کی انگلی پکڑ کر چل رہا تھا۔ سر چھپانے

کے لئے چھت انہیں کے طفیل میسر آئی تھی۔ خالی چھت نہیں۔ پہلی نوکری بھی انہیں کے وسیلہ سے ملی تھی۔ بس ایک روز اچانک نوٹس دے دیا۔ "جواد میاں، کل جا کے مرزا صاحب سے مل لو۔"

"مرزا صاحب، کون مرزا صاحب؟"

"مرزا دلاور بیگ۔ اپنی وضع کے آدمی ہیں۔"

"ان کے دفتر میں ایک دو آسامیاں خالی ہیں۔ تم وہاں کھپ جاؤ گے۔ کل جا کے مل لو بس کام ہوا سمجھو۔ سرکاری نوکری ہے۔ اچھے رہو گے۔"

سو میں اگلے دن پہنچ گیا۔ مگر میں وہاں پہنچ کر کتنا حیران ہوا۔ دیکھتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ اچھا یہ سرکاری دفتر ہے۔ مرزا صاحب اس دفتر کے انچارج تھے۔ مگر ان کے کمرے کا نقشہ۔ یہ تھا کہ ننگے فرش پر ایک بڑی سی میز، ہر قسم کے تکلفات سے بے نیاز، ایک طرف چند فائل جن پر پیپرویٹ کے نام اینٹ کا دھلا دھلایا ٹکڑا رکھا تھا۔ برابر میں ایک طشتری میں ببول کے کانٹے سجے رکھے تھے۔ سامنے چند کاغذ، نیلی پیلی دو پنسلیں، ایسی میز سجائے مرزا صاحب بیٹھے تھے۔ سامنے دو پرانی دھرانی کرسیاں بہت شفقت سے ملے۔ نام پوچھا۔ پھر تعلیم کے بارے میں پوچھنے لگے۔ بی اے کیا ہے۔ کونسی ڈویژن میں۔ کیا مضمون تھے۔ پھر اچانک سوال داغا "عزیز کس شہر سے نسبت رکھتے ہو۔"

"قبلہ نسبت تو گم ہو گئی۔ اب تو اسی شہر میں آوارہ پھرتا ہوں۔"

مرزا صاحب نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ چپ رہے۔ پھر بولے "ہاں عزیز تم نے ٹھیک ہی کہا۔ میں بھی کم ہی کسی سے ذکر کرتا ہوں کہ کس اجڑے دیار سے آئے ہیں۔ کوئی بہت پوچھے تو بس اتنا کہہ دیتا ہوں کہ

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

اور چپ ہو جاتا ہوں۔"

بس اس بہانے مرزا صاحب نے دلی پر ایک پورا مضمون باندھ دیا۔ خیر یہ تو تمہید تھی۔ پھر تو یہ مضمون کسی نہ کسی بہانے بندھتا ہی رہا۔ ہاں تو مرزا صاحب دلی پر شروع تھے اور میں ہوں ہاں ہوں ہاں کر رہا تھا۔ پھر اچانک رکے اور بولے۔ "قلم تو تمہارے پاس ہو گا۔"

میں کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ سٹپٹا سا گیا۔ "جی نہیں ---- جی ---- جی ہاں، پین تو ہے۔"

"بس پین ہونا چاہئے۔ ایک آدھ پنسل بھی ہو تو اچھا ہے۔ بس کل صبح کو آجایئے۔ میں آپ کا نام نوٹ کرا دیتا ہوں۔ باقی کارروائی ہوتی رہے گی۔ اس میں وقت لگے گا۔ سرکاری کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بہرحال آپ کل آجایئے۔"

میں دوسرے دن پین اور پنسل سے مسلح ہو کر وہاں پہنچ گیا۔ مرزا صاحب دیکھ کر خوش ہوئے۔ پھر کچھ ہدایات بصورت وعظ "میرے عزیز میاں فی الحال بے سروسامانی کا عالم ہے کیا تم یقین کرو گے کہ رائے سینا میں میرا دفتر کس شان کا تھا۔ میرے کمرے کے آگے ایک نہیں دو چپراسی بیٹھے رہتے تھے۔ وزیٹر کو چٹ بھیج کر لمبا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہاں ہمارے کمرے میں نہ چق ہے نہ چپراسی۔ لوگ منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ابھی تک یہ دفتر ہے ہی نہیں۔ میں دفتر ترتیب دے رہا ہوں۔ اماں ملک ہی نہیں تھا۔ دفتر کہاں سے ہوتے۔ ملک اللہ توکلی بن گیا ہے۔ ہم بھی اللہ توکلی یہاں آگئے۔ تو عزیز یہ سمجھ کر کام کرو کہ عمارت بن رہی ہے۔ ہم معمار ہیں۔"

مرزا صاحب اچھے معمار ثابت ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے عمارت کھڑی کر لی۔ وہی تیم تام جو دفتروں میں ہوا کرتی ہے۔ ساتھ میں سٹاف بھی بڑھتا چلا گیا۔ اور جتنا سٹاف بڑھتا گیا اتنا ہی سٹاف کی قلت کی انہیں شکایت پیدا ہوتی چلی گئی۔ اور اسی حساب سے افسران بالا کی بے توجہی کے گلے شکوے۔ سٹاف عجب انداز سے بڑھ پھیل رہا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن ایک نیا چہرہ نمودار ہوتا اور سٹاف میں شامل ہو کر ہفتے عشرے میں نیا پرانا ہو جاتا۔ انہیں میں وہ چہرہ بھی تھا، دفتر کا سب سے روشن چہرہ، جو دھیرے دھیرے میرے اندر اجالا بن کر سماتا چلا گیا۔ بس ہر وقت ٹائپ کرتی رہتی تھی۔ کبھی جو اس خدا کی بندی نے نظر اٹھا کر دیکھا ہو۔ ٹائپ کرانے کے لئے جو کاغذ لے کر جاتا ٹائپ کرتے کرتے کاغذ لے کر رکھ لیتی اور پھر اسی طرح ٹائپ میں غرق۔ میں نے سوچا، ایسے تو کام نہیں چلے گا۔ کاغذ دیتے دیتے کہا "یہ جلدی ٹائپ ہونا ہے۔ بس ابھی پندرہ منٹ میں۔"

"جی" اور پھر ٹائپ میں منہمک ہو گئی۔

"معاف کیجئے، آپ کا نام کیا ہے۔"

"عشرت النساء۔"

"عشرت النساء۔ نام تو بہت پر تکلف ہے۔ مجھ جیسا تو اس کے تلفظ ہی میں الجھ کر رہ جائے۔"

اس نے رک کر مجھے دیکھا۔ بس ذرا کی ذرا۔ اور پھر اپنے ٹائپ پر جھک گئی۔ انگلیاں جو رک گئی تھیں پھر اسی طرح تیزی سے حرکت کرتی نظر آنے لگیں۔

ساون سے اس ناآشنا شہر میں بارش جب ہوتی ہے تو اس رنگ سے ہوتی ہے جیسے سینکڑوں مشکوں کا دہانہ ایک دم سے کھل گیا ہے۔ چاروں طرف جل تھل۔ بارش ہلکی پڑ گئی تھی۔، رکی نہیں تھی، سواری کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ بس اسے معجزہ ہی کہنا چاہئے کہ ایک رکشا بھیگتی بھاگتی عین میرے سامنے فٹ پاتھ کے برابر رکی۔ "چلنا ہے۔" میں نے پوچھا۔ فوراً ہی تیار ہو گیا۔

میں نے بیٹھتے بیٹھتے عشرت کی طرف دیکھا۔ اوپر سے ٹپکتی بوندوں سے بچنے کی کوشش میں کیسی سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ میرا جذبہ ہمدردی جاگا۔ "عشرت بی بی، بس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ پتہ نہیں کب آئے اور اس میں جگہ ملے نہ ملے۔ کہو تو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔"

انکار بھی نہیں کیا۔ آمادہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اسے مذبذب دیکھ کر کہا "ارے اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اس موسم میں تم یہاں کب تک کھڑی رہو گی۔"

جھجکتے ہوئے بولی "آپ کو بہت چکر پڑے گا۔"

"وہ تو پڑے گا۔ مگر ایسے موسم میں ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔" اور پھر فوراً ہی میں نے کہا "دیر مت کرو۔ جلدی بیٹھو۔ بارش پتہ نہیں پھر کب شروع ہو جائے۔"

اس نے تامل کیا۔ پھر جھجکتے ہوئے بیٹھ ہی گئی مگر اس طرح کہ سمٹ کر بالکل ایک کنارے سے لگ گئی۔ میں نے کہا "اس طرح تو تم بالکل بھیگ جاؤ گی۔ ٹھیک طرح کیوں نہیں بیٹھتی ہو۔"

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اب میں اصرار کیا کرتا۔ پتہ نہیں وہ کیا سمجھتی۔ رستے بھر اسی طرح سمٹی بیٹھی

رہی اور بھیگتی رہی۔ دفتر میں تو وہ اچھی خاصی باتیں کرلیتی تھی۔ یہاں بالکل چپ تھی اور کچھ گھبرائی ہوئی۔ میں نے جو بھی بات کی ہوں ہاں کر کے چپ ہو گئی۔

گلی کے نکڑ پہ پہنچ کر رکشا رکوالی۔ "میں یہیں اتر جاؤں گی۔"

میں نے باہر نظر ڈالی۔ کہیں پانی کہیں کیچڑ' میں نے کہا کہ کیسے جاؤ گی۔ کیچڑ بہت ہے۔"

"چلی جاؤں گی۔"

"پھسل جاؤ گی۔"

"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔" یہ کہتے کہتے اتر گئی۔

میں بھی ساتھ ہی اتر پڑا۔ رکشا والے سے کہا "انہیں پہنچا کر ابھی آتا ہوں۔" اور عشرت سے کہا "لو میرا ہاتھ پکڑو۔" اترتے ہی اسے بھی شاید پھسلن کا احساس ہو گیا تھا۔ فوراً ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلی ڈگمگاتی ہوئی۔ چلتے چلتے جب زیادہ ڈگمگانے لگتی تو زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنی انگلیاں میری انگلیوں میں جکڑ لیتی۔

خدا خدا کر کے گھر کی دہلیز آئی۔ جب شکریہ ادا کر کے اندر جانے لگی تو میں نے یونہی دل لگی میں ایک فقرہ لڑھکا دیا۔ "تم نے میرا ہاتھ پکڑا ہے۔"

"پھر" اس نے فوراً ہی پلٹ کر کہا۔

"بس اب چھوڑنا مت۔"

بس اچانک ہی اسے کچھ ہوا۔ کچھ شوخ سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ساتھ میں انگوٹھا دکھایا اور سٹاک سے اندر چلی گئی۔ میں تو ہکا بکا رہ گیا۔

کن مشکلوں سے واپس آ کر میں رکشا میں بیٹھا اور پھر مجھے پتہ نہیں چلا کہ بارش ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی اور رکشا والا کن راستوں سے ہو کر جا رہا ہے۔ عشرت نے یہ جو چھب دکھائی تھی وہ میرے تصور میں ایسی کھب گئی تھی کہ بس میں اسی میں گم ہو کر رہ گیا۔ رات کو نیند بھی مشکل ہی سے آئی۔ بس وہی تصور بندھا رہا۔ اگلے دن میں سب سے پہلے دفتر پہنچنے والوں میں تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد عشرت بھی آ گئی۔ دفتر سب سے پہلے وہ پہنچا کرتی تھی۔ آج میں اس سے پہلے پہنچا۔ اچھا ہی ہوا۔ ابھی دوسرے لوگ نہیں آئے تھے۔ اس لئے چند

گھڑیاں خلوت کی میسر آگئیں۔

"جواد صاحب، کل کی لفٹ کے لئے بہت بہت شکریہ۔ اس کے بعد تو پھر بارش شروع ہو گئی تھی۔ آپ لفٹ نہ دیتے تو پتہ نہیں میرا کیا حال ہوتا۔ تو ایک دفعہ پھر شکریہ۔"

"شکریہ تو مجھے بھی ادا کرنا چاہئے۔"

"وہ کس بات کا؟"

"انگوٹھا دکھانے کا۔"

اس پر کھلکھلا کر ہنسی۔ "جواد صاحب، سوری۔"

"لو اس میں سوری ہونے کی کیا بات ہے۔ مجھے تو ایک ہی شکایت ہے۔"

"کیا؟"

"تمہارے پاس دکھانے کے لئے ایک انگوٹھا ہی رہ گیا تھا۔"

"پھر کیا آنکھیں دکھاتی۔"

"نہیں۔ چھب دکھاتیں۔"

منہ بگاڑ کر "ہوں، چھب دکھاتیں۔" اور ساتھ ہی میں کس شوخی سے زبان نکال کے دکھائی۔"

میں پھر گھائل ہو گیا۔ وہ پتلی سی لال لال زبان، کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ میں ہنس دیا۔ "زبان دکھانا کوئی ضروری نہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم اہل زبان ہو۔ ویسے کہاں کی ہو۔ لکھنؤ کی۔"

فوراً ہی تڑپ کر بولی "ہم کیوں ہوتے لکھنؤ کے۔ ہم دلی کے ہیں۔"

"ارے، دلی کی ہو۔ پھر تو مارے گئے۔" میں نے برجستہ کہا۔

"کیوں، مارے کیوں گئے۔" وہ تجسس سے بولی۔

"کچھ نہیں۔ بس یونہی۔ اصل میں ایک شاعر نے جو وارننگ دی تھی وہ مجھے یاد آگئی۔"

"کیسی وارننگ؟"

"مصحفی نے اپنے ایک شعر میں یہ وارننگ دی تھی"

اے مصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلی والیاں

"نان سنس۔ یہ کون بیہودہ شاعر تھا۔"

"ایک امروہے والا تھا۔"

"جب ہی" پھر رک کر بولی "آپ نے بت ولگر شعر سنایا ہے۔ اب آپ سے بات نہیں ہو گی۔"

میں صفائی پیش کرنے لگا تھا کہ سٹاف والے آنے شروع ہو گئے۔ میں بس فوراً ہی اٹھ کر اپنی سیٹ پر آن بیٹھا۔

بس پھر جیسے ہمارے باہمی تعلق میں ایک انقلاب آ گیا ہو۔ پہلے تو خالی دفتری تعلق تھا۔ باتیں ہوتی تھیں مگر اس طرح جس طرح دفتر میں ساتھ کام کرنے والے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ ہنستے بولتے ہیں۔ زیادہ بے تکلفی ہوئی تو تھوڑی فقرہ بازی بھی۔ خیر میرے اس کے دفتری تعلق میں اتنی بے تکلفی کبھی نہیں آئی تھی کہ ہم ایک دوسرے پر فقرہ کستے۔ مگر وہ جو انگوٹھا دکھانے کا واقعہ عظیم تھا اس نے تو جیسے ہمارے باہمی تعلق کی کایا کلپ ہی کر دی۔ ایک عجیب قسم کی بے تکلفی آ گئی اور ساتھ ہی میں ایک طرح کی جھجک بھی۔ بات کرتے کرتے اچانک گمان گزرتا کہ شاید ساتھ میں کام کرنے والوں میں سے کوئی دیکھ رہا ہے۔ کہیں بھانپ نہ لے۔ اور ہم فوراً ہی چپ ہو جاتے۔ مگر کیا بھانپ لے کیا کوئی ایسی بات ہے۔ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ نہیں۔ پھر۔ بہرحال اسی قسم کے اندیشے اور وسوسے اب ستانے لگے تھے۔

ایک روز میں نے باتوں باتوں میں پوچھ لیا۔ "ہمارے باس مرزا صاحب بھی تو دلی ہی کے ہیں۔ کیا ہوتے ہیں تمہارے۔"

"دور کے رشتے سے ہمارے پھوپھا جانی ہوتے ہیں۔"

"دور کا رشتہ ہے نا؟"

"جی۔"

"تو پھر تو وہ کھنڈت نہیں ڈالیں گے۔"

"کھنڈت- کس بات میں؟" اس نے چکرا کر پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ ہمارا تمہارا جو------" سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کیوں۔ چپ ہو گیا۔

"میں سمجھی نہیں۔" وہ تھوڑی سی گھبرائی ہوئی تھی۔

"اب میں کیسے سمجھاؤں۔"

وہ بالکل چپ ہو گئی۔

بہرحال پھر بات خود بخود سمجھ میں آتی چلی گئی۔

کھنڈت ڈالنے کی کوشش اصل میں مجو بھائی نے کی۔ پتہ نہیں ان کے کان میں کیسے بھنک پڑ گئی۔ شاید انہوں نے ہمیں کسی بھلی گھڑی میں کہیں اکٹھا دیکھ لیا۔ اس کی تقریب ایسے پیدا ہوئی کہ جب میں نے سکوٹر خرید لیا تو ایک روز وقت موقع دیکھ کر عشرت کو دعوت دے ڈالی۔ "آج میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"تم دلی والی ہو۔ مگر یہاں قطب صاحب کی لاٹھ تو ہے نہیں۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ لے دے کے کلفٹن ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ اور پھر فوراً ہی میں نے سکوٹر سٹارٹ کیا۔ "بس بیٹھ جاؤ۔" وہ جلدی سے اچک کر بیٹھ گئی۔ اور جب میں نے سکوٹر کی رفتار تیز کی تو اس نے فوراً ہی اپنے ہاتھ میری کمر میں حمائل کر دیئے۔

بس ایسے ہی کسی عالم میں مجو بھائی نے ہمیں دیکھ لیا ہو گا۔ ایک روز ناشتہ کرتے کرتے انہوں نے مجھے گھور کے دیکھا "یہ جو لڑکی آج کل تمہارے ساتھ دیکھی جاتی ہے یہ تمہارے دفتر میں کام کرتی ہے نا۔"

"جی۔"

"اور شاید دلی والی ہے۔"

"جی۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہے؟"

"استاد، میں اس شہر میں آنکھیں کھول کر رہتا ہوں اور اب تم میری بات غور سے سنو۔"

"جی فرمایئے۔"

"رومانس کی حد تک کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن شادی کا خیال دل میں مت لانا۔"

"وہ کیوں۔"

"بچو، وہ دلی والی ہے۔ مارے جاؤ گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"بات یہ ہے کہ دلی کے جو خاندان اس شہر میں آئے ہیں وہ وہاں بہت وضعداری سے رہتے تھے۔ ایک وقت وہ تھا کہ عورتیں ڈیوڑھی سے قدم نہیں نکالتی تھیں۔ کالجوں میں جانے والی لڑکیوں نے قدم دہلیز سے نکالا تھا تو اس طرح کہ برقع اوڑھ کر تانگہ میں بیٹھ کر کالج جاتی تھیں۔ کراچی آکر انہوں نے ایک دم سے برقع اتار پھینکے ہیں۔ اور سواری کے لئے یہاں نہ ڈولی ہے نہ تانگہ ہے۔ بچو، ان لڑکیوں سے ڈرنا چاہئے۔"

"گویا آپ کو افسوس یہ ہے کہ ڈولی اور چادروں سے ڈھکے ہوئے اکے اور تانگے ادھر کیوں رہ گئے۔ اور یہ مہاجر زادیاں منہ طباق سا لئے کالجوں اور دفتروں میں کیوں جاتی نظر آتی ہیں۔"

"تم غلط سمجھے۔ میں پردے کا حامی نہیں ہوں۔ مگر جواد میاں، یہ لڑکیاں نارمل طریقے سے پردے سے باہر نہیں آئیں۔ یہ برقعہ پھاڑ کر چوراہوں پر آئی ہیں۔ اس لئے میں ان سے خوفزدہ ہوں۔"

"اور شاید اسی خوف سے آپ نے چھڑا رہنے کی ٹھانی ہے۔"

بجو بھائی نے قہقہہ لگایا "مجھے پتہ تھا کہ تم قائل نہیں ہو گے۔ دنیا میں کبھی کوئی ناصح کسی عاشق کو قائل نہیں کر سکا۔ بہرحال نیک و بد تمہیں سمجھانا تو تھا۔ اب بولو کیا ارادے ہیں۔"

جلدی تو میں بھی کھلنے والا نہیں تھا۔ شاید ابھی میں نے کوئی ایسا فیصلہ بھی نہیں کیا تھا۔ اور شاید عشرت نے بھی ابھی شادی کے مضمون میں سوچنا شروع نہیں کیا تھا۔ ابھی تو ہم ایک رو میں بہے چلے جا رہے تھے۔ کچھ سوچے سمجھے طے کئے بغیر۔ اسی سے تو

ہمارے جذبے کی سچائی ثابت ہوتی تھی۔ مگر اتنے زمانے بعد ان باتوں کے یاد آنے کا مطلب۔ ارے اس سارے رومانس پر تو اسی روز پانی پھر گیا تھا جس روز نکاح کے بول پڑھے گئے تھے۔ اصل میں عشق میں کامیابی ہی اس کی ناکامی ہوتی ہے۔ مجھے ان عاشقوں پر ہمیشہ ترس آیا جو عاشق سے شوہر بن جاتے ہیں۔ عشق کا تجربہ ازدواجی زندگی میں خلط ملط ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ خیر میرے یہاں تو ازدواجی زندگی کا سلسلہ لمبا چلا ہی نہیں۔ پیدائش کے جھمیلے نے اسے کتنا مختصر کر دیا تھا۔ سیزیرین کیس تھا۔ زچہ گزر گئی، بچہ رہ گیا۔ یعنی ازدواجی زندگی ختم ہوتے ہوتے اپنا ثمر چھوڑ گئی۔ ایک نیا جھمیلا۔ مگر پھر وہی بات کہ ان باتوں کو یاد کرنے کا فائدہ۔ وہ مختصر المیعاد محبت اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی ازدواجی زندگی اپنا ثمر چھوڑ کر جلدی ہی رفت گزشت ہو گئی۔ اسی کے ساتھ میں نے اس دفتر کو بھی سلام کر لیا، جیسے میں اس دفتر میں زندگی کا یہی ذائقہ چکھنے کے لئے گیا تھا۔ اس دفتری تجربے اور اس قلبی واردات کے بعد میں نے زندگی کا ایک ورق الٹا اور آگے چل پڑا ہر جذباتی تجربے کی اپنی ایک عمر ہوتی ہے۔ تو اس تجربے کی یا اس جذبے کی عمر پوری ہو چکی تھی۔ اس کے جو بھی نشانات تھے زندگی کی فکروں اور مصروفیتوں میں مٹتے چلے گئے۔ اگر کوئی رزک باقی بھی رہ گئی تھی تو ایک مرتبہ جب میں نے میمونہ کو یہ سارا قصہ سنا دیا اور اس نے پوری دردمندی اور انہماک سے اسے سن لیا تو میں نے گویا اس قصے سے مکمل فراغت حاصل کر لی۔ اگرچہ مجھے بعد میں اس پر تعجب ضرور ہوا کہ اسے میری زندگی کے اس ورق سے اتنی دلچسپی کیوں تھی؟۔

خیر تو پرانا غم رفع ہو چکا تھا۔ اب نئے قصے تھنئے تھے اور نئے غم تھے۔ مگر ان نئے غموں میں وہ جو ایک غم شامل ہو گیا تھا سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس خانے میں ڈالوں۔ نئے غموں کے خانے میں رکھوں یا کسی پرانے غم کی تجدید کہوں۔ عجب ہوا کہ جہاں آگے درد تھا وہاں بس ایک داغ رہ گیا تھا۔ جہاں نہ درد تھا نہ داغ تھا وہاں پتہ چلا کہ یہاں تو ایک درد دبا پڑا تھا۔

(2)

مجو بھائی کے تجسس نے مجھے عجب مخمصہ میں ڈال دیا تھا۔ اتنا کرید کرید کر انہوں نے میرے سفر کے بارے میں مجھ سے پوچھا کہ میں خود شک میں پڑ گیا کہ کہیں سچ مچ میں کچھ چھپانے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ اور صرف مجو بھائی سے نہیں، اپنے آپ سے بھی۔ تو وہ کیا بات تھی۔ کم از کم اپنے آپ سے تو مجھے کچھ چھپانا نہیں چاہئے۔ میں آخر کوئی غیر تو نہیں ہوں۔ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو خود اپنے آپ سے غیریت برتتے ہیں۔ مجھے اپنے آپ سے غیریت نہیں برتنی چاہئے۔ اپنے آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہئے کہ بات کیا تھی۔ سو میں نے اپنے آپ کو کریدنا شروع کر دیا۔ خیر مجھے اس کے لئے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ پیچھے جاتے جاتے جلدی ہی اس مقام تک پہنچ گیا جہاں سے یہ قصہ شروع ہوا تھا۔ اور پیچھے بھی کونسا زیادہ جانا پڑا۔ یہ زیادہ زمانے کی تو بات نہیں تھی جب میں نے مجو بھائی سے اپنی پریشانی میں ایک سیدھا سا سوال کیا تھا۔ سوال واقعی بہت سیدھا اور سادہ تھا۔ مگر سارا قصہ اس سوال ہی سے شروع ہوا۔ میں اس واسطے سے مجو بھائی کے چنگل میں پھنس گیا اور پھنستا ہی چلا گیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب سارے غموں سے فارغ ہو کر میں ایک خاموش اور بے تعلق زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی زندگی کے ہنگامہ خیز برس میں گزار چکا تھا۔ غم عشق سے لے کر غم روزگار تک کونسا غم تھا جو اس شہر میں مجھے سہنا نہیں پڑا۔ سب طرح کے پاپڑ بیلے۔ بہت خواری دیکھی۔ ان دنوں میں واقعی چکھیری پھرا کرتا تھا۔ رفتہ

رفتہ سب فکروں سے فارغ ہو گیا۔ غم عشق سے تو شادی کے ساتھ ہی فارغ ہو گیا تھا۔ جسے چاہا تھا اسے منوں مٹی کے نیچے سلا کر ازدواجی زندگی سے بھی جلدی ہی فارغ ہو گیا۔ اس زندگی سے یادگار جو ایک تگ تھا اس نے امریکہ کے لئے رخت سفر باندھ کر مجھے اولاد کی فکروں سے بھی فراغت ولادی۔ ملازمت میں اب استحکام آگیا تھا۔ تھوڑی ترقی بھی ہو گئی تھی۔ اب میں نے بینکنگ میں سینئرٹی حاصل کر لی تھی۔ ایک برانچ کا منیجر تھا۔ سو اب اطمینان تھا۔ محفلوں ہنگامہ آرائیوں سے طبیعت سیر ہو چکی تھی۔ مجو بھائی کی طبیعت ابھی سیر نہیں ہوئی تھی۔ کافی ہاؤس زمانہ ہوا بند ہو چکا تھا۔ مگر ان کی ہنگامہ پسند طبیعت نے دوسرے راستے نکال لئے تھے۔ اب وہ صاحب حیثیت دوستوں واقف کاروں اور ملاقاتیوں کے ڈرائنگ روموں میں دیکھے جاتے تھے۔ مشاعروں اور شادیوں میں خضوع و خشوع سے شرکت کرتے تھے۔ میں دفتر سے سیدھا گھر۔ مجو بھائی شام پڑے اپنی بنے کبھی کسی مشاعرے میں جاتے نظر آتے یا کسی ولیمہ میں۔ ہم دونوں ایک ہی چھت تلے بسر کرتے تھے۔ مگر وہ اپنی راہ، میں اپنی راہ۔ جمعہ سے پہلے ملاقات بھی مشکل ہی سے ہوتی تھی۔ رات گئے آئے اور آتے ہی سو گئے۔ صبح میں اپنی ہبڑ دبڑ میں ہوتا تھا۔ نہایا دھویا، ناشتہ کیا اور کار کی طرف لپکا۔ بینک جو پہنچنا ہوتا تھا۔ اس وقت مجو بھائی بستر میں اینڈ رہے ہوتے تھے۔ بیڈ ٹی سرہانے رکھے رکھے کبھی تو بالکل ٹھنڈی ہو جاتی۔

اس طور زندگی گزر رہی تھی کہ اس میں خلل پیدا ہونا شروع ہوا اور پیدا ہوتا ہی چلا گیا۔ میرا مطلب ہے پورے شہر کی زندگی میں۔ وہ جو اس شہر میں ایک امی جمی تھی وہ اچانک ہی غائب ہو گئی۔ ڈاکے، اغوا، قتل کی وارداتیں، بم دھماکے، اچانک نقاب پوش نمودار ہوتے۔ بھرے بازار میں گولیاں چلاتے۔ ایک یہاں گرا پڑا ہے، دوسرا وہاں تڑپ رہا ہے۔ گرم جسم دیکھتے دیکھتے ٹھنڈے پڑ جاتے۔ بازار میں بھگدڑ مچ جاتی۔ پھر سناٹا۔ اور پھر اچانک ٹائر جلنا شروع ہو جاتے ٹائروں کے جلتے جلتے کوئی بس زد میں آ جاتی اور منٹوں میں جل کر خاکستر ہو جاتی۔ دکانیں کھلتے کھلتے پھر بند ہو جاتیں اور کرفیو لگ جاتا۔ کرفیو آج یہاں کل وہاں۔ مجو بھائی گھر سے نکلتے نکلتے اچانک فون کی آواز پر ٹھٹھکتے۔ فون سننے کے بعد جانے کا پروگرام ملتوی کرتے اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو جاتے۔

"مجو بھائی، آپ کو تو اس وقت مشاعرہ میں جانا تھا۔"

"ہاں جانا تو تھا، مگر اس علاقے میں کرفیو لگ گیا۔ بھائی لوگوں نے ہمارا رستہ کھوٹا کر دیا۔"

مجو بھائی کا رستہ آئے دن کھوٹا ہونے لگا۔ کرفیو آج اس علاقے میں کل اس علاقے میں۔ اور مجو بھائی کرفیو کا ذکر اس سادگی سے کرتے جیسے بے وقت بارش ہو جائے اور شریف آدمی کا سیر کا پروگرام ملتوی ہو جائے۔

"مجو بھائی، حالات تو خراب ہوتے ہی چلے جا رہے ہیں۔"

میں نے جب بھی ایسی بات کی مجو بھائی کی طرف سے ایک ہی جواب آیا "اماں، تم کیوں شہر کے اندیشے میں دبلے ہو رہے ہو۔"

بینکوں میں ڈاکے پڑتے پڑتے ایک دن ایسا ہوا کہ ہمارے قریب بینک میں مسلح ڈاکوؤں نے گھس کر پہلے چوکیدار کو دبوچا، پھر باقی سٹاف کو بندوق دکھائی۔ اور سارا خزانہ لوٹ کر اطمینان سے باہر نکلے۔ لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر فائرنگ کی۔ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ڈاکو اطمینان سے پجارو میں سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

مجھے یوں لگا کہ سیلاب جو پہلے دور دور گرج رہا تھا اب ہمارے گھر کی دہلیز کو چھو رہا ہے۔ میں نے اس شام بہت سنجیدگی سے مجو بھائی کو مخاطب کیا۔ "مجو بھائی۔"

مجو بھائی نے میرے لہجہ کی سنجیدگی سے تاڑ لیا کہ معاملہ گھمبیر ہے۔ مجھے غور سے دیکھا "کیوں، کیا بات ہے؟"

"مجو بھائی، اس شہر میں یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"اماں، کیا ہوا ہے؟" کس بے فکری کے لہجہ میں انہوں نے میری بات کا جواب دیا۔

"اچھا، کمال ہے۔ آپ کو یہ احساس ہی نہیں ہے کہ کیا ہو رہا ہے مجو بھائی، کبھی مشاعرے کی فضا سے نکل کر بھی شہر پر نظر ڈالئے۔ پھر پتہ چلے گا کہ کیا ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ وہ شہر ہی نہیں ہے۔ کیسی کایا کلپ ہوئی ہے کہ شہر کی شکل ہی بدل گئی۔ آخر ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ یہ تو تباہی کا راستہ ہے۔" میں نے ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ ڈالا۔ بھرا جو بیٹھا تھا۔

مجو بھائی نے خاموشی سے مجھے سنا۔ غور سے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر بہت متانت سے بولے "میاں جواد، ایک تمہیں مشورہ دوں۔"

"ضرور دیجئے۔"

"سوچنا چھوڑ دو یا پھر اس شہر کو چھوڑ دو۔"

میری بات کا یہ اتنا غیر متوقع جواب تھا کہ تھوڑی دیر تک تو میری سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ سوچنا چھوڑ دو یا اس شہر کو چھوڑ دو۔ کیسے چھوڑ دوں۔ جھگی سے لے کر اس فلیٹ تک جہاں اب میں رہ رہا تھا اور جو میری ملکیت تھا اس شہر میں میرا سارا سفر، سارے شب و روز بجلی کی سی تیزی سے میری آنکھوں میں پھر گئے۔ پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ جہاں میں ریلے میں بہتا ہوا آیا تھا اور جہاں کتنے دنوں تک ہوا کی زد میں آئے ہوئے ٹوٹے پتے کی مثال اڑتا پھرتا تھا۔ وہاں میں نے اچھی خاصی جڑیں بنالی ہیں۔ پھر میں اپنے آپ کو اکھاڑوں۔ مگر کیوں، مجو بھائی کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

"مجو بھائی، یہ مشورہ آپ مجھے بقائمی ہوش و حواس دے رہے ہیں۔"

"تمہیں اس میں شک ہے۔" مجو بھائی ہنسے۔ "اماں، میرے ہوش و حواس تو بجا ہیں۔ ہوش و حواس تمہارے رخصت ہوئے ہیں میرے نہیں۔"

"سوچنا چھوڑ دو یا یہ شہر چھوڑ دو۔" میں غصے میں بڑبڑایا۔ "اچھا مشورہ ہے۔"

"اماں مت مانو۔ زبردستی تھوڑا ہی ہے۔ یہ کسی ڈکٹیٹر کا حکم تو نہیں ہے، دوست کا مشورہ ہے۔ ہم نے تمہیں گر کی بات بتادی ہے۔ اس شہر میں بسر کرنے کا اب ایک ہی طریقہ ہے۔ سوچو مت کہ کیا ہو رہا ہے۔ جس نے سوچا وہ کام سے گیا۔"

میں نے رد عمل میں پہلے غصہ دکھایا، پھر طنز و تعریض پر اتر آیا، پھر بات کو ہنسی میں اڑانا چاہا۔ مگر مجو بھائی ذرا جو ٹس سے مس ہوئے ہوں۔ اپنی بات پر اسی طرح قائم رہے۔ مجھے کتنی دیر تک خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر بولے "کہہ چکے اپنی۔ اب میری سنو گے۔"

"کچھ سنانے کے لئے ابھی رہ گیا ہے؟ تو اچھا سنائیے۔"

"کان دھر کر سنو۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ امر واقعہ سناتا ہوں۔ جواد میاں یہ شہر ست نخصی شہر ہے۔ سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، مہاجر ------ یاروں

نے یہ شہر بسایا ہے یا کھچڑی پکائی ہے۔"

رکے۔ پھر بولے "اور مہاجر کی کوئی ایک قسم تھوڑا ہی ہے۔ کوئی پورب کا، کوئی پچھم کا، کوئی اتر سے آیا، کوئی دکن سے چلا۔ سارے ہندوستان سے ندیاں بہتی شور کرتی آئیں اور اس سمندر میں آکر رل مل گئیں۔ مگر رلیں ملیں کہاں۔ یہی تو مصیبت ہے۔ ہر ندی کہتی ہے کہ میں سمندر ہوں۔ جواد میاں، میں نے ان ندیوں میں اچھی خاصی شناوری کی ہے۔ مثلاً میں کچھ دنوں امروہے والوں کے بیچ بہت گھوما پھرا۔ ایسا لگتا تھا کہ کراچی بس امروہے والوں ہی سے پٹا پڑا ہے۔ جیسے کراچی نہ ہو، امروہہ ہی ہو۔ ویسے امروہے والے یہی سمجھتے ہیں کہ کراچی دوسرا امروہہ ہے۔ جیسے جو بھی مہاجر ہے وہ امروہوی ہے۔ اور جو بھی امروہوی ہے وہ اپنے امروہہ پن میں مگن ہے۔ جواد میاں، کمال ہے مصحفی کے وقت سے اب تک امروہہ کچھ سے کچھ ہوگیا۔ مگر امروہہ پن جوں کا توں ہے۔" مجو بھائی نے سانس لیا اور پھر رواں ہو گئے "بدایوں والوں کی سنو۔ اپنے مرزا ہادی علی بدایونی اچھے بزرگ ہیں۔ مگر ہیں تو بدایونی، ایک دفعہ دماغ میں سمائی کہ کراچی کے سارے شاعروں سے عہد برآ ہونا تو ناممکنات سے ہے۔ اپنے بدائیوں کے شاعروں کو جمع کرکے ایک مختصر سا مشاعرہ کئے لیتے ہیں۔ مگر جناب اکیلے لیاقت آباد سے اتنے شاعر برآمد ہو گئے کہ قطاریں لگ گئیں۔ پھر دوسرے محلوں سے فون آنے لگے کہ اے صاحب، بندہ بھی بدایونی ہے۔ بھولئے گا نہیں۔ بیچارے مرزا ہادی علی بوکھلا گئے، ایسے بوکھلائے کہ مشاعرے کی بساط ہی لپیٹ دی اور آئندہ کے لئے کان پکڑے۔" مجو بھائی دم لینے کے لئے رکے۔ مگر پھر فوراً ہی چل پڑے۔ "جواد میاں، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ جو بھی مہاجر ہے وہ بدایوں والا ہے۔ چونکہ بدایوں والا ہے اس لئے مجبور ہے۔ خیر چلو بدائیوں بھی ہوا۔ فانی بدایونی کی خاطر نہ سہی۔ بدائیوں کے پیڑوں کی خاطر ہی سہی شرفاء اسے قبول کرسکتے ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یوپی کے وہ قصبے بھی جو یوپی میں گمنام تھے کراچی میں آکر کوس لمن الملکی بجا رہے ہیں۔ اچھا، تم نے ڈبائی کا کبھی اپنے ہوش میں نام سنا تھا۔"

"ڈبائی؟ یہ کونسی جگہ تھی؟"

"ارے کسی ڈبائی والے کے سامنے ایسی بات مت کہہ دینا۔ قیامت آجائے

گی۔ اپنے علی گڑھ کے زمانے میں ایک ڈبائی والے سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ڈبائیوی صاحب ہم سے ایسے خوش ہوئے کہ ہمیں اکے میں لاد کے ایک دن ڈبائی لے گئے۔ علی گڑھ کے پچھواڑے ایک منا سا قصبہ ہے۔ سمجھ لو بالشت بھر کا۔ وہاں تو خیر وہ اپنی حدود ہی میں تھے۔ یہاں میں ان لوگوں سے ملا تو ان کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ کہتے تھے کہ سرسید احمد خاں نے غلط جگہ کا انتخاب کیا۔ علی گڑھ کالج کو ڈبائی میں بننا چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ یار پھر ڈبائی والے کہاں جاتے۔ خیر اس سے قطع نظر ڈبائی میں خاص بات کیا ہے۔ بولے، ایک نہیں دو خاص باتیں ہیں اور دو خاص تھنے۔ ایک چلم، دوسرے گجیا، میں نے کہا کہ چلو چلمیں تو ہو ئیں۔ اگرچہ ان کا مستقبل بھی ایسا روشن نہیں کہ اب تو حقے ہی کا چل چلاؤ ہے۔ مگر یہ گجیا کیا شئے ہے۔ بولے، اے واہ آپ گجیا کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ کیا شئے ہے ارے صاحب بدائیوں والے اسے کھالیں تو اپنے پیڑوں کو بھول جائیں۔"

مجو بھائی جاری تھے اور میں سنے جا رہا تھا۔ شاید میرے سوال نے ان کے لئے قینچی کا کام کیا تھا۔ رواں تھے، رکنے میں نہیں آرہے تھے۔ "جواد، ایک تو بڑی مشکل یہ ہے کہ اپنی طرف کے ہر قصبہ نے اپنی کسی نہ کسی چیز کی اچھی خاصی لیجنڈ تیار کر رکھی تھی۔ دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان اس شئے کا جواب نہیں لاسکتا۔ ایک بزرگ سے ایک محفل میں نیاز حاصل ہوا۔ ٹھنڈا سانس بھر کر بولے، پاکستان میں عمر عزیز کے پینتالیس برس گزر گئے، لڈو کھانے کو نہیں ملا۔ اے صاحب، پتہ نہیں کیا بات ہے، یہاں چیزوں میں ذائقہ نہیں ہے۔ اور لڈو تو یہاں بس میٹھے لوندے ہوتے ہیں۔ پتہ چلا کہ حضرت سندیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ چلئے سندیلہ والوں کو تو اس بارے میں رعایتی نمبر دیئے جاسکتے ہیں۔ ان کی لڈو واقعی اچھے ہوتے تھے۔ مگر میں حیران اس وقت ہوا جب میں نے ایک شکار پوری بزرگ کو اپنے نگر کے متعلق شیخیاں بگھارتے دیکھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا کہ حضرت گستاخی معاف، آپ کی طرف کے تو بیوقوف مشہور تھے۔ تڑپ کر بولے، اے سبحان اللہ، گڑ دھانیوں کو بھولے جا رہے ہو۔ گڑ اور چنے کا یہ کھا با ہماری طرف ایسا بنتا تھا کہ جس نے ایک دفعہ اسے چکھ لیا وہ دلی کے حلوا سوہن کو بھول جاتا تھا

میں نے ایک لمبی جماہی لی۔ "مجو بھائی، میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ کس تقریب میں مجھے یہ سنا رہے ہیں۔ یہ میری بات کا تو جواب نہیں ہے۔"

"اب تم نہ سمجھو تو ہم کیا کریں۔ اچھا چھوڑو اپنے یوپی والوں کو بہاریوں کی سنو۔ ایک بہاری دوست نے اسلام پر لیکچر پلاتے پلاتے ایک زقند لگائی اور کہا کہ تم لوگ ہم بہاریوں کو کیا سمجھتے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مہاتما بدھ بھی بہاری تھے۔ میں نے کہا کہ یار تم بہت سادے ہو۔ کسی مزاح نگار نے یہ فقرہ لکھ دیا اور تم لے اڑے۔ مزاح نگاروں کی باتوں کو بہت سنجیدگی سے نہیں لینا چاہئے۔ بولے، مگر اس میں جھوٹ کیا ہے۔ میں نے کہا، جھوٹ تو نہیں مگر ایک بات ہے۔ مہاتما بدھ بہاری ضرور ہوں گے، بہاری مسلمان نہیں تھے۔ تڑخ کر بولے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے کہا، حضور بہت فرق پڑتا ہے۔ بہاری مسلمان ہوتے تو بنارس یاترا نہ کرتے، ہجرت کر کے ڈھاکہ جاتے۔ وہاں پہنچ کر جو وہ کرتے اور جو ان کے ساتھ ہوتی اس کا تم اندازہ کر سکتے ہو۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا۔ فوراً مجو بھائی کو ٹوکا۔ "مجو بھائی، اب تھوڑا رک جائیے۔ ذرا فون سن لوں۔" لپک کر فون کے پاس گیا۔ فون اٹھایا۔ "ہیلو۔ جی ------ اچھا توصیف صاحب ہیں۔ کہئے کیسے مزاج ہیں۔"

"توصیف صاحب سے پوچھو کہ یار کباب پراٹھے کب کھلا رہے ہیں۔" مجو بھائی نے بیٹھے بیٹھے صدا لگائی۔

"ہاں مجو بھائی موجود ہیں۔ وہ بیٹھے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں کہ کباب پراٹھے کب کھلا رہے ہو ------ اچھا۔ واقعی؟ ------ ہاں آیئے ------ نہیں نہیں، مجو بھائی اس وقت کہیں نہیں جائیں گے۔ اس وقت مجھ پر مشق سخن ہو رہی ہے ------ رواں ہیں ------ کس موضوع پر ------ آ کے سن لو ------ اچھا ٹھیک ہے۔ آیئے، ہم انتظار کر رہے ہیں۔" فون رکھتے ہوئے میں نے مجو بھائی کو اطلاع دی۔ "آ رہے ہیں آپ کے توصیف صاحب۔"

"آنے دو۔ اچھا تم اپنے ان میرٹھ والوں کی بھی سن لو۔"

"ہاں میں بھی سوچ رہا تھا۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔ "کہ امروہہ، بدایوں، سندیلہ،

شکار پور سب کو نبٹا دیا۔ اپنا میرٹھ دستبرد سے کیسے بچ گیا۔"

"یار سنو تو سہی' یہ اپنے صاحبزادے توصیف کچھ زیادہ ہی میرٹھی بنتے ہیں۔ ان کی ہمشیرہ صاحب یعنی ہماری باجی اختری کو بڑا چاؤ تھا کہ بھائی کے لئے اچھی سی دلہن لائیں۔ میں نے سید آقا حسن کی بیٹی کا نام لیا تو پھڑک گئیں یقین جانو' انہوں نے میرا جینا حرام کر دیا۔ بس ایک ہی رٹ کہ توصیف سے اس کا رشتہ کرا دو۔ تو ہم نے توصیف میاں کی بست ہوا باندھی۔ کیا کیا جتن کرکے انہیں شیشے میں اتارا ہے۔ بات کم و بیش طے ہو گئی تھی۔ معلوم ہے توصیف صاحب نے کیا گل کھلایا۔ ہونے والے خسر کے سامنے بیٹھ کر میرٹھ کی گڑ کی ریوڑی گزک کا قصیدہ شروع کر دیا۔ وہ اپنی طرز کے لکھنوی بزرگ جنہوں نے کبھی مٹھائی کو مٹھائی نہیں کہا۔ مٹھائی کو شیرینی' چینی کو قند' اور مصری کو نبات کہتے ہیں۔ ملائی کھانے کا طور یہ ہے کہ اسے بالائی کہہ کر پکارتے ہیں' اس میں مصری کی ڈلی گھولتے ہیں' اور ایک چمچہ کھا کر سیر ہو جاتے ہیں۔ گڑ کی ریوڑی گزک کی تعریف سے اس نفاست پسند شائستہ مزاج بزرگ کی طبیعت کو منغض ہونا ہی تھا۔ خبر زنان خانے تک گئی۔ بشو بھابی کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مجھ سے آبدیدہ ہو کر بولیں کہ اے بھین مجو بھائی' ہماری بنیا کا تو نصیبا پھوٹ گیا۔ یہ تو گنوارو لوگ نکلے۔ گڑ اور کھانڈ کے کھانے والے' ان کے ساتھ ہماری بنیا کا گزارہ کیسے ہو گا۔ سید صاحب نے مضمون کو آگے بڑھایا بولے' عالی جاہ' ریوڑی گزک تک تو ہم نے صبر کیا۔ زہر کا گھونٹ پی کر چپ بیٹھے رہے۔ پھر صاحبزادے تل بھگے کی مدح کرنے لگے۔ ہم نے استفسار کیا کہ برخوردار' یہ تل بھگا کیا شے ہے۔ بولے قبلہ' یہ گڑ اور تل سے مل کر بنتا ہے۔ دلی کا طوا سوہن اس کے سامنے گرد ہے۔ اے عزیز' جناب امیر کی قسم' ہم تو حق دق رہ گئے------"

بیان جاری تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ بولتے بولتے رکے۔ "کون آ گیا یار۔" نعمت خاں کچن سے نکل لپک کر دروازے پر گیا۔ فوراً ہی واپس آیا "رفیق صاحب ہیں جی۔"

پیچھے پیچھے رفیق صاحب چلے آ رہے ہیں۔ مجو بھائی فوراً ہی کھڑے ہو گئے۔ کس گرمجوشی سے ملے "یار خوب آئے۔"

"میں نے سوچا کہ مجو بھائی کو فرصت نہیں ہے تو چلو ہم ہی چل کر مزاج پرسی کرلیں۔ تو حضور والا کے کیسے مزاج ہیں۔"

"مجو بھائی کے مزاج اس وقت مت پوچھو۔ رواں ہیں۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔

"رواں ہیں؟ اچھا؟ مگر کس پر۔"

"مہاجروں پر۔"

"خوب۔" رفیق صاحب نے قہقہہ لگایا۔

"لکھنؤ والوں کا ذکر ہو رہا تھا۔" مجو بھائی بولے "کمال نازک مزاج لوگ ہیں۔ ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ اپنے اقن صاحب جو ہیں نا۔"

"اقن صاحب" رفیق صاحب سمجھ نہیں پائے کہ کس کا ذکر ہے۔"

"یار، وہی اپنے سید آقا حسن، ان کی بات ہو رہی تھی۔ اصل میں اپنے توصیف سے ان کی بیٹی کی بات چل رہی ہے۔ بیچارے مخمصے میں ہیں۔"

"مگر کیوں۔" رفیق صاحب نے پوچھا۔ "توصیف میں کیا عیب ہے۔"

"یہ عیب چھوٹا ہے کہ وہ میرٹھ کا خاندان ہے۔"

رفیق صاحب نے قہقہہ لگایا "پھر موصوف بجا طور پر تذبذب میں ہیں۔"

"میں نے کہا، قبلہ سید صاحب" مجو بھائی بولے "وہ بھی تو لکھنؤ والے ہی ہیں اور آپ کے عزیزوں میں ہیں جن کی بیٹی لاہور والوں میں گئی ہے۔ آپ تو رفیق صاحب کو جانتے ہیں۔ خالص لاہوری ہیں۔ کیوں رفیق صاحب کیسی کہی۔"

"اچھی کہی۔" رفیق صاحب بولے "پھر سید صاحب کیا بولے۔"

"کیا بولتے بیچارے۔ بغلیں جھانکنے لگے۔"

رفیق صاحب کہنے لگے۔ "اب ذرا ہمارے عزیزوں کی بھی سن لو۔ کراچی آنا ہوا تو ہمیں بھی ملاقات کا شرف بخشا۔ گھر پہ آئے تو پہلے تو ہماری بیگم صاحبہ کے لب و لہجہ پر تھوڑے پریشان ہوئے۔ مگر اس سے زیادہ پریشان وہ اس بات پر تھے کہ اس خانہ خراب نے کراچی کے کونسے علاقے میں گھر بسایا ہے۔ بیگم صاحبہ ادھر ادھر ہوئیں تو رازدارانہ بولے، پاجی، تسی تو نرغے میں ہو۔ یاں سے نکلو، کسی محفوظ علاقے میں جگہ تلاش کرو۔ میں نے کہا کہ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جہاں بھی جاؤں گا نرغے ہی میں

رہوں گا۔ پوچھا' ایمہ کیمہ کیندے او۔ میں نے کہا' گھر والی لکھنؤ والی ہے۔ کمبخت بچے سب اہل زبان ہیں۔ سو میں تو گھر کے اندر بھی نرغے ہی میں ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی ایک قہقہہ۔

"اچھا کہا۔" مجو بھائی نے داد بھرے لہجہ میں کہا۔

"اب ہمارے چھوٹے صاحبزادے کی سنو۔ میں ان مہمانوں سے پنجابی میں باتیں کر رہا تھا۔ صاحبزادے حیرت سے میرا منہ تک رہے تھے۔ جب مہمان چلے گئے تو بولے' پاپا یہ کونسی زبان آپ بول رہے تھے۔ میں نے کہا کہ بیٹے' یہ تمہارے باپ دادا کی زبان ہے۔" پھر ایک قہقہہ۔

میں نے کسی قدر تعجب سے پوچھا۔ "رفیق صاحب' تعجب ہے' آپ لاہور کے جدی پشتی' اور آپ کے بچے پنجابی نہیں جانتے۔ یہ کیسے؟"

"جواد صاحب' پہلے تو یہ پوچھو کہ یہ ہماری اولاد اردو بھی جانتی ہے۔"

"لیجئے' یہ اور سنائی۔" میں نے پھر تعجب کا اظہار کیا۔ "اردو کو تو آپ نے اہل خانہ بنا رکھا ہے۔ اور اردو بھی کونسی' خاص لکھنؤ کی۔"

"ارے جواد صاحب' آپ ہمارا احوال کیا پوچھتے ہیں۔ ہمارے بچے پنجابی اس لئے نہیں جانتے کہ ماں لکھنؤ والی ہے۔ اور اردو اس لئے نہیں جانتے کہ وہ لکھنؤ والی آئی ٹی کالج میں پڑھی ہے۔ تو ہماری اولاد تو اردو اور پنجابی دونوں سے گئی۔"

"اماں' پھر تمہارے بچے کونسی زبان جانتے ہیں۔" مجو بھائی نے چڑ کر کہا۔

رفیق صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے "یہ آئی ٹی کالج والیاں ناول بھی تو لکھتی لکھاتی ہیں۔ بس ان ناولوں میں جو انہوں نے آئی ٹی برانڈ اردو لکھ رکھی ہے اسی میں یہ بچے غوں غاں کرتے رہتے ہیں۔ میں آتش و مصحفی کا پڑھنے والا۔ میری سمجھ میں تو یہ زبان آتی نہیں۔ یہ زبان وہ سمجھیں یا ان کی ماں سمجھے۔" رفیق صاحب نے پھر ایک قہقہہ بلند کیا۔

"سبحان اللہ۔" مجو بھائی نے بیساختہ کہا۔

"یار مجو بھائی' ایک کام میں ہماری مدد کرو۔ آپ بھانت بھانت کے مہاجر کو جانتے ہیں۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"بھائی، کیا ایسا کام ہے۔ ویسے خدمت کے لئے بندہ حاضر ہے۔"

"میں ایک خاص موضوع پر تحقیق کر رہا ہوں۔ بہت انوکھا موضوع ہے۔ آپ سنیں گے تو بندے کو داد دیں گے۔ عنوان کچھ اس قسم کا سوچا ہے کہ "شاعری اور ہجرت" کیسا عنوان ہے۔"

"خوب عنوان ہے۔ آگے چلو۔"

"اب مجھے دو ایسے مہاجروں کی تلاش ہے جو اہل زبان ہوں مگر شاعر نہ ہوں۔"

"اماں باولے ہوئے ہو۔" مجو بھائی نے جواب دیا۔ "ناممکنات کو ممکن ثابت کرنے پر تلے لگتے ہو۔"

"اچھا چلئے۔ میں اپنی شرط نرم کئے دیتا ہوں۔ دو ایسے مہاجر جو بیشک شاعر ہوں، مگر غزل گو نہ ہوں۔"

"برادر، تم نے مشکل موضوع پہ ہاتھ ڈالا ہے۔ جواد، تم دو ایسے نام بتا سکتے ہو۔"

"مشکل سوال ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

دروازے کی گھنٹی پھر بجی۔ اور پھر نعمت خان کچن سے نکل کر دروازے کی طرف دوڑا۔ اب کے واپس آیا تو پیچھے پیچھے توصیف صاحب چلے آ رہے تھے۔

"اخاہ، توصیف صاحب" رفیق صاحب اٹھ کر گرمجوشی سے توصیف سے ملے۔

"رفیق صاحب، اچھا ہوا آپ یہاں مل گئے۔ میں صبح سے آپ کو فون کر رہا ہوں کوئی اٹھا ہی نہیں رہا۔"

"صبح ہی صبح بیگم صاحبہ کے کالج جانے کے بعد میں بھی نکل کھڑا ہوا۔ فون کون سنتا۔ مگر خیر تو ہے۔"

"خیر ہی ہے۔ میں جلدی میں ہوں۔ ٹھہروں گا نہیں۔ بس پروگرام سن لیجئے۔"

"اماں، کونسا طریقہ ہے آنے کا۔ ہوا کے گھوڑے پہ سوار آئے ہو۔ بیٹھو، باتیں کرو، چائے پیئو۔" اور اس کے ساتھ ہی مجو بھائی نے نعمت خان کو آواز دی۔ "اے بھائی نعمت خاں، چائے میں کتنی دیر ہے۔" اندر سے آواز آئی "بس جی، ابھی لایا۔"

"نہیں مجو بھائی۔ بہت جلدی میں ہوں۔ پروگرام سن لیجئے۔ آج ساڑھے سات بجے شب، نوچندی والوں کی کوٹھی میں۔۔۔۔۔۔

"نوچندی والوں کی کوٹھی میں۔" مجو بھائی نے فوراً بات کاٹی۔

"اماں سیدھی بات کرو۔ تمہارے یہاں، اچھا آگے چلو۔"

"نوچندی والوں کی کوٹھی میں یعنی ہمارے غریب خانے پر، ساڑھے سات بجے شب۔ پہلے سیخ کباب اور پراٹھوں کا پروگرام، پھر مشاعرہ۔"

"کیا سیخ کباب اور پراٹھے اپنے آپ میں خود کفیل نہیں ہیں۔"

"یہی میں کہنے لگا تھا۔" میں نے تائیدی لہجہ میں کہا۔

"آپ نے غلط سمجھا۔" مجو بھائی بولے "اصل پروگرام مشاعرے کا ہے۔ باقی سیخ کباب اور پراٹھوں کا پروگرام، تو یہ تو مشاعرے کے لئے لاسا لگایا ہے۔ سوچ لیں آپ حضرات۔"

"یہ تو بڑی مشکل ہے۔" رفیق صاحب اور میں نے بیک وقت کہا۔

"کوئی مشکل نہیں۔" توصیف نے رعایتی اعلان کیا۔ "مشاعرے کے لئے کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔ آپ پراٹھے کباب کے پروگرام کو عزت بخشنے کے بعد بھی رخصت ہو سکتے ہیں۔ کم از کم آپ دونوں حضرات کے لئے یہ خصوصی رعایت ہوگی۔"

"مگر توصیف میاں"۔ مجو بھائی بولے۔ "خدا کا خوف کرو۔ یہ مشاعروں اور کباب پراٹھوں کا زمانہ ہے۔ شہر میں قیامت ٹوٹی ہوئی ہے اور تمہیں یہ عیاشیاں سوجھی ہیں۔"

"مجو بھائی، شاعری اور کباب پراٹھے زمانے کی قید سے آزاد ہیں۔"

"ویسے تقریب اس کی کیا ہے۔" رفیق نے پوچھا۔

"ہمارے علاقے سے آج کرفیو اٹھا ہے۔ بس اس خوشی میں۔"

"اماں یہ تو عارضی خوشی ہے۔" مجو بھائی بولے۔ "حالات کا کوئی اعتبار ہے روز کوئی ہنگامہ کھڑا رہتا ہے۔ اور خاص طور پر تمہارے علاقے میں۔ کیا پتہ ہے کل پھر ہنگامہ ہو جائے اور پھر کرفیو لگ جائے۔"

"کل کی کل دیکھی جائے گی۔ آج تو کرفیو نہیں ہے نا۔"

"سبحان اللہ، کیا فلسفہ ہے۔" مجو بھائی بولے۔

"مجو بھائی۔" توصیف نے کہا "جینے کے لئے کوئی نہ کوئی فلسفہ تو تراشنا پڑے گا۔ اگر یہ نہیں تو پھر آپ بتا دیجئے کہ کراچی میں زندہ رہنے کا اور کیا نسخہ ہو سکتا ہے۔"

مجو بھائی ہنسے "یار تم نے ہمیں لاجواب کر دیا۔"

"مجو بھائی" میں نے کہا "یہ آپ کے تجویز کردہ نسخہ سے کچھ زیادہ مختلف نسخہ تو نہیں ہے۔"

"یار میں تو پہلے ہی لاجواب ہو چکا ہوں۔ تم اپنا حساب بھی اسی وقت چکانا چاہتے ہو۔"

"اچھا۔" توصیف اٹھ کھڑا ہوا۔ "باقی باتیں پھر۔ میں جلدی میں ہوں۔ بس آپ لوگ وقت پہ پہنچ جایئے۔ دیر سے آئے تو کباب پراٹھے ٹھنڈے ملیں گے۔"

"مگر میاں مشاعرے میں رنگ کیسے آئے گا۔ لیاقت آباد کے شاعر تو آ ہی نہیں سکیں گے۔ وہاں تو ہنوز کرفیو لگا ہوا ہے۔"

مجو بھائی نے ایسی بات کہہ دی کہ توصیف جاتے جاتے پھر رک گیا۔

"کمال کرتے ہیں مجو بھائی آپ بھی۔ شاعر کو مشاعرے میں آنے سے دنیا کی کونسی طاقت باز رکھ سکتی ہے۔ کرفیو کیا شئے ہے۔" یہ کہتے کہتے توصیف نے کلائی پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "دیر ہو گئی۔ میں چلا۔" توصیف تیر کی طرح نکل یہ جا وہ جا------

(3)

"اے بہین مجو بھائی، اس گموڑے نگر میں تو چنگی پڑ گئی۔" بشو بھابی جیسے بھری بیٹھی تھیں۔ ہم جا کر بیٹھے ہی تھے کہ پھٹ پڑیں۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ تو کسی لمبے شہر آشوب کی تمہید معلوم ہوتی ہے۔ مجو بھائی نے مجھے کہاں پھنسوا دیا۔ اصل میں ہم گھر سے نکلے تھے میرٹھ کے کباب پراٹھے کھانے کے لئے اور اس کے لئے بھی میں کہاں تیار تھا۔ میں نے مجو بھائی سے صاف کہہ دیا تھا کہ آپ جائیں، بندے کو یہ سودا منظور نہیں ہے۔

"ارے یار کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ کوئی مہنگا سودا تو نہیں ہے۔ میرٹھ کے پراٹھے کباب سے تمہاری تواضع کی جائے گی۔"

"مہنگا سودا کیسے نہیں ہے۔ ساتھ میں مشاعرے کی جو نتھی لگی ہوئی ہے۔ شاعروں کے لئے تو ٹھیک ہے۔ بلکہ ان کے لئے تو یہ چپڑی اور دو دو کا سودا ہے۔ مگر مجھ جیسے کے لئے جسے شاعری سے کوئی علاقہ نہیں ہے یہ بہت مہنگا سودا ہے۔"

"یار کوئی پابندی تھوڑا ہی ہے۔ مت سننا مشاعرہ، توصیف نے تو پہلے ہی تمہیں اس شرط سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے۔"

"یعنی پراٹھے کباب کھاؤں اور قیمت ادا کئے بغیر بھاگ نکلوں۔ یہ شرافت تو نہ ہوئی۔"

"تو پھر تھوڑی دیر مشاعرے میں بیٹھنا۔ پھر کوئی عذر کر کے چلے آنا۔"

"نہیں مجو بھائی آپ جائیں۔"

"نہیں یار' یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اکیلا پراٹھے کباب کھا کے چلا آؤں۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا۔"

میں نے جب دیکھا کہ مجو بھائی آج مجھے چھوڑنے والے نہیں ہیں تو سوچا کہ چلو جو ہو سو ہو' چلتے ہیں۔ اور مجو بھائی جب مجھے راہ پر لے آئے تو اپنا اصل مقصد ظاہر کیا۔

"اصل میں جواد میاں' میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت اکل کھرے ہو گئے ہو۔ چار آدمیوں میں بیٹھنے سے تمہیں خفقان ہوتا ہے۔ دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر' یہ کوئی زندگی ہے۔ تمہیں لوگوں سے ملنا جلنا چاہئے ورنہ ذہنی مریض بن جاؤ گے۔"

"کن لوگوں سے ملوں' یہ تمہارے لوگ مجھے بور کرتے ہیں۔"

"تم ان سے ملتے جلتے نہیں اس لئے بور نظر آتے ہیں' بور ہیں مگر اتنے نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔ جتنے بور ہیں اتنے دلچسپ بھی ہیں۔ اب میں تمہیں ان سے باقاعدہ ملاؤں گا۔"

"اچھا تو یہ لمبا پروگرام ہے۔"

"یونہی سمجھ لو۔ مثلاً آج ہم نکل رہے ہیں تو پہلے ذرا اپنے سید آقا حسن کی طرف جھانکیں گے۔ وہ دونوں میاں بیوی دلچسپ لوگ ہیں۔ ٹپیکل لکھنؤ والے ہیں۔"

مجو بھائی کا شروع سے یہی طریقہ واردات رہا۔ سیدھے تو کبھی چلے ہی نہیں۔ بیچ میں پڑاؤ کرنا' پھر آگے چلنا۔ تو یہ ہمارا پہلا پڑاؤ تھا اور بشو بھابی نے ہمیں ذرا جو دم لینے دیا ہو۔ بس فوراً رواں ہو گئیں۔

"بھابی" مجو بھائی نے کہا۔ "خالی کراچی کا مسئلہ تو نہیں ہے پورے ملک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

"بھائی مجید الحسینی' آپ نے بجا ارشاد کیا۔ یہ آشوب تو ملک گیر ہے۔" سید آقا حسن نے اپنے ثقہ لہجہ میں مجو بھائی کی تائید کی "یہی ہم آپ کی بھاوج کے گوش گزار کرتے رہتے ہیں کہ قبلہ آپ خالی کراچی کے لئے کڑھتی ہیں۔ پورے ملک کا نقشہ ابتر ہے۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے۔ وضیع دولت میں کھیلتے ہیں۔ شرفا نان شبینہ کو محتاج ہیں۔ طرہ یہ کہ نہ جان محفوظ ہے نہ مال محفوظ۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے کہ سارے پاکستان میں تراہ تراہ پڑی ہے۔" بشو بھابی نے اپنی بات کو زور دے کر دہرایا۔ "مگر اے بھین، کراچی میں جو ہو رہا ہے وہ تو کبھی دنیا کے پردے پہ نہ ہوا ہوگا۔ کوئی گھر محفوظ ہی نہیں۔ ارے جن کے گھروں میں الغاروں پیسہ ہے ان کے گھر شوق سے کوہل لگاؤ، ڈاکے ڈالو، شریفوں کو تو بخش دو۔ اچھی بی کے گھر میں کونسی روکڑ رکھی تھی۔ کلموئے وہاں بھی آن کودے۔"

"اچھا۔" مجو بھائی چونکے۔ "اچھی بی کے یہاں چوری ہوگئی۔"

"اے بھین، تمہیں پتہ نہیں ہے۔"

"نہیں، مجھے تو بالکل علم نہیں تھا۔"

"میں کہتی ہوں کہ پھر بھی خیریت گزری کہ جان بچ گئی۔ اب تو مال کے ساتھ جان بھی جاتی ہے۔ تم جانو کہ میں تو یونہی ہوا تو، میں نے سنا تو میرے تو ہوش اڑ گئے۔ فوراً ٹیکسی کرکے ہلتی کانپتی ان کے گھر پہنچی۔ انہیں جیتا دیکھ کے جان میں جان آئی۔"

"کتنا نقصان ہوا۔"

"بھین نقصان کی بات جانے دو۔ آخر اچھی بی دلی والی ہیں۔ کچی گولیاں کھیلی ہوئی نہیں ہیں۔ ایسی دھتا بتائی کہ کلموئے چلتے پھرتے نظر آئے۔ مگر بھین میں یہ پوچھوں ہوں کہ کراچی میں یہ ہو کیا رہا ہے۔ ارے چوری چکاری تو دنیا میں ہوتی آئی ہے۔ ڈاکے بھی پرانا دستور ہیں۔ تایا حضور بتایا کرتے تھے کہ ان کے فیض آباد میں ایک دفعہ ایسا ڈاکہ پڑا تھا کہ بسنت محل والوں کے یاں جھاڑوں دل گئی تھی۔ موت کے لئے جھاڑ فانوس تک اتار کے لئے گئے تھے۔ تایا حضور سنایا کرتے تھے کہ کلھاڑوں سے لیس آئے تھے اور گوہ اور رسے ساتھ لائے تھے۔ مٹی گوہ کو تو تم جانو ہی ہو۔ دیوار سے ایسی چپکتی ہے جیسے اسے کسی نے گوند سے چپکا دیا ہو۔ اس کے پنجے میں رسی باندھی اور اچھال کے فصیل سے چپکا دیا۔ جب ہی تو وہ بسنت محل کی اونچی فصیل پہ ایسی آسانی سے چڑھ گئے۔ مگر یہ تو ہمارے ہوش سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب جو ہمارے ہوش میں ہو رہا ہے اسے سن سن کر تو ہوش اڑے جا رہے ہیں۔ ارے کون ہیں یہ جینے کے لئے۔ حضرت عباس کا علم نوٹے ان پہ۔ یا شیر خدا، کیا دیر لگائی ہے۔ فنا کیوں نہیں کر دیتے انہیں۔"

"ہاں شیر خدا ہی مدد کرنے کو آئیں تو آئیں، ان حاکموں سے تو کوئی توقع رکھنا

عبث ہے۔"

"ارے میں تو پانچوں وقت مولا مشکل کشا کو پکارتی ہوں کہ ہماری مشکل کشائی کرو۔ ان چوروں ڈاکوؤں سے ہماری گلو خلاصی کراؤ۔ انہیں ہیضے کی کلی آئے۔ انہوں نے تو آفت بو رکھی ہے۔ انہیں ذرا جو خوف خدا ہو۔ ارے آگے جو ڈاکو ہوا کرتے تھے ان کے یہاں کچھ خدا رسول کا خوف ہوتا تھا۔ اب جیسے ہمارے ادھر کا سلطانہ ڈاکو تھا۔"

"سلطانہ ڈاکو۔" آقا حسن کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "اس کی کیا بات تھی۔ ایسے ڈاکو اب کہاں۔"

"غریب بدنام ہو گیا تھا۔ ویسے تو بڑا خدا ترس تھا۔" بشو بھابی رکیں۔ پھر کہنے لگیں "اس نجتی دنیا کا یہ عجب دستور ہے کہ بد اچھا بدنام برا۔ اندر کچھ بھی کرتے رہو، بس اوپر سے پردہ ڈالے رکھو۔ جو ایسا نہ کرے اسے آنکھوں دانتوں پہ چڑھا لیتے ہیں۔ وہ بیچارہ اور کیا کرتا تھا، یہی کرتا تھا کہ امیر کے گھر میں جھاڑو دے دی۔ جا کے غریب کا گھر بھر دیا۔ ارے کتنی غریب بیٹیوں کے تو اس نے جہیز تیار کرا دیئے۔ بس پتہ لگنے کی دیر تھی کہ کس گھر میں دھی ماں کے کولھے سے لگی بیٹھی ہے۔ پھر چاہے چوری کرنی پڑتی چاہے ڈاکہ ڈالنا پڑتا، جہیز کا بندوبست کر دیتا تھا۔ مگر آج کل کے ڈاکو، ان کمبختوں کے تو دل پتھر کے ہیں۔

"بھابی" مجو بھائی بولے "ویسے تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر ڈاکو بہرحال ڈاکو ہی رہتا ہے۔"

"اے بھین، اس سے تو میں انکار نہیں کر رہی۔ ڈاکو فرشتہ بھی بن جائے رہے گا تو وہ ڈاکو ہی۔ مگر میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ یہ جو نئے نئے ڈاکو نکلے ہیں، یہ کمبخت ڈاکو بھی تو نہیں ہیں، اٹھائی گیرے ہیں۔ بندر کے ہاتھ میں استرا۔ کہیں سے بندوقیں ان کے پاس آگئی ہیں۔ وہ بڑی مستعدی سے چلاتے ہیں۔ نہ یہ دیکھتے ہیں کہ کس پہ چلا رہے ہیں نہ یہ سوچتے ہیں کہ کس گھر میں گھس رہے ہیں۔ ان پہ آسمان ٹوٹے، خون حسین کی مار پڑے، ہمارے قبلہ لڈن صاحب کے گھر میں کود پڑے سینے پہ بندوق رکھ کے ان کی ساری جمع جتھا سنگھوالی۔ پھر بھی تسکین نہیں ہوئی۔ ایک کہنے لگا کہ قبلہ، آپ نے تو بہت مایوس کیا۔ مولویوں کے گھروں میں تو بہت دولت ہوتی ہے۔ اچھا خیر، آپ کو ذری

زحمت تو ہوگی۔ آپ مجھے کوئی تعویذ دے دیں۔ قبلہ نے پوچھا، کس بات کا تعویذ، کمبخت نے کس عاجزی سے کہا، قبلہ کیا عرض کروں، پریشان رہتا ہوں۔ اس کام میں برکت نہیں رہی۔ کتنا کتنا سمیٹ کر لے جاتا ہوں۔ سب نکل جاتا ہے۔ پھر خالی کا خالی۔ کوئی ایسا تعویذ لکھ دو کہ خیر برکت ہو۔" منہ بنا کر بولیں "خیر برکت ہو۔ منہ جھلسے سے پوچھو کہ کبھی چوری ڈکیتی کی آمد میں بھی خیر برکت ہوئی ہے۔"

بشو بھابی چپ ہوئیں تو سید آقا حسن جاری ہو گئے۔ "بھائی مجید الحسینی قہر ہے لوگ دن دہاڑے لٹ رہے ہیں۔ لٹیروں سے کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔"

بشو بھابی کے لئے یہ بیان گویا چچی تھا۔ پھر شروع ہو گئیں۔ "اجی تم دن دیہاڑے لٹنے کی بات کر رہے ہو یہاں دن دیہاڑے جوان جہان آدمی اٹھا لئے جاویں ہیں۔ اور کوئی سانس ڈکار تک نہیں لیتا۔ ہمارے لکھنؤ میں تو ہمارے ہوش میں بس ایک دفعہ واردات ہوئی تھی کہ بھوڑے سنسان دوپہری میں گلی میں کھیلتے ایک بچہ کو اٹھا لے گئے تھے۔ اس پر سارے لکھنؤ میں تراہ تراہ پڑ گئی تھی۔ وہ تو پھر بچہ تھا اور اسے بھی زبردستی تھوڑا ہی اٹھایا تھا۔ ان جنم جلوں کے پاس ایک شیشہ ہووت تھا۔ جس بچے کو دکھاتے وہ خود ہی ان کے ساتھ چل پڑتا۔ اب تو یہ قہر ٹوٹا ہے کہ لاٹھ جیسا آدمی، اسے پکڑ دھکڑ کے موٹر میں ڈالا اور رفوچکر ہو گئے۔"

سید آقا حسن نے ان ساری تفصیلات کو سمیٹ کر ایک عمومی سوال کی شکل دے دی۔ "بھائی مجید الحسینی، حالات تو بہت ابتر ہیں۔ آخر الامر کیا ہوگا۔"

مجو بھائی ایک بے فکرے آدمی۔ بھلا پتھر میں بھی جونک لگی ہے۔ بشو بھابی اور سید آقا حسن نے کس تشویش کے ساتھ یہ ساری باتیں کی تھیں اور انہوں نے کس بے فکری سے جواب دیا "جو اوپر والے کو منظور ہے۔"

"اوپر والے کو کیا منظور ہے یہ تو اوپر والا ہی جانے۔ مگر اوپر والے نے نیچے والوں کو بھی تو تولہ ماشہ عقل عطا کی ہی ہے۔ آخر کچھ حضور کے دھیان بھی تو پڑتی ہوگی کہ کیا ہونے والا ہے۔"

"بھائی اقن، آپ بہت مشکل سوال کرتے ہیں۔"

"عالی جاہ، حالات بھی تو مشکل ہیں۔ عزیز آپ ہی بتائیں، ہم منصفی کے لئے کس کے پاس جائیں۔ یہاں والوں کو کیا پتہ کہ ہم نے کتنے رنج اٹھائے ہیں۔ ہرج مرج کھینچ کر کالے کوسوں یہاں آئے۔ یہاں پہ آ کے نئے نئے پیچ پڑ گئے۔ تو بندہ پرور، ہم نے آپ سے یہی تو پوچھا ہے کہ آگے حضور کو کیا نظر آتا ہے۔"

"سمندر"۔ مجو بھائی نے پھر اسی بے فکری سے جواب دیا۔ سید آقا حسن کچھ سمجھے، کچھ نہ سمجھے۔ پھر کچھ کہنے لگے تھے کہ بشو بھابی پھر بیچ میں بول پڑیں۔ "اجی یہ تم کیا اپنی الما اودول لے کے بیٹھ گئے۔ مجھے ذرا مجو بھائی سے بات کرنے دو۔ اے بھین مجو بھائی، یہ تو بتاؤ کہ یہ تمہارے میرٹھ والے پیچھے سے کیا ہیں۔"

اور مجو بھائی اس سارے دوران پہلی مرتبہ تھوڑے سٹپٹائے "پیچھے سے کیا ہیں۔ آدمی کے بچے ہیں، اللہ کی مخلوق ہیں، کھاتے پیتے لوگ ہیں، شریف ہیں۔"

"شریف ہیں۔ اچھا؟" بشو بھابی نے تامل کیا۔ پھر بولیں "میرٹھ کی ایک بی بی ہمارے گھر آئی تھی۔ وہ تو کہتی تھی کہ یہ لوگ پیچھے سے قینچیوں والے ہیں اور ذات کے کمبوہ۔ اے بھیا میں تو حق دق رہ گئی۔ اس روز سے تو میری نیند اڑ گئی۔ مجو بھائی، جناب امیر کی قسم جب ہم لکھنؤ سے نکلے تھے تو ہمارے سان گمان میں بھی یہ نہیں تھی کہ کراچی جا کے ہماری بٹیا قینچیوں والوں میں جائے گی اور سادات میں کمبوہ کا پیوند لگے گا۔"

مجو بھائی اب بالکل ہی بوکھلا گئے۔ صفائی میں بولے "بشو بھابی، آپ کس کے کہنے میں آگئیں۔ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتی ہیں کہ جب رشتہ کی بات چلتی ہے تو باتیں کرنے والے سو طرح کی باتیں کرتے ہیں۔"

"مجو بھائی، صاف بات ہے۔ ہم تو تم پہ اعتبار کر کے ہاں کرنے لگے تھے۔"

سید آقا حسن نے بات کو آگے بڑھایا اور بولے "عالی جاہ، ویسے تو اس رشتہ میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ مگر صاحبزادے کا طور دیکھ کر طبیعت پہ تھوڑا ملال ضرور آیا۔"

"اچھا۔" مجو بھائی نے فکر مند ہو کے پوچھا۔ "توصیف سے آپ کی شان میں کوئی گستاخی ہوئی۔"

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے تو ماشاء اللہ برخوردار عقلمند سعادت مند ہے۔ مگر لگتا ہے کہ صاحبزادے نے قد جلدی نکال لیا۔ باقی مذاق سخن کی بات تو ہم درمیان میں لاتے ہی نہیں۔ اس شہر میں ہم نے مذاق سخن کا یہ حال دیکھا ہے کہ قافیہ ردیف سے بے نیاز شاعری پر بھی لوگ سبحان اللہ کا کلمہ زبان پر لاتے ہیں۔ ہم یہ سوچ کر صبر کر لیتے ہیں کہ یہ لکھنؤ تو ہے نہیں۔ یہاں کی زمین اور ہے فلک اور ہے۔ بدمذاقی کا شکوہ بیجا ہے۔ سو ہم توصیف میاں کے ذوق پر بھی کیوں انگشت نمائی کرنے لگے۔ بس طبیعت کو قدرے ملال ہوا۔"

مجو بھائی نے تشفی آمیز لہجہ میں کہا "بھائی اقن، آپ دل پہ ملال نہ لائیں۔ میں ابھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔ موصوف کی مزاج پرسی کروں گا۔ باقی بشو بھائی آپ سے بھی میری گزارش یہ ہے کہ دوسروں کی باتوں میں نہ آئیں اور جلدی کوئی فیصلہ نہ کریں۔ بیشک آپ اپنے اطمینان کے لئے دل بھر کے چھان بین کر لیں۔"

"بھیا ہم نے ابھی انکار نہیں کیا ہے۔ آخر تم بیچ میں ہو۔ اور تم پہ ہمیں بے اعتباری تھوڑا ہی ہے۔ پھر بھی اس نگوڑی میرٹھ والی نے جو دل میں وسوسہ پیدا کر دیا ہے تو تھوڑی چھان بین تو کرنی ہی پڑے گی۔"

مجو بھائی نے عافیت اسی میں جانی کہ یہاں سے جلدی سے پھوٹ لیں۔ سو جلدی ہی کھڑے ہو گئے۔

"بھائی آپ تو کھڑے ہو گئے۔ آخر اتنی عجلت کیا ضرور ہے۔"

"ادھر میرٹھ والوں کے یہاں آج مشاعرے کا اہتمام ہے اور ساتھ میں پشاوری پراٹھے اور کباب۔ چٹنی اور دوددو۔ آپ کی کیا نیت ہے۔"

"ارے بھائی مجید الحسینی، ہماری کیا نیت ہوتی۔ ہماری سماعت اور ہمارا معدہ دونوں ہی کو اس میں سخن ہے۔ نہ ہم میں آج کل کے مشاعروں کو سننے کی تاب ہے نہ آج کل کی غذاؤں کو ہضم کرنے کی سکت ہے۔"

ہم نے وہاں سے نکل کر اطمینان کا سانس لیا۔ قاعدے سے اب ہمیں میرٹھ والوں کی طرف چلنا چاہئے تھا۔ مگر مجو بھائی نے چلتے چلتے ایک اور شوشہ چھوڑ دیا۔ کلائی پہ لگی گھڑی دیکھتے ہوئے بڑبڑائے "ہاں، ابھی گنجائش ہے۔" اور پھر مجھ سے مخاطب

ہوئے "یار جواد، کیا خیال ہے اچھی بی کی خیریت پوچھتے نہ چلیں۔ معلوم تو کرنا چاہئے کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں ان پر کیا گزری۔"

"وہ تو آپ کو اپنی بشو بھابی کے ذریعہ معلوم ہو گیا۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔

"یار، تم نے ان کے لہجہ پر غور نہیں کیا۔ یہ لکھنؤ والے دلی والوں کو بخشتے نہیں۔ ان کے گھر ڈاکہ پڑا اور وہ طنز سے باز نہیں آئیں۔ تو صحیح احوال تو انہیں سے معلوم ہو گا۔ اور یار مرزا صاحب سے تمہاری بھی یاد اللہ ہوا کرتی تھی۔" "ہاں ہوا کرتی تھی۔ تھوڑا عرصہ میرا ان کا دفتری ساتھ رہا ہے۔ اب تو اپنے حساب کتاب کے سلسلہ میں بینک کا پھیرا لگائیں تو مڈھ بھیڑ ہو جاتی ہے۔ دفتر میں مڈھ بھیڑ کو ملاقات تو نہیں کہا جا سکتا۔"

"مگر وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ جب بھی میں ملا انہوں نے تمہارا احوال ضرور پوچھا۔ وضعدار آدمی ہیں۔ ہمیں بھی ان کے ساتھ تھوڑی وضعداری تو برتنی چاہئے۔"

"ہاں ضرور چاہئے۔ مگر تمہارے کباب پراٹھے تمہارے انتظار میں ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"

"میں نے گھڑی دیکھ کر تم سے بات کی ہے۔ ابھی گنجائش ہے۔ ہمیں وہاں کونسا لمبا بیٹھنا ہے۔ بس خیریت پوچھنی ہے چلے چلو یار۔ رستے میں تو ہیں ہی۔ کونسا تمہارا پٹرول زیادہ خرچ ہو جائے گا۔"

لیجئے مجو بھائی نے ایسی بات کہہ دی کہ اب میں انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ سو میرٹھ والوں کی طرف جاتے جاتے گاڑی کا رخ موڑا اور مرزا صاحب کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ مرزا صاحب ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ خاص طور پر مجھے دیکھ کر۔ "ارے تم کہاں۔" مجو بھائی سے مخاطب ہو کر "مجو بھائی، آپ نے یہ اچھا کام کیا۔ جواد میاں کو لے آئے۔ کتنے زمانے بعد اس عزیز کو دیکھا ہے۔ میرے عزیز اچھے تو ہو۔"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"ہاں اللہ کا شکر ہی ادا کرنا چاہئے۔ جو وقت خیریت سے گزر جائے غنیمت

ہے۔"

"خیریت ہی تو ہم معلوم کرنے آئے تھے۔" مجو بھائی بولے "بھائی اقن کے گھر سے آرہے ہیں۔ وہاں پتہ چلا کہ ڈاکوؤں نے آپ کے گھر کو بھی نوازدیا۔ بس وہاں سے اٹھ کر سیدھے آپ کی طرف آرہے ہیں کہ معلوم کریں کہ خیریت تو رہی۔"

بس اسی دم اچھی بی آن ٹپکیں۔ "اے میں نے کہا کہ کون آیا ہے۔ کس سے باتیں کر رہے ہو۔"

"مجو بھائی آئے ہیں اور یہ ہمارے پرانے دوست جواد میاں ہیں۔ ڈاکہ کی خبر سن کر آئے ہیں، پوچھتے ہیں کہ خیریت تو رہی۔"

"اے بھیا، خیریت تو رہنی ہی تھی۔ گھر میں تھا کیا جو لے کے جاتے۔ ہماری بہو گھر میں پہلے ہی جھاڑو دے گئی تھی۔ رہا کیا تھا جو انہیں ملتا۔ میں نے تو ان سے صاف کہہ دیا کہ کلموؤ مجھ دکھیا کے پاس کیا رکھا ہے۔ سوئیوں والے محلہ میں ہمارے گھر آئے ہوتے۔ واں اللہ جھوٹ نہ بلوائے، ہمارے الغاروں دولت تھی۔ اس گھر سے کپڑے جھاڑ کے نکلے تھے۔ یہاں جو کچھ تھا بیٹے کا تھا۔ وہ بہو سمیٹ کے لے گئی۔ میرے حلق پہ کیا بندوق رکھی ہے۔ اس کے حلق پہ رکھو۔ سونا اگلے گی۔ پوچھنے لگے کہ کہاں ہے وہ۔ میں نے کہا کہ تم پہ خدا کی سنوار، تمہیں یہ بھی پتہ نہیں ہے۔ اس نے تو کلفٹن میں الگ گھر بنالیا۔ زیور کپڑے سب لے گئی۔ اے بھیا انہیں یقین ہی نہ آوے۔ میں نے کہا کہ اچھا ادھر طاق میں میری تلہ دانی رکھی ہے۔ میری جمع جتھا سب اس میں ہے۔ دیکھ لو اس میں کیا ہے۔ اور پاندان ذرا میری طرف سرکادو۔ کمبختوں نے میری تلہ دانی کو الٹ پلٹ کرکے رکھ دیا۔ اس میں انہیں ملنا کیا تھا۔ مجھے ایسی لال پیلی نظروں سے دیکھا کہ جیسے کھا جائیں گے۔ بس مجھے ایک ہی فکر تھی کہ میرا پاندان نہ لے جائیں۔ یہ پاندان مجھے تایا ابا نے مراد آباد سے منگوا کے دیا تھا۔ کتنا زمانہ ہوگیا۔ مگر اس کی آب اسی طرح قائم ہے۔"

"چلو، خیریت گزری، کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔"

"اے بھیا، پوت کی کمائی میں نے سنکھوائی ہوتی تو نقصان ہوتا۔ بہو نے ہمیں اس جوگا ہی نہ رکھا کہ ہمارا کوئی نقصان ہو۔ بیبیوں نے مجھ سے کہا کہ اچھی بی بہو کے

عیب ثواب ڈاکوؤں کے سامنے اگلتے کیا ضروری تھے۔ ارے پہلے تو میں بھی یہی سوچتی تھی۔ وہی مثل کہ آٹے کا چراغ گھر رکھوں تو چوہا کھائے' باہر رکھوں تو کوا لے جائے۔ تو اپنی جان پہ سہتی تھی مگر کسی سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ مگر اب تو پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ اب تو ایرا غیرا ہو' چور ہو' اچکا ہو' ڈاکو ہو' ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کے کہوں گی کہ میری بہو نے میرے ساتھ کیا کیا۔ دیکھتی ہوں میرا کوئی کیا کرتا ہے۔"

"جانے بھی دو سعادت کی ماں۔ اس کا فعل اس کے ساتھ۔ ہمارا فعل ہمارے ساتھ۔"

"اجی کیسے جانے دوں۔ بہت دنوں آنا کانی دیتی رہی۔ اب میں چپ نہیں رہوں گی۔ اور اے بھیا مجو بھائی' ایک تو یہ تمہارے زمانے نے بہت قیامت اٹھائی ہے۔ لڑکیوں کے دیدے کا پانی ہی مر گیا۔ ارے پہلے تو گھروں میں ملی دلی رہا کریں تھیں۔ ڈیوڑھی بس ایک ہی دفعہ تاکتی تھیں' جب ان کی ڈولی چڑھتی تھی' ہماری دلی میں بڑی بوڑھیاں کہا کریں تھیں کہ اچھی بہو ڈولی میں آتی ہے اور پھر چھپر کھٹ ہی پہ ڈیوڑھی سے نکلتی ہے۔"

"سعادت کی ماں' کس زمانے کی باتیں کر رہی ہو۔ اب زمانے کی ہوا اور ہے۔ میاں مجو بھائی' ایک تو زمانہ خراب' اوپر سے تمہارا یہ شہر' اب زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ لچوں لفنگوں چور اچکوں ڈاکوؤں دہشت گردوں کی بن آئی ہے۔ شرفا کا ناطقہ بند ہے۔ میاں کہاں آن پھنسے۔"

"اے مجو بھائی۔" اچھی بی نے ٹکڑا لگایا۔ "اللہ قسم ہم تو اپنے سوئیوں والے محلے میں کھم کی طرح گڑے بیٹھے تھے۔ اس نحوست ماری ہندو مسلمان کی ہیرا پھیری میں دلے گئے۔"

"اب اس نئی ہیرا پھیری میں دلے جا رہے ہیں۔" مرزا صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"اجی اب تو دلا ہی جاتا ہے۔ اب تو ہم ڈال سے ٹوٹا پتہ ہیں۔ اس وقت کی بات ہی اور تھی۔ سچ مچ کھم کی طرح گڑے بیٹھے تھے۔ ماشاء اللہ سے دھاک جمی ہوئی تھی۔ پشتوں سے بنے جو بیٹھے تھے۔ پوتڑوں کے امیر۔ اللہ بخشے ہمارے سر ایسے حکیم تھے کہ جنات ان سے علاج کرانے آتے تھے۔ بھیا تمہیں یقین نہ آوے گا' انہوں نے شاہ

جنات کا علاج کیا تھا۔ اماں بی بتایا کریں تھیں کہ ایک دفعہ وہ تین دن تک غائب رہے۔ شہر میں ڈھونڈھیا پڑ گئی کہ آخر گئے کہاں تمہارے ابا میاں۔ تیسرے دن کیا دیکھوں کہ بگھی سے اتر رہے ہیں۔ دو لمبے تڑنگے مزدور سر پہ دو بوریاں لئے ہوئے۔ اشرفیوں سے بھری بوریاں۔ اے بی، میں تو بھوچکی رہ گئی۔ اور اچانک بگھی بھی غائب، مزدور بھی غائب، میں حیران کبھی تمہارے ابا میاں کو دیکھوں کبھی اشرفیوں کی بوریوں کو۔ تمہارے ابا میاں بولے، پوچھو مت، بس سنگھوالو۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ شاہ جنات کو ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔ میں پہنچا ہوں تو آخری دموں پہ تھا۔ بس اللہ نے عزت رکھ لی۔ تو بھیا ہمارے سسر ایسے حکیم تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے، شاہ جنات کا آدمی آتا۔ اشرفی نذرانہ پیش کرتا اور خمیرے کی ڈبیا لے جاتا۔ وہ کوئی خاص ہی خمیرہ تھا۔ ابا میاں نے کبھی بتایا نہیں کہ یہ کاہے کا خمیرہ ہے۔" پھر فوراً مرزا صاحب سے مخاطب ہوئیں۔ "اجی تم بتاتے کیوں نہیں ہو، تم نے تو ان کی بہت سی کرامات دیکھی ہوں گی۔"

مرزا صاحب نے تامل کیا۔ پھر بولے "ہمارے والد اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے خالی حکیم ہی نہیں تھے، صاحب کرامت بزرگ بھی تھے۔ دوا کے ساتھ دعا بھی کرتے تھے۔ تب ہی تو دوا زیادہ اثر کرتی تھی۔ ایک دفعہ عجب واقعہ ہوا۔" اچھی بی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "ان کے نانا میاں کے ایک ملنے والے حج کر کے آئے تو نانا میاں کی بیٹھک میں انہوں نے والد صاحب قبلہ کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ جب والد صاحب قبلہ وہاں سے رخصت ہو گئے تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے۔ نانا میاں نے کہا کہ یہ میرے نواس داماد تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ مدینہ سے کب آئے۔ نانا میاں نے حیران ہو کر کہا کہ اماں، تم مدینہ کی بات کرتے ہو۔ انہوں نے کبھی دلی سے قدم نہیں نکالا۔ تب وہ بزرگ بولے کہ مگر میں نے تو انہیں مسجد نبوی میں وعظ دیتے دیکھا ہے۔" مرزا صاحب چپ ہو گئے۔ پھر وقفہ کے بعد ٹھنڈا سانس بھر کر بولے۔ "کیا زمانہ دیکھا تھا اور کیا زمانہ دیکھ رہے ہیں۔ سچی بات ہے، اب زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کریں، جب تک کی زندگی ہے اس وقت تک تو زندہ رہنا ہے۔"

یہ کہتے کہتے مرزا صاحب گہری سوچ میں چلے گئے۔ پھر بہت افسردہ لہجہ میں بولے

"پتہ نہیں یہ ذکر کیسے نکل آیا۔ میں تو اس زمانے کو اب یاد ہی نہیں کرتا۔ تکلیف ہوتی ہے۔ ایک وقت میں بہت یاد کیا اس زمانے کو، اس شہر کو، جواد میاں ان دنوں تم تو ہمارے ساتھ ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ تمہیں تو یاد ہو گا۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپتا تھا۔"

"جی یاد ہے۔ میں نے آپ سے دلی کی بہت داستانیں سنی ہیں۔"

"مگر کیا تم یقین کرو گے کہ اب دلی کا میں بالکل ذکر نہیں کرتا۔ ایک زمانے سے یہ نام میری زبان پر نہیں آیا۔ صبر کرلیا تھا۔ آج یہ تمہاری بھاوج ذکر لے بیٹھیں تو میری زبان پر بھی یہ نام آگیا۔"

"اجی میں تو بھولنے کی کوشش کرتی ہوں ننھنی میری بہو مجھے نہیں بھولنے دیتی۔ ارے وہاں مجال تھی بہوؤں کی کہ ساس کے سامنے چوں بھی کر جائیں۔ ساس نکلوں سے آنکھیں نکال لیتی۔ یہ تو یہاں شیرنیاں بنی پھرتی ہیں اور میری بہو تو ایسی ہفت رنگن ہے۔ اوپر سے کیسی میٹھی ہے۔ خالہ خالہ کہہ کے کیسی للو چپو کرتی ہے۔ جی میں تو آئی کہ کہوں کہ خالہ کی خل بچی، تو نے تو خالہ کو کوے ہنکنی بنا کے طاق میں بٹھا دیا ہے۔ پھر میں چپ ہو گئی کہ پتہ نہیں کتنا بڑھا چڑھا کر بیٹے کو بتائے گی۔"

"سعادت کی ماں، معاف کر دو اسے۔ آخر تمہارے بیٹے کی دلہن ہے۔"

"معاف ہی تو کر دیا ہے۔ جب ہی تو کچھ نہیں کہتی۔ ہمارا بیٹا خوش رہے۔ ہم بڈھے بڑھیا اسی میں خوش ہیں کہ وہ خوش رہیں۔"

"اچھا کیا اچھی بی۔" مجو بھائی بولے "بس یہ سوچ کر معاف کر دینا چاہئے کہ یہ اپنے زمانے کے لوگ ہیں۔ پچھلے زمانے کی بہت سی اچھی باتیں سرے سے ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔" اور یہ کہتے کہتے مجو بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اے بھیا، یہ کیا۔ ابھی آئے اور ابھی جا رہے ہو۔"

"اچھی بی میرٹھ والوں کے کباب پراٹھے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

ہاں واقعی جب ہم وہاں پہنچے تو پشاوری پراٹھوں اور سیخ کبابوں کا دور زور شور سے چل رہا تھا۔ ہاتھی کے کان جتنا ورق در ورق پراٹھا ترنت ہمارے سامنے بھی آگیا۔ توصیف حرکت میں تھا۔ میزبانی کا حق کس سرگرمی سے ادا کر رہا تھا۔ ایک میز سے

دوسری میز کی طرف۔ دوسری میز سے لپک کر تیسری میز کی طرف ہر میز والوں سے پوچھنا پراٹھے کیسے رہے اور بتاتا "جناب ہمارے میرٹھ میں نوچندی لگا کرتی تھی۔ وہاں ملتے تھے یہ پراٹھے اور اتنے لذیذ کہ چٹورے ہونٹ چاٹتے نوچندی سے پھرتے تھے اور ختم ہو جانے پہ اگلی نوچندی کے انتظار میں دن کاٹتے تھے اور برس گزارتے تھے۔ اسے بھی اب ہماری نوچندی والا پراٹھا ہی جانیئے۔ اور یہ سیخ کباب ہمارے خیر نگر دروازے میں جو کبابی تھا وہ کمبخت کیا کباب بناتا تھا۔ تو یہ خیر نگر برانڈ سیخ کباب ہے۔"

گھومتا پھرتا ہماری میز پہ آیا "مجو بھائی، پراٹھا اور لاؤں؟"

"بس بھائی۔"

"یہ کیا بات ہوئی مجو بھائی۔ نوچندی والا پراٹھا ہے۔ اگر ماشہ برابر بھی فرق ہو تو میرا سر اور آپ کی نعلین جواد بھائی، آپ بتایئے ہے نا یہ نوچندی والا پراٹھا۔"

"سو فیصدی نوچندی والا۔"

"یار" مجو بھائی نے ٹکڑا لگایا "اگر نوچندی والا یہاں آگیا ہے تو پھر میرٹھ کی مخلوق ہمیں کوسے گی۔ کسی کی بددعا لینی اچھی بات نہیں ہے۔"

"اس کا بھائی وہیں ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔"

"اور کباب۔ ہاں کباب تو لے ہی لیجئے۔ ابھی سیخ سے اترے ہیں۔ یہ کہتے کہتے توصیف نے ڈھیر سارے کباب ہماری پلیٹوں میں ڈال دیئے۔ پھر بولا "مجو بھائی کہئے خیر نگر کے کباب یاد آئے یا نہیں۔"

"پہلے لقمہ پر ہی میں نے جواد سے کہہ دیا تھا کہ لو میاں توصیف نے ہمیں خیر نگر کے کباب کھلوا دیئے۔ کبابی کون ہے۔ اسی کا بیٹا پوتا ہو گا۔"

"نہیں۔ اصل میں اس زمانے میں چھوٹا سا ایک لڑکا ہوا کرتا تھا جو وہاں بیٹھ کر انگیٹھی پہ پنکھا جھلا کرتا تھا۔ تھا چلتا پرزہ، وہاں سے اس نے مسالوں کا نسخہ اڑایا اور یہاں آکر شروع ہو گیا۔"

"خوب۔"

"ہاں استاد کے کان کاٹتا ہے۔ ان کبابوں سے بڑھ کر ہی ان میں ذائقہ ہے۔"

"اچھا توصیف میاں یہ بتاؤ کہ یہ کباب پراٹھے کا بکھیڑا کب تک چلے گا اور مشاعرہ کب شروع کرا رہے ہو۔"

"زیادہ دیر نہیں ہے۔ پراٹھوں کی بساط لپیٹنے لگا ہوں۔"

توصیف چلنے لگا تھا کہ مجو بھائی نے ٹوکا "استاد، بہت مصروف نظر آ رہے ہو۔ ذرا فراغت ملے تو چند منٹ کے لئے ہمارے پاس آ کر بیٹھو بات کرنی ہے۔"

"بس ابھی فارغ ہو کر آیا۔"

"اور باجی اختری کہاں ہیں؟"

"ادھر خواتین سے نبٹ رہی ہیں۔"

"انہیں بھی ذرا بھیجنا۔"

"کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں۔"

"اللہ خیر کرے۔" مجو بھائی کے لہجہ سے توصیف نے بھانپ لیا کہ معاملہ گھمبیر ہے۔ "اچھا ابھی آیا۔" اور یہ کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ مختلف میزوں سے گزرتا، مہمانوں سے ہنستا بولتا کہیں آگے نکل گیا اور پھر غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں باجی اختری آن درآمد ہوئیں۔ "ارے بھئی تم لوگ کھا نہیں رہے۔"

"بہت کھا لیا۔" مجو بھائی نے کہا۔

"اے واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اور جواد، تم نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ کیا پراٹھے اچھے نہیں لگے۔"

"بہت لذیذ تھے۔ جی بھر کے کھایا ہے۔"

اور مجو بھائی نے ٹکڑا لگایا "اتنا کھایا ہے کہ پیٹ تزم ہو رہا ہے۔"

اتنے میں توصیف بھی آن پہنچا۔

"باجی اختری۔" مجو بھائی نے آخر بات شروع کی۔ "اپنے بھائی کو ذرا سمجھاؤ۔ ہر جگہ دنگی بازی اچھی نہیں ہوتی۔"

"اے ہے کیا ہوا۔ توصیف، یہ مجو بھائی کیا کہہ رہے ہیں۔"

"مجو بھائی میں سمجھا نہیں۔"

"ہاں تم کیوں سمجھو گے۔ میاں تم پہلے ادھر گئے تھے تو تمہیں بات کرنے کے لئے اور کوئی مضمون نہیں ملا۔ میرٹھ کی گزک ریوڑیوں کا قصیدہ پڑھ آئے۔ وہ قند ونبات کی بات کرنے والے۔ انہیں تم میرٹھ سے لا کے گزک ریوڑیاں کھلاؤ گے۔ خیر وہ بات آئی گئی ہوئی تو پھر لگتا ہے کہ تم کوئی گل کھلا کے آئے ہو۔"

"بالکل نہیں مجو بھائی، کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔"

"نہیں ایسی بات تو نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ تم انہیں شاعری کے سلسلہ میں کوئی لیکچر پلا کے آئے ہو۔"

توصیف ہنسا "اچھا، اچھا۔ مجو بھائی، بات یہ تھی کہ قبلہ سید صاحب اپنے لسان القوم حضرت صفی لکھنوی کے شعر سنائے چلے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اپنے میرٹھ کے کسی شاعر کی بانگی دکھاؤں۔ تو میں نے بوم ہاپوڑی کے دو تین چمکتے ہوئے سے شعر سنا دیئے۔ موصوف کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ حالانکہ میں نے حضرت صفی لکھنوی کے شعر پورے صبر و تحمل سے سنے تھے۔"

مجو بھائی نے ماتھا پیٹ لیا۔ "بوم ہاپوڑی کے شعر اور اس شائستہ مزاج لکھنوی بزرگ کے سامنے۔ تمہیں اپنی میرٹھ کا اور کوئی شاعر نہیں جڑا تھا۔ ارے بیان یزدانی ہی کے شعر سنا دیئے ہوتے۔"

"بیان یزدانی۔ مجو بھائی کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ بیان یزدانی کو تو میں اس وقت میدان میں اتاروں گا جب وہ اپنے آتش و مصحفی کا قصیدہ پڑھیں گے۔"

مجو بھائی جیسے توصیف سے مات کھا گئے ہوں۔ اب وہ فریادی لہجہ میں باجی اختری سے مخاطب ہوئے۔ "باجی، اس الھڑ نوجوان کو سمجھاؤ کہ رشتے کے معاملات کتنے نازک ہوتے ہیں۔ اول پنال باتیں دوستوں کے ساتھ چل جاتی ہیں۔ ہونے والی سسرال میں نہیں چلتیں۔ موصوف پہلے گزک ریوڑی اور تل بھگے کی شان میں قصیدہ پڑھ آئے۔ اب کے گئے تو بوم ہاپوڑی کا کلام بلاغت نظام اس ثقہ بزرگ کے گوش گزار کر آئے۔"

"باجی، وہ لوگ اپنے لکھنوٴ کلچر کا ذکر اتنی عقیدت سے کرتے ہیں تو مجھے بھی تو

میرٹھ کلچر کی ایک جھلک انہیں دکھائی تھی۔"

"اچھی جھلک دکھائی۔" مجو بھائی نے جل کر کہا۔

باجی اختری سنتی رہیں۔ پھر کہنے لگیں "مجو بھائی، تمہیں تو پتہ ہے کہ یہ تو شروع ہی سے مخولیا ہے۔ اب ان کے لئے یہ اپنی عادت تو بدلے گا نہیں۔ مگر مجو بھائی ایک بات میں بھی کہوں گی کہ یہ نکھلئو والے بہت اونچے دماغ والے بنتے ہیں۔ اور بشو بھائی، وہ تو عرش میں جھولتی ہیں۔ ہمہ شما کو خاطر ہی میں نہیں لاتیں۔ پتہ نہیں کس بات کا ٹھسا ہے۔ بڑے لوگ ہوں گے تو نکھلئو میں ہوں گے۔ واں ضرور ہاتھی جھولتے ہوں گے۔ یاں تو ہم نے کوئی بڑا پن دیکھا نہیں۔ اور لڑکی میں بھی کونسے لعل جڑے ہوئے ہیں۔ ہوگی پڑھی لکھی۔ ویسے تو کھٹائی ہے۔ تن پہ بوٹی نہیں۔ خالی ہڈی چمڑا ہے۔ ارے اس سے تو وہ حیدر آباد والوں کی بیٹی ہی اچھی ہے۔ تن پہ بوٹی تو نظر آتی ہے۔ ویسے بھی ہنس مکھ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سگھڑ ہے۔ وہ لوگ تو جیسے تیار بیٹھے ہوں۔ مگر میں تو ادھر بات زبان سے نکال کے پھنس گئی ہوں۔"

مجو بھائی نے آخر زبان کھولی۔ بولے "باجی اختری، ٹھیک ہے، آپ کو وہ لڑکی پسند ہے تو اسے بیاہ لائیں۔ مگر یہ سمجھ لیں کہ وہ حیدر آباد والی ہے۔ کھٹی دال اور بگھارے بینگن کھلا کھلا کے توصیف کی مت مار دے گی۔"

"اے بھیا پکا کے تو کھلائے گی۔ نکھلئو والی سے تو مجھے اتنی بھی امید نہیں ہے۔ یہ لوگ تو اپنے نکھلئوے پن کی نر میں کسی کو گردانتے ہی نہیں۔ وہ پیلی بھیت والے بھی تو ہیں۔ کیسے ملنسار لوگ ہیں۔ اور ان کی بیٹی نگینہ ہے نگینہ۔ تو لڑکیوں کی ہمارے لئے کمی نہیں ہے۔ نکھلئو والے کان کھول کے سن لیں۔ اور یہ بھی سن لیں کہ ہم زیادہ للو چپو نہیں کریں گے اور لمبا انتظار بھی نہیں کریں گے۔ بہت کر لیا انتظار۔ گھمگھم میں ہمیں نہ رکھیں۔ ادھر کریں یا ادھر۔ ہم صاف جواب چاہتے ہیں۔"

"مجو بھائی۔" توصیف نے ٹکڑا لگایا "لکھنؤ والوں سے میری توبہ، میں کان پکڑتا ہوں۔"

"کیا مطلب ہے توصیف میاں۔" مجو بھائی بھی اب ذرا تیز ہوئے۔ "کیا مطلب ہے تمہارا، وہ شریف لوگ ہیں۔ ادھر بات ڈالی ہے تو اس طرح سے تو تم نہیں بھاگ

سکتے۔ آخر دوسرے کی بھی کوئی عزت ہے۔"

"مجو بھائی آپ ذرا سوچیں۔ اور جواد بھائی آپ غیر جانبدار آدمی ہیں' آپ ذرا انصاف کریں۔ میں میرٹھیا' کھڑی بولی بولنے والا۔ میں ملائی کو بالائی کہہ سکتا ہوں۔ وہ لوگ تو کومتی میں دھلا محاورہ بول بول کے میری طبیعت صاف کر دیں گے۔"

مجو بھائی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ "جواد میاں دیکھ رہے ہو۔ اپنی پانچویں تو میت والوں کا حال۔"

"اے مجو بھائی جانے بھی دو۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ مخول کرنے کی اسے عادت ہے۔ باقی کرے گا تو وہی جو میں کہوں گی۔" اور فوراً ہی توصیف سے مخاطب ہوئیں۔ "ارے تو اور کیسی چاہتا ہے۔ اب تیرے لئے عرش کا تارہ تو اتر کے آئے گا نہیں۔ ہم نے تو اپنی دانست میں تیرے لئے اچھی لڑکی ہی تلاش کی ہے۔"

"اچھی کیا بہت اچھی لڑکی ہے۔" مجو بھائی نے اشارہ پا کر فوراً پورے اعتماد کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "میاں پڑھی لکھی ہے۔ شائستہ ہے' خاندان اچھا ہے' تمہیں اور کیا چاہئے۔"

"میں تو خود اس لڑکی پہ فریفتہ ہوں۔ میرا تو جی اس بات پہ جلا ہوا تھا کہ بشو بھابی ہمارے خاندان میں عیب نکالنے بیٹھ گئیں۔ پہلے تحقیق تو کر لیتیں۔ ہمارے دشمنوں نے جیسا کہا اس پہ اعتبار کر لیا۔ تو مجو بھائی انہیں سمجھاؤ۔ میں بھی ان کے پاس جاؤں گی۔ مجھ میں بیٹے والیوں والا ٹھسا نہیں ہے۔ میں خود جا کے انہیں ہر طرح کا اطمینان دلاؤں گی۔ اور توصیف کی طرف سے یہ فکر نہ کریں کہ ابھی اسے کہیں ملازمت نہیں ملی ہے۔ انشاء اللہ جلدی ملے گی۔ ان کی بیٹی کو ہمارے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"خیر یہ تو میں نے بھی انہیں سمجھا دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے۔" مجو بھائی بولے "آپ کے میرٹھ کے کچھ لوگ ہیں انہوں نے وہاں جا کر انٹ شنٹ باتیں کی ہیں۔ مگر میں نے اس کا مناسب توڑ کر دیا ہے۔ ویسے بشو بھابی اور آقا حسن دونوں بہت شریف ہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو مجھے پتہ ہے۔ آخر لکھنؤ کے ہیں۔ ایسے ویسے لوگ تھوڑا ہی ہیں۔ باقی ہمارے دشمن تو بہت ہیں۔ جب ہی تو میں چاہوں ہوں کہ یہ کام جلدی ہو جائے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ بات لمبی کھنچنے سے سو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔"

"تو مجو بھائی انہیں تیار کرو۔"

اختری باجی اب راہ پر آگئی تھیں۔ اور توصیف کی زبان میں اب تالا لگ گیا تھا۔ مجو بھائی رواں تھے۔ خوبیاں گناتے چلے جا رہے تھے، لڑکی کی، اس کے والدین کی، اس کے خاندان کی۔

مگر میرا دھیان اب کہیں اور تھا۔ منگنی بیاہ کے قصوں سے مجھے ویسے ہی الجھن ہوتی ہے۔ اور یہ گفتگو ذرا لمبی ہی کھنچ گئی تھی۔ کم از کم میرے حساب سے۔ میری نظر اچٹ کر ایک میز ادھر بیٹھے چہرے پر جا کر ٹک گئی۔ لمبی داڑھی کے ساتھ سبز عمامہ سبز کرتا بس طوطا بنے بیٹھے تھے انگلیاں کے بیچ تسبیح گردش کر رہی تھی۔ باجی اختری اور توصیف کے رخصت ہوتے ہی میں نے مجو بھائی کو ٹوکا۔ "مجو بھائی، یہ کون بزرگ ہیں۔"

"انہیں تم نہیں جانتے۔ عجب بے خبر آدمی ہو۔ غازی صاحب ہیں۔" اور فوراً ہی اونچی آواز سے ان سے مخاطب ہوئے "غازی صاحب قبلہ، آداب بجالاتا ہوں۔ مزاج شریف اور ہاں آپ کی تحریک اب کس مرحلہ میں ہے۔"

"آپ لوگوں کی جوش ایمانی اور حمیت دینی کا امتحان ہے۔ صحرا میں اذان دے رہا ہوں۔"

"قریب بیٹھے ایک بزرگ نے ٹھنڈا سانس بھرا "جوش ایمانی اور حمیت دینی اب کہاں ہے۔"

غازی صاحب نے فوراً ٹکڑا لگایا "اس کی سزا بھی مل رہی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔" اور یہ کہتے کہتے غازی صاحب کا لہجہ بدلا اور خطبہ کا رنگ پیدا ہو گیا۔ "اے نیند کے ماتو، کب تک خواب غفلت میں غرق رہو گے۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا۔ یہ توہمات کے اسیر وہیں کے وہیں ہیں۔ ادھر اہل مغرب آسمان پہ کمندیں ڈال رہے ہیں۔ ادھر ہم قعر مذلت میں دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان شاطروں نے کیا کیا۔ ہمارے نوجوانوں کو فلسفہ اور سائنس کی کتابیں دے کر الحاد کے رستے پہ لگا دیا اور خود ایٹم بم بنا لیا۔ لوگوں نے مسلمان مسلمان کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میں پوچھتا ہوں مسلمان کون ہے،

کہاں ہے۔ مجھے تو دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ کوئی مسلمان ہے تو میرے سامنے آئے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ مسلمان ہونے کے کیا معنی ہیں۔ یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ اور عزیزو، میں تو ایک سیدھی سی بات جانتا ہوں کہ اگر ہم واقعی مسلمان ہوتے تو پھر ایٹم بم ہم بناتے۔ اغیار ہمارا منہ تکتے۔ خدائے تبارک و تعالیٰ، ہمارے گناہوں کو معاف کرے، ایٹم بم تو ہمارے مقدور میں تھا۔ بنا بنایا رکھا تھا۔ ان کمبخت نئی روشنی والوں نے کہ گریجویٹ بنے پھرتے ہیں قیامت نامہ، پڑھا ہوتا تو۔ انہیں پتہ چلتا۔ مگر ہماری غفلت اور اغیار کی عیاری، اب ایٹم بم ان کے پاس ہے۔"

"مگر قبلہ غازی صاحب" قریب بیٹھے بزرگ نے سوال کیا "اب اس کا علاج کیا ہے۔"

"بجا سوال کیا۔ جن کے دلوں میں اسلام کا درد اور ایمان کی کسک ہے وہ میرے پاس آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اس زوال کا علاج کیا ہے۔ غازی عطاء اللہ کہتا ہے کہ اس کا علاج ہے، اور بہت سیدھا علاج ہے۔ عمل، صرف عمل، مغرب کی سائنس اور فلسفہ تمہیں کچھ نہیں دے گا ماسوا الحاد کے۔ اس خارزار سے نکلو۔ عزیزو، میرا جنون عقل و ادراک کی ان عیاریوں کو نہیں مانتا۔ یہ سراسر ابولہبی ہے۔ مجھے تین سو تیرہ دیوانوں کی تلاش ہے جو آج کے ابوجہلوں اور ابولہبوں سے مقابلہ کر سکیں، جن کا جنون مشرق و مغرب کی اسلام دشمنی کے پہاڑوں سے ٹکرا کر انہیں پاش پاش کر دے۔ تین سو تیرہ دیوانے، یعنی تین سو تیرہ سچے مسلمان، جس روز یہ اکٹھے ہو گئے اس روز عطاء اللہ غازی کراچی شہر میں نظر نہیں آئے گا۔ بارڈر کے اس پار ہو گا۔ پہلی نماز بابری مسجد میں، دوسری نماز مسجد اقصیٰ میں۔"

"غازی صاحب قبلہ۔" مجو بھائی نے ٹکڑا لگایا۔ "پروگرام کچھ لمبا نہیں ہو گیا۔"

غازی صاحب نے شعلہ بار نظروں سے مجو بھائی کو دیکھا۔ "اسی ضعف ایمانی نے ہمیں مار رکھا ہے۔ غافلو سوچو، ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ ہم وہی تو ہیں جنہوں نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑائے تھے۔ آج ہماری ہمتیں کیوں پست ہیں۔ آخر بابری مسجد سے مسجد اقصیٰ تک کا فاصلہ کتنا فاصلہ ہے۔ مگر ضعف ایمانی نے ہمارے قدموں میں بھی ضعف پیدا کر دیا ہے۔ میں کب سے چلا رہا ہوں کہ مجھے اپنے پروگرام کے لئے تین سو

تیرہ مسلمانوں کی ضرورت ہے مگر اللہ نے جیسے ان کے کانوں پر اور دلوں پر مہریں لگا دی ہوں۔" غازی صاحب رکے، پھر درد بھرے لہجہ میں بولے "یا شاید مجھ میں ایمان کی کمی ہے۔ دل میں ایمان کی حرارت ہو تو لفظوں میں بھی حرارت اور تاثیر ہوتی ہے۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ روز محشر مجھ سے جواب طلب کیا جائے گا اے عطاء اللہ تو نے اپنا فرض ایمانی کتنا ادا کیا۔ تو تین سو تیرہ مسلمان اکٹھے نہیں کر سکا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجھ پہ رقت طاری ہو جاتی ہے۔" اور یہ کہتے کہتے غازی صاحب پہ رقت طاری ہو گئی۔

غازی صاحب کو رقت کے عالم میں دیکھ کر باجی اختری گھبرا گئیں اور بدحواس ہو کر توصیف کو پکارا۔ توصیف دوڑا دوڑا آیا۔ اور پھر فوراً ہی ٹھنڈے پانی سے بھرا گلاس لے کر غازی صاحب کے سامنے مودب کھڑا ہو گیا۔ "قبلہ پانی پیجئے۔"

(4)

"مجو بھائی، وہ جو آپ میرٹھ اور لکھنؤ کا جوڑا ملوا رہے تھے اس کا کیا بنا۔"

مجو بھائی نے مجھے غور سے دیکھا۔ لگتا تھا کہ میرے سوال پر وہ بہت محظوظ ہوئے بولے "اچھا سوال ہے۔ میں خوش ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تم روبصحت ہو۔"

اس آخری فقرے پر میں تھوڑا چکرایا۔ "کیا مطلب۔"

"مطلب یہ کہ پہلے تم کراچی کی زندگی سے بالکل کٹے ہوئے تھے۔ مجھے مطعون کیا کرتے تھے کہ کن فضول لوگوں کے فضول قصوں قضیوں میں پھنسے رہتے ہو۔ اب ماشاء اللہ سے تمہیں ان لوگوں میں، ان کے قصوں قضیوں میں دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ اچھی علامت ہے۔"

"آپ غلط سمجھے۔ مجھے ان لوگوں سے اور ان کی فضولیات سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔ دلچسپی البتہ اس سے ہے کہ آپ ان فضولیات میں جو اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اس کا کچھ حاصل حصول ہے۔"

مجو بھائی ہنسے "چلو یونہی سہی۔ کسی بھی راستے تمہیں اپنے اردگرد کی زندگی سے رتی دو رتی دلچسپی تو پیدا ہوئی یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے۔ میں خوش ہوں یہ صحت کے آثار ہیں۔"

مجو بھائی کو خوش ہونا چاہئے بھی تھا۔ وہ اپنے مشن میں کامیاب تھے۔ انہوں نے مجھے ذہنی مریض سمجھ کر یہ علاج سوچا تھا کہ اس شخص کو تنہائی کے خول سے نکالو۔ لوگوں

میں بیٹھ کر اچھی بری باتیں سنے گا۔ ہنسے بولے گا تو دل بہلے گا اور مزاج کی خشکی دور ہوگی۔ تو وہ شروع میں تو مجھے گھسیٹ کر اپنے ملنے جلنے والوں کے یہاں لے جاتے۔ ان لوگوں کے جو مشاغل تھے مثلاً مشاعرہ اور جس قسم کی وہ گفتگو کرتے تھے ان سے میں سخت بور ہوتا تھا۔ مجو بھائی ان کے ساتھ گھلے ملے تھے۔ سو وہ ان سے باتیں کرتے، قہقہے لگاتے اور میں بت بنا بیٹھا رہتا۔ سچی بات ہے ان کے کتنے اشارے کنائے تو میرے سر سے گزر جاتے۔ دوسرے داد کے انداز میں فقرے پر ہنستے قہقہہ لگاتے۔ میں بیوقوفوں کی طرح ان کا منہ تکنے لگتا۔ ان اشاروں کنایوں کا پس منظر تو کراچی کی زندگی تھی۔ یعنی جینے کا وہ طور جو ان لوگوں نے اس شہر میں آکر نکالا تھا۔ میرا اس زندگی سے ربط کم کم تھا۔ عشرت کی وجہ سے ضرور بعض گھروں میں تھوڑا آنا جانا ہوا تھا۔ اس کے گزر جانے کے بعد میری زندگی کا پرانا طور پھر واپس آگیا۔ بلکہ اب شاید زیادہ ہی میں ان سے الگ تھلگ ہوگیا۔ اب زمانے بعد مجو بھائی نے مجھے پھر اس خلقت کے بیچ دھکیلنا چاہا۔ ان کی مارا باندھی سے ان محفلوں میں اور ان گھروں میں جہاں ان کی رسائی تھی میں بھی جانے لگا۔ شروع میں جیسا کہ میں نے کہا ان صحبتوں نے مجھے بہت بور کیا۔ مگر رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ میری بوریت کم ہوتی چلی گئی۔ ایک عجیب قسم کی دلچسپی نے اس کی جگہ لے لی۔ بس یوں لگتا کہ جیسے میں الگ کھڑا ایک تماشا دیکھ رہا ہوں۔ جیسے جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ بھری پری زندگی کا عمل نہیں ہے، ایک ناٹک ہے۔ مجو بھائی نے صحیح کہا تھا کہ اپنا شہر ست خصمی شہر ہے۔ یا اللہ اس ایک شہر میں کتنے شہر اکٹھے ہوگئے ہیں۔ جیسے یہ شہر نہ ہوا سمندر ہوگیا کہ برصغیر کی ہر ندی ہر نالہ بہتا شور مچاتا آیا اور اس میں آن ملا۔ مگر ندیاں تو سمندر میں مل کر اسی میں رل مل جاتی ہیں۔ یاں ہر ندی شور کر رہی ہے کہ میں سمندر ہوں۔ اور اپنے مجو بھائی ہیں کہ ہر شور کرتی ندی کے شور میں شامل، ہر برادری کے ہلے گلے میں شریک، اب ساتھ میں مجھے بھی لئے لئے پھرنے لگے تھے۔ بس لگتا تھا کہ ایک ہزبونگ ہے کہ میں اس میں شامل ہوں اور شامل نہیں بھی ہوں۔ کبھی خوش کبھی اداس کبھی پریشان، کبھی مطمئن کہ میں جس خلقت کے بیچ سے اگا ہوں۔ اس کے بیچ سانس لئے جا رہا ہوں۔ کبھی حیران کہ یہ کون لوگ ہیں، میں کون ہوں، وہ کیا کر رہے ہیں، میں ان کے بیچ کیا کر رہا ہوں۔

"مجو بھائی، یہ تمہارے لوگ کیسے ہیں؟"

"کیا مطلب ہے میاں۔ آخر کیسے ہوتے؟"

"لگتا نہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں۔"

"وہی لوگ" مجو بھائی نے تھوڑا تامل کیا۔ پھر بولے "اماں باولے ہوئے ہو۔ جو انہیں ڈھونڈھ رہے ہو۔ وہ لوگ اب کہاں۔ جب وہاں سے نکل آئے تو ویسے کیسے رہتے۔ وہاں ندیوں کی مٹی تھی، یاں سمندر کی ریت ہے۔"

"تو پھر انہیں دیکھنے کے لئے وہاں جانا پڑے گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ مجو بھائی ہنسے "مگر پیارے یہ نہ ہو کہ جب وہاں پہنچو تو پتہ چلے کہ وہ لوگ اب وہاں بھی نہیں ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"زمانہ۔ میاں زمانہ۔"

"اچھا؟" میں اداس ہو گیا۔

"ہاں" یہ کہتے کہتے مجو بھائی نے نوٹس دیا۔ "زیادہ سوچا نہیں کرتے۔ چلو اٹھو، چلتے ہیں۔"

"کہاں۔"

"بس چلتے ہیں۔ ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے۔"

"ملا کی دوڑ مسجد تک، میرٹھ والوں کا دروازہ کھٹکھٹاؤ گے یا لکھنؤ والوں کے در پہ دستک دو گے۔"

مجو بھائی ہنسے۔ "اچھا آج وہاں نہیں جاتے۔ تمہیں ایک نیا نمونہ دکھاتے ہیں۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟"

"بس پوچھو مت۔ چلے چلو۔ دیکھو گے تو خود پہچان لو گے۔"

"اچھا؟"

"ہاں وہ چیز ہی ایسے ہیں۔"

واقعی۔ چیز ہی ایسے تھے۔ ان کی بولی الگ تھی۔ بیوی کی بولی الگ۔

"میاں جواد۔ یہ ہیں ہمارے قبلہ سید شبیر حسین کربلائی۔ تمہارے مطلب کے بزرگ ہیں۔ قبلہ یہ میرے دوست ہیں جواد۔"

"خوب۔ میاں کہاں کے رہنے والے ہو۔"

کہاں کے رہنے والے ہو۔ سید ہو؟ کس خاندان سے ہو' سید اس بستی میں کتنے تھے۔ اور اماباڑے' وہ کتنے تھے۔ ایک دم سے اتنے سوال کر ڈالے کہ میں بوکھلا گیا۔

"میاں' ہم شکارپور کے ہیں۔ بلند شہر ضلع میں یہ مشہور سیدوں کی بستی تھی۔"

"سیدوں کی بستی" سیدانی چچی (مجو بھائی انہیں یہ کہہ کر ہی مخاطب کر رہے تھے) نے تحقیر سے کہا۔ "سیدوں کے تو واں گنتی کے گھر تھے۔ باقی تو ہندو ہی ہندو تھے۔ اے بھیا ہولی کے دن تو وہ اتی چیخم دھاڑ مچاویں تھے کہ میں بولا جاوے تھی۔ پتہ نہیں کیوں یہ ہروقت ہمارا شکارپور ہمارا شکارپور کی رٹ لگائے رکھے ہیں۔"

"تھے تو وہ ہندو۔" کربلائی صاحب بولے "مگر اپنے اپنے ہنر میں ماہر تھے۔ مجید میاں' بنواری کمال کا حلوائی تھا۔ کمبخت کے ہاتھ میں ذائقہ بہت تھا۔ سچی بات ہے' خدا کو منہ دکھانا ہے۔ شکارپور سے نکل کر ویسا بیسن کا لڈو ہم نے نہیں کھایا۔"

"حلوائیوں کی بھی سن لو۔" سیدانی چچی نے فوراً ہی تردیدی بیان جاری کر دیا۔ "ایک ہی تو گلی تھی جس میں حلوائیوں کی دکانیں تھیں۔ حلوائی ہندو ہی ہندو۔ اور اے بھیا گلی میں وہ دھواں اور اتنے تنتے کہ الٰہی توبہ۔ اوپر سے مٹے کتے۔ کڑھاؤ ذرا خالی ہوا اور انہوں نے اسے چاٹنا شروع کر دیا۔ اور مٹھائی کونسی تھی۔ ہاٹ والی گڑ کی گزک' میٹھے تیل میں تلے میٹھے سیو' اور گڑ دھانیاں' اے لو یہ مٹھائی ہو گئی۔ ارے اس سے اچھی مٹھائی تو ایک دفعہ میں چھتاری گئی تھی وہاں کھائی تھی۔"

"چھتاری" کربلائی صاحب تحقیر آمیز لہجہ میں بولے۔ "وہاں تو نواب صاحب کی مونچھیں ہی مونچھیں تھیں' اور کیا تھا۔ شکارپور سے چھتاری کا کیا مقابلہ۔"

"اے بھیا انہیں سمجھاؤ۔" سیدانی چچی مجو بھائی سے مخاطب ہوئیں "شکارپور میں بھلا تھا کیا۔ اے بھیا بزار میں تو واں خاک اڑے تھی۔ نوٹے اکے' مرے گرے بیلوں جتی بیل گاڑیں' تیلیوں تنبولیوں کی دکانیں۔ ارے میں تو کسی سے کہتی ہی نہیں

کہ ہم شکارپور کے ہیں۔ بھلا کیوں اپنے پہ ہنسوائیں۔ اللہ رکھو ہمارے دونوں پوت امریکہ میں راج کر رہے ہیں۔ ارے وہ تو دونوں ہی خط پہ خط لکھ رہے ہیں کہ اماں کراچی سے نکلو۔ وہ کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ ہمارے پاس امریکہ کا کارڈ ہے۔ بس ہاں کہہ دو، فوراً ویزا لگوا کے ہوائی جہاز میں بٹھال کے آپ کو امریکہ لے آویں گے۔ اور بھیا میں بھی سوچوں ہوں کہ کراچی اب کوئی رہنے کی جگہ رہ گئی ہے۔ دن رات گولی چلے ہے۔ مٹے بھوڑے دندناتے پھرے ہیں۔ جوان جہان آدمیوں کو اٹھا کے لیجاوے ہیں۔ اوپر سے ڈاکوؤں نے ایسی آفت بوئی ہے کہ اللہ توبہ۔"

"ڈاکو۔" کربلائی صاحب بڑبڑائے۔ "ہم تو انہیں ڈاکو ہی نہیں مانتے۔ مجو میاں، کسی ڈاکو کا نام تمہیں معلوم ہے۔"

"جی اگر نام معلوم ہو جائے تو ڈاکو پکڑا نہ جائے۔"

کربلائی صاحب ہنسے "کیسی باتیں کر رہے ہو مجو بھائی۔ یہی تو ڈاکو کی شان ہوتی ہے کہ اس کے نام کا ڈنکا بجتا ہے، بچے بچے کی زبان پر اس کا نام ہوتا ہے۔ مگر کوئی مائی کا لال ہی ہوتا ہے جو اسے پکڑتا ہے۔ سلطانہ ڈاکو کا نام پورے انڈیا میں گونجتا تھا۔ یہ کہاں کے ڈاکو ہیں کہ کراچی میں بھی کوئی ان کا نام نہیں جانتا۔"

"ارے خیر تم تو اپنا دھندہ لے کے بیٹھ گئے۔" سیدانی چچی نے پھر ان کی بات کاٹی۔ "میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ کراچی اب رہنے کی جگہ نہیں رہی۔ ارے میں تو یاں پہ گھڑی پانی نہ پیؤں۔ ایک دھمی گھٹنے سے لگی بیٹھی ہے۔ اسے کسی کے پلے باندھ دوں۔ بس جس روز یہ فریضہ ادا ہو گیا اسی روز چاہے ویزا ملے یا نہ ملے بندی امریکہ کے جہاز میں سوار ہو جاوے گی۔"

"نذیر کی ماں کیسی باتیں کرتی ہو۔ امریکہ یاں رکھا ہے۔ کالے کوسوں کا سفر ہے۔"

"اجی پاکستان کا سفر بھی کالے کوسوں ہی کا سفر تھا۔ دم دم کی خیر مناتے ہوئے ہم یاں پہ پہنچ ہی گئے۔ امریکہ کا سفر لمبا سفر تو ہے۔ مگر چین کا سفر ہے۔"

کربلائی صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا "ٹھیک کہتی ہو۔ عجب گھڑی میں ہم نے شکارپور چھوڑا تھا۔ سارا سفر اسی دھڑکے میں گزر گیا کہ سٹیشن پر پہنچ جائیں گے یا نہیں۔

پل پل کی خیر مناتے ہوئے سفر طے کیا تھا۔"

یہ کہتے کہتے چپ ہوئے اور خیالوں میں ڈوب گئے۔ وقفے کے بعد بولے "مجید میاں، پرسوں رات کی بات ہے------ ہاں پرسوں رات ہی کی تو بات ہے۔ عجب خواب دیکھا۔ جیسے میں شکارپور گیا ہوں۔ اتنا خوش، اتنا خوش، بس کچھ مت پوچھو۔ اور حیران بھی، حیران یہ دیکھ کر ہو رہا تھا کہ شکارپور اتنا خوبصورت ہو گیا ہے۔ اونچی اونچی پکی عمارتیں جیسے محل ہوں۔ میاں تم یقین کرو گے، کوئی کچا گھر نہیں۔ اور سڑکیں، وہ دھول سے اٹی کچی پکی گڑھوں والی سڑکیں سب غائب۔ یہاں سے وہاں تک پکی ہموار سڑکیں شیشے کی طرح چمکتی ہوئی۔ اور موٹریں چل رہی تھیں۔ میں حیران کہ اکے کہاں گئے۔ کوئی بھی اکہ نہیں تھا۔ ایک ربر ٹائر تانگہ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اور ہماری گلی کیسی چم چم کر رہی تھی۔ گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ مگر سکون بہت تھا۔ بس میں گلی میں مڑا ہی تھا کہ آنکھ کھل گئی۔" رکے پھر بولے "بہت افسوس ہوا۔ کس وقت آنکھ کھلی ہے۔ ہمیشہ خواب میں میرے ساتھ ایسے ہی ہوتا ہے۔ خوش خوش اپنے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ اب آیا گھر۔ مگر ادھر گلی میں قدم رکھا اور آنکھ کھل گئی------ مگر یہ خواب عجب تھا۔"

"ہو گا عجب" سیدانی بچی بیزاری سے بولیں "تم تو جب سے یاں آئے ہو ایسے ہی الٹے سیدھے خواب دیکھ رہے ہو۔ یاں آ کے خواب ہی دیکھے ہیں اور کیا کیا ہے۔ اللہ رکھے نذیر اور بشیر کی کمائی نہ ہوتی تو ہمارے تو گھر میں فاقے پڑ جاتے۔ اور جب سے ان کی کمائی آنی شروع ہوئی ہے۔ اس وقت سے تو انہوں نے بالکل ہی ہاتھ پیر ڈال دیئے ہیں۔ پتہ نہیں انہیں اتنے خواب کیوں دکھائی دیوے ہیں، اور ہر خواب میں شکارپور، مجھ بخت ماری کو تو کبھی خواب میں شکارپور دکھائی نہیں دیا۔ شکارپور خوبصورت ہو گیا ہے۔ خواب میں تو خوبصورت ہی نظر آوے گا۔"

"ایسی تو بات نہیں ہے، نذیر کی ماں۔ پچھلے مہینے جو میں نے خواب دیکھا تھا وہ میں نے تمہیں سنایا بھی تھا۔ دیکھا کہ شکارپور اجڑا پڑا ہے۔ سب جیسے کہیں چلے گئے ہوں۔ یہاں سے وہاں تک سناٹا۔ ایک کتا کھڑا بھونک رہا تھا۔ میں ڈر گیا۔ سوچا کہ جلدی سے گھر چلو۔ گھر جانے کے لئے گلی میں مڑا ہوں۔ دو قدم چلا ہوں گا کہ آنکھ کھل گئی۔"

سیدانی چچی جیسے خوابوں کے اس قصے سے بالکل بیزار ہو چکی ہوں۔ بیچ میں دوسرا ہی سوال کھڑا کر دیا۔ "اے مجو بھائی، وہ جو تم لکھنؤ والوں کی دھمی کا رشتہ کرا رہے تھے اس کا کیا ہوا۔"

"اجی کیا پوچھتی ہو سیدانی چچی، یہ تمہارے لکھنؤ والے تو بہت مین میخ نکالتے ہیں۔ اچھا بھلا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ اب انہوں نے یہ نئی نکالی ہے کہ یہ تو گنوار دو لوگ ہیں۔ ہم انہیں اپنی بیٹی کیسے دے دیں۔"

"مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ یہ لوگ ضرور کچھ نہ کچھ نئی نکالیں گے۔ ان کی انہیں باتوں کی وجہ سے تو بڑی تھک کے بیٹھ گئی۔ خیر اس نے تو ڈاکٹری کر لی تھی۔ خیر سے اپنا شفاخانہ بھی کھول لیا ہے۔ کسی کے ٹکڑوں کی محتاج تو نہیں ہوگی۔ اس کام میں تو اتنی آمدنی ہے کہ چار کو کھلا کے خود کھاوے گی۔ مگر چھوٹی کیا کرے گی۔ ماں باپ سدا کس کے رہے ہیں۔ اپنی زندگی میں کسی کے پلے باندھ دیتے تو اچھا ہی تھا۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ ان کے بعد وہ کس کے در پہ بیٹھے گی۔"

"خیر ایسی بات تو نہیں ہے۔ پڑھی لکھی تو یہ بھی ہے۔"

"اے بھیا خالی پڑھا لکھا ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ہاتھ میں کوئی ہنر بھی تو ہونا چاہئے۔ ویسے تو بی اے، ایم اے مارے مارے پھرے ہیں۔ خالی ڈگری کی اوقات کیا ہے۔ نہ خالی کتابوں میں کچھ رکھا ہے۔ ویسے بھی بھیا یہ تو مردوں کے کام ہیں۔ لڑکی تو سیتی پروتی کاڑھتی بنتی ہی اچھی لگتی ہے۔ کتابیں پڑھ کے کیا اسے افلاطون بننا ہے۔ میں تو جب بھی اس گھر گئی یہی دیکھا کہ وہ لڑکی الگ کونے میں منہ دیئے کتاب پڑھ رہی ہے۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہہ ہی دیا کہ بیٹی، پکانے رندھنے میں بھی تو دلچسپی لیا کرو کہ کچھ ماں کے کام کا بوجھ بھی ہلکا ہو اور تمہیں بھی گھر بار کا سلیقہ آوے۔ باقی بیٹی کتابوں کا تو یہ ہے کہ جتنی کتابیں ماشے اللہ تم نے پڑھ لی ہیں ان سے آدھی بھی حدیث قرآن کی کتابیں پڑھ لیتیں تو عاقبت سنور جاتی۔ یہ نگوڑی انگریزی کی کتابیں پڑھنے میں کے رکات کا ثواب ہے۔"

"سیدانی چچی، آپ بھی کمال کرتی ہیں۔"

"اے بھیا سچی بات تو کہنی ہی پڑتی ہے۔ کوئی برا مانتا ہے تو مان جائے۔ دغل

فصل کی جاتیں وہ کرے جسے کسی سے کچھ لینا ہو۔ مجھے کسی سے کیا لینا ہے۔ سوچی بات جب منہ پہ آجاوے ہے تو میں پھر رکتی نہیں۔ اسی سے تو میں سب کی بری ہوں۔ مگر میری بیزار سے۔ جو مجھے دیتا ہو وہ نہ دے۔"

"چچی یہ تو دوسرا مضمون شروع ہو گیا۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ اچھا بھلا لڑکا ہے۔ شریف خاندان ہے۔ دیکھے بھالے لوگ ہیں۔ ان کے زیادہ مطالبات بھی نہیں ہیں۔ لڑکی وہاں خوش رہے گی۔"

"اے وہ تو ٹھیک ہے۔ اب ان کی بیٹی کے لئے کوئی عرش کا تارہ تو ٹوٹ کے آوے گا نہیں۔ اچھے برے جیسے بھی ہیں۔ یہی لڑکے ہیں۔ مگر ان لکھنئو والوں کا دماغ تو عرش معلی پہ ہے۔ اپنے سوا سب کو گنوار سمجھتے ہیں۔ دوسروں کی اولادوں میں سو عیب نکالتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کو سمجھتے ہیں کہ جیسے وہ سانچے میں ڈھل کے نکلی ہیں۔"

کربلائی صاحب نے بھی اب زبان کھولی۔ کہنے لگے "مجو میاں، میں نے لکھنؤ دیکھا ہے۔ میں شکارپور کی پچ میں نہیں کہہ رہا۔ خدا لگتی کہتا ہوں کہ اگر اماباڑوں کو الگ کر لو تو پھر جیسا شکارپور ویسا لکھنؤ۔ بلکہ شکارپور میں تو پھر بھی بہت کچھ ہے ان لوگوں کے سارے دعووں کا جواب حضرت بسمل الہ آبادی نے ایک شعر میں دے دیا ہے۔ وہ الہ آباد کے تھے۔ انہوں نے الہ آباد کی فضیلت کا کیا پہلو نکالا ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

بڑھا رہے ہیں بہت لکھنؤ کی شان مگر
وہ گومتی کو تو گنگا بنا نہیں سکتے

مجو میاں، انصاف سے کہنا، کیسی کہی۔"

"خوب۔ اچھا نکتہ ہے۔"

"ویسے تو لکھنؤ والے شاعری میں بہت قدم رکھتے ہیں۔ مگر اس شعر کا جواب نہیں لا سکے۔"

"اس بات کا جواب کہاں سے لائیں۔" یہ کہتے کہتے مجو بھائی پھر سیدانی چچی سے مخاطب ہو گئے۔ "سیدانی چچی، ایک ان لوگوں نے سید ہونے کو مسئلہ بنا لیا ہے۔ انہیں گنوار کہتے کہتے یہ سوال کھڑا کر دیا کہ یہ لوگ تو سید ہی نہیں ہیں۔ کمبوہ ہیں۔"

"ہائے یہ میں کیا سن رہی ہوں۔" سیدانی چچی تو اچھل پڑیں۔ "یہ میرٹھ والے

سید نہیں ہیں۔"

"سیدانی چچی، میں یہ کہتا ہوں کہ چلو سید نہیں ہیں نہ سہی لڑکا تو ہر اعتبار سے اچھا ہے۔"

"اے بھیا، برا مت ماننا، انصاف کی کہوں گی۔ نکھلو والوں سے مجھے کچھ لینا نہیں ہے۔ مگر یہ بات تو ان کی ٹھیک ہے۔ آنکھوں دیکھتے تو مکھی نہیں نگلی جاتی۔ جانتے بوجھتے غیر سیدوں میں بٹی کو کیسے جھونک دیں۔"

"سیدانی چچی، اس میں ہرج کیا ہے۔"

"اے ہے کوئی ہرج ہی نہیں ہے۔ اے بھیا کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا چودھویں صدی میں یہ قیامت بھی ٹوٹنی تھی کہ سیدوں کی بیٹیاں غیر سیدوں کے گھروں میں جاویں۔"

"اور سید لڑکے نہ ملیں تو؟"

"ارے یہی تو میں پوچھتی ہوں کہ سید لڑکوں کی اس زمانے میں کیوں اوڑا پڑ گئی۔ سید زادیاں بیٹھی ہیں اور یہ ڈوبے سیدوں کے لڑکے کن کن کے پیچھے باولے بن رہے ہیں۔ میں یہ کہوں ہوں کہ قیامت کے دن جب خاتون جنت ان سے پوچھیں گی کہ بخت مارو، تمہارا خانہ خراب ہو، تم نے میری نسل کیوں خراب کی تو یہ کیا جواب دیں گے۔"

"یہ آج کل کے سید زادے۔" کربلائی صاحب بڑبڑائے "سادات پہ کیا زوال آیا ہے۔" کربلائی صاحب نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس لیا اور چپ ہو گئے۔

بس اسی لمبے ٹھنڈے سانس پر وہ ملاقات ختم ہو گئی۔

(5)

شام پڑے مجو بھائی کا فون آیا "اماں گھری پہ ہو۔ کیا کر رہے ہو؟"

"میں تو گھری پہ ہوں۔ بیٹھا مکھیاں مار رہا ہوں۔ مگر حضور آپ آج کہاں غائب ہیں۔"

"اماں، بور ہو رہے تھے۔ پہلے تو ہم نے تمہارا انتظار کیا۔ مگر جب تم نہیں آئے تو ہم نے سوچا کہ استاد کو آج بینک نے پکڑ لیا۔ تو میں اکیلا ہی نکل کھڑا ہوا۔ سوچا کہ توصیف میاں سے مل لیں۔ یاں آئے تو ایک اور افتاد پڑ گئی۔"

"وہ کیا۔"

"اس علاقہ میں گڑبڑ ہو گئی۔"

"اچھا؟ کیا ہوا۔"

"کہتے ہیں کہ نقاب پوش تھے۔ وہ تو اندھا دھند گولیاں چلا کر چلے گئے۔ اس وقت تو سب کو سانپ سونگھ گیا۔ چلے گئے تو مار پیچھے پکار۔ ہنگامہ شروع ہو گیا۔ فوراً ہی پولیس آ گئی۔ پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ اور پھر کرفیو۔ تو جواد میاں، ہم تو ادھر پکڑے گئے۔ رات ادھری گزرتی نظر آ رہی ہے۔ توصیف میاں نے جھٹ رتجگے کا پروگرام بنا ڈالا۔ یعنی مشاعرہ۔"

"ایسا موقعہ آپ کو خدا دے۔"

"بس بھائی پکڑے گئے۔ بندگی بیچارگی۔ توصیف میاں کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ گلی شاعروں سے پٹی پڑی ہے۔ سو مشاعرہ رات بھر چلے گا۔ ساتھ میں تار روئی۔"

"یہ تار روئی بیچ میں کہاں سے آ گئی۔"

"اماں تمہیں پتہ نہیں۔ برابر میں رامپور والوں کا گھر ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے یاروں کے لئے تار روئی کی آفر دے دی۔ تو کرفیو کی رات اچھی گزر جائے گی۔ ادھر تو کچھ نہیں ہوا؟"

"نہیں۔"

"پھر بھی چوکنے سونا۔ نعمت خاں ہے نا؟"

"اسے کہاں جانا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ کل کسی وقت کرفیو نرم پڑ گیا تو بس اس وقت ہی یہاں سے رہائی ملے گی۔"

تو مجو بھائی کرفیو کے بہانے ادھر اپنے شغل میں لگ گئے۔ میں نے بھی اپنے لئے مصروفیت پیدا کر لی۔ پچھلے دنوں کباڑی کے یہاں سے ایک کام کی کتاب ہاتھ آ گئی تھی۔ سوچا کہ آج ذرا اس کی مہورت ہو جائے۔ مگر کتابوں میں ایسی رل مل گئی تھی کہ مل ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے چکر میں ساری کتابیں الٹ پلٹ کر ڈالیں۔ کتابوں کی الٹ پلٹ میں عجب ہوتا ہے۔ کب کب کے بھولے بسرے کاغذات برآمد ہوتے ہیں۔ کوئی کتابوں کے پیچھے سے، کوئی کتاب کے اندر رکھا ہوا، کوئی کتابوں کے بیچ میں ٹھنسا ہوا۔ اور ہر ایسے کاغذ کے ساتھ گزرے دنوں کی کوئی یاد زندہ ہو جاتی ہے، کسی بھولے واقعہ کی تجدید ہو جاتی ہے۔ اسی الٹ پلٹ میں کئی خط برآمد ہو گئے۔ کتابوں کے پیچھے پڑے تھے۔ ہائیں پھوپھی اماں کا خط۔ یہ کب آیا تھا۔

عزیز از جان میاں منن طولعمرہ

پھوپھی غریب کی ہزاروں دعائیں لو اور خوش رہو۔ لال، کیا ہم سے خفا ہو کہ کبھی دو حرف خیریت کے بھی نہیں لکھتے۔ آخر پتہ تو چلے کہ غریب پھوپھیا کی کس بات سے دل پہ میل آیا ہے۔ میں نے تو تمہیں پھول کی طرح رکھا تھا۔ پھر بھی نگوڑی کوئی

بات ہو گئی ہو تو بیٹے معاف کر دو۔ تم اپنی پھوپھی اماں کو بھول گئے۔ مگر پھوپھی اماں تمہیں کیسے بھول جائے کہ تم اس کے موئے ماں جائے کی اکلوتی نشانی ہو۔ اللہ اللہ کر کے تمہیں پالا۔ گو موت کیا۔ تمہاری خاطر دن کو دن نہیں سمجھا، رات کو رات نہیں گردانا۔ خود گیلے میں سوئی تمہیں سوکھے میں سلایا۔ کتنی راتیں ایک کروٹ سوئی کہ کروٹ بدلنے میں تم بے آرام نہ ہو۔ تمہاری نگوڑی نیند بھی تو ایسی تھی کہ مشکل سے آتی تھی اور ذرا کروٹ لو تو آنکھ کھل جاتی تھی اور ایک دفعہ کھل جاتی تو پھر مشکل سے لگتی تھی۔ پٹ بیجنا سی آنکھیں جھپکاتے رہتے تھے۔ پھر کتنی مشکلوں سے تمہیں سلاتی تھی۔ تو لال، ایسے ہم نے تمہیں پالا۔ یہ کیا خبر تھی کہ بڑے ہو کر ایسی پیٹھ دکھاؤ گے کہ غریب دکھیا پھوپھی پھر تمہاری صورت کو ترس جاوے گی۔ اللہ رکھے لوگ پردیس تو پہلے بھی جایا کرتے تھے۔ بھیا جان اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے سات سمندر پار کر کے ولایت میں جا براجے تھے۔ مگر اتوارے پندھرواڑے میں خیریت کا تار برقی بھیجتے تھے۔ یہ اس زمانے کی محبتیں تھیں۔ اب ناس پیٹا نیا زمانہ ہے اور پاکستان بن گیا ہے۔ کیسے خون سفید ہوئے ہیں کہ جو ادھر جاتا ہے پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ ارے تمہارا پاکستان تمہیں مبارک رہے۔ خاطر جمع رکھو، ہم حصہ بٹانے نہیں آویں گے۔ ہم تو محبتوں کے بھوکے ہیں۔ اگر مہینے دو مہینے میں خیر صلا کا پرزہ لکھ دیا کرتے تو ہم سکھی رہتے۔ اب جی ہولیں کھاتا رہتا ہے کہ الٰہی ہمارے بچے آنکھوں کے تارے جی کے سہارے اللہ میاں کے پچھواڑے گئے ہیں۔ خیریت سے رہیں۔ سوائے غم حسین کے کوئی غم انہیں مت دکھائیو۔

اب اپنی دکھیا پھوپھیا کا حال سنو۔ ہوا تو تو میں پہلے ہی تھی۔ اب یہ سمجھو کہ ہڈیوں پہ بس کھال منڈھی رہ گئی ہے۔ بھوک مر گئی ہے۔ ایک پھاکا پورا کھا لوں تو پیٹ تزم ہو جاتا ہے۔ ہری گیلی چیز کو ترس گئی۔ موسم کی کونسی شئے ہے جو گھر میں نہیں آتی۔ پہلے والا زمانہ نہیں۔ مگر اب بھی گھر میں افراط رہتی ہے۔ کھانے والے تو چلے گئے۔ افراط ہی رہے گی۔ پوکھر سے تازہ تازہ نکلے ہوئے کچے کچے گلاب سے مہکتے سنگھاڑے، دودھیا دانوں سے بھرے بھٹے، سیندیں، پھوٹ، خربوزہ، تربوز، سب سے بڑھ کے آم جامن، اپنی اپنی فصل پہ ہر چیز اب بھی گھر میں اتنی آتی ہے کہ سیروں کے حساب

سے گل سڑ کے پھنکتی ہے۔ مگر میں ہر شئے کے لئے ترس گئی۔ کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی۔ معدے پہ خدا کی سنوار، گھڑی بھر میں تولہ ماشہ ہو جاتا ہے۔

کیا تمہیں یقین آوے گا کہ اب کے ساون میں پکوان کے نام ایک پھلکی میرے منہ میں نہیں گئی۔ ایسا نہیں ہے کہ گھر میں کڑھائی نہ چڑھی ہو۔ ارے ویسے تو اب کاہے کا ساون رہ گیا ہے۔ اب تو سارا ساون بھادوں تمہاری پھوپھیا کی آنکھوں میں سمٹ آیا ہے۔ مگر پھر بھی کمبخت رتوں کا تو لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور اب کے تو جھکا بھی ایسا لگا کہ پندھرواڑہ بیت گیا اور سورج دکھائی نہیں دیا۔ تو پھر کڑھائی تو چڑھنی ہی تھی۔ ہری گیلی چیزیں ڈھیر ساری چھوٹے میاں بازار سے لے آئے۔ سندیں تو پھلکی پھنکی پھر رہی تھیں۔ بھلا اب اتنے کھانے والے گھر میں کہاں ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر گھیور۔ چھوٹے میاں نے کتنا اصرار کیا کہ پھوپھی اماں، یہ تو ساون کی مٹھائی ہے۔ اور آپ کو تو ویسے بھی گھیور بہت پسند ہے۔ مگر قسم لے لو جو میں نے گھیور بھری تھالی کو آنکھ بھر کے دیکھا ہو۔ ادھر کڑھائی چڑھی تھی۔ اور ہر طرح کا پکوان یک یک کر اتر رہا تھا۔ شکر پارے، نمک پارے، پوڑے، پھلکیاں، گھنگھنیاں، سوندھی سوندھی مہک آتی رہی اور میں دم مارے بیٹھی رہی۔ ہاں جب اروی کے پتے تلے جانے لگے تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ مگر میں نے کھایا کتنا تھا۔ یہی کوئی آدھا پونا پتہ، مجھ کال کھاتی کو کیا خبر تھی کہ اسی میں نیس ہو جاؤں گی۔ بس دم کے دم میں الٹ گئی۔ لیکھو دوڑیو ہو گئی۔ اب گئی کہ اب گئی۔ مگر زندگی تھی کہ بچ گئی۔ لے دے کے ایک سانس کی ڈوری ہی تو ہے کہ چل رہی ہے۔ اس ڈوری کا کیا بھروسہ، کچا سوت ہے، کسی وقت بھی ٹوٹ جاوے۔

تو بیٹے اب اب مجھ میں کچھ نہیں رہا۔ بس سانس آ جا رہا ہے۔ پوچھو گے کہ مرض کیا ہے۔ ارے بیٹا کوئی بھی مرض نہیں ہے۔ سو مرضوں کا ایک مرض بڑھاپا۔ یک پیری و صد عیب، بس اب تو یہی دعا ہے کہ کسی طرح سے یہ سار ہو جاوے۔ ارے میں تو حیران ہوں کہ اب تک جی کیوں رہی ہوں۔ بھیا جانی پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اب میاں جانی کی بھی آنکھ بند ہو گئی۔ بخت ماری بہن کو عاقبت کی بورئیں سمیٹنے کے لئے چھوڑ گئے۔ لیکن خیر میرا کوچ اب زیادہ دور نہیں ہے۔ پرسوں کی بات ہے میں نے خواب میں کیا دیکھا کہ اکہ ڈیوڑھی کے سامنے آ کے رکا ہے۔ بھیا جانی اور میاں

جانی اس میں سے اترے ہیں۔ میں خوش بھی اور حیران بھی کہ یہ کہاں سے نکل آئے۔ اور کیا بتاؤں کہ چہروں پہ کیسی رونق تھی۔ اور لباس سفید براق۔ اکے سے اترے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ بہن ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ سامان باندھ لو۔ میں کہہ رہی ہوں کہ مجھ غریبنی کے پاس کیا سامان ہونا تھا۔ بس ایک پوٹلی ہے جس میں سے تلے دانی نکال لوں تو کچھ بھی نہ بچے اور ہاں جانماز جس میں ایک سجدہ گاہ خاک شفا والی، ایک تسبیح، اور پنج سورہ اور ہاں مناجاتوں کی ایک کتاب ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ پھر دیر کس بات کی ہے۔ بسم اللہ کرو۔ اے لو اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ پچھلا پہرا تھا۔ گھڑی گزری ہوگی کہ مرغے نے اذان دے دی۔ تو لال میرے، سواری ہماری تیار ہے۔ سفر کا نٹو کسا کھڑا ہے۔ اسی لئے یہ رقعہ لکھا ہے کہ آخری وقت میں صورت دکھانے جاؤ۔ اور اپنی پھوپھی اماں کے جنازے کو کاندھا دے جاؤ۔ ارے یہی تو دکھ مجھے کھائے جا رہا ہے کہ میرا وقت آیا تو سب تتربتر ہو گئے۔ جب بھیا جانی سدھارے تھے تو گھر بھرا ہوا تھا۔ پورا کنبہ ان کے لئے رویا تھا۔ اور جب جنازہ اٹھا تھا تو کیا بین ہوئے ہیں۔ چالیسویں تک رونق رہی۔ اور چالیسویں پہ دور پرے کے رشتہ دار بھی پردیس سے آئے اور فاتحہ میں شامل ہوئے۔ میاں جانی کا وقت آیا تو کتنے کنبہ والے پاکستان کی طرف نکل گئے تھے۔ پھر بھی عزیز قریب بت سے موجود تھے۔ مجھ نصیبوں جلی کے آرام کا وقت آیا تو سب کیا قریب کے کیا دور کے چڑیوں کی طرح اڑ گئے۔ ایک چھوٹے میاں جے بیٹھے ہیں۔ ٹھیک نہ چھوڑنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ رہ گئے پیارے میاں تو وہ تو جائیداد کے کوڑے کرنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ ہندوؤں کا بھلا ہو کہ جائیداد کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ آج سودا ہو جائے تو دوسرے دن ہمارے یہ بھتیجے ریل پہ سوار ہو جاویں۔ بیٹے برا مت مانیو، پاکستان والوں نے ہمارے بھرے گھر کو اجاڑ کے رکھ دیا۔ جگ جگ جاتے، مگر ہمیں اجاڑ کے تو نہ جاتے۔ پیارے میاں کو دیکھو۔ خود تو پاکستان جا کے گلچھرے اڑاویں گے۔ یاں کوشش یہ ہے کہ جائیداد اونے پونے ٹھکانے لگ جاوے اور چھوٹے میاں کے ہاتھ میں بھیک کا پیالہ ہووے۔

خیر ہم نے تو جیسے تیسے اپنے دن تیر کر لئے۔ ڈولی آئی کھڑی ہے۔ اللہ میری مٹی سار کرے۔ سب فکروں سے فارغ ہوں، سوائے اس فکر کے کہ میرے جنازے کو

کاندھا کون دے گا۔ ہاں تھوڑی فکر میمونہ کی ہے۔ وہ میرے بعد کس کے گھٹنے سے لگ کے بیٹھے گی۔ اس کی ہاتھ پیلے کر دیئے ہوتے تو نچنت دنیا سے جاتی۔ اب یہ فکر چھاتی پہ دھر کے لے جاؤں گی۔ خیر یہ تو قسمت کے معاملے ہیں۔ آدمی لاکھ جتن کرے کچھ نہیں ہوتا۔ جس کام کے لئے جو وقت مقرر ہے وہ کام اسی وقت ہووے ہے۔ چاہتی یہ تھی کہ بڈی میں بڈی اور پیوند میں پیوند مل جاوے۔ مگر خیر۔

اچھا بیٹا یہ رام کہانی سننے کے لئے تمہارے پاس کہاں وقت ہوگا۔ تھوڑے لکھے کو بہت سمجھو اور کسی طور گھڑی بھر کے لئے آکر اپنی صورت دکھا جاؤ، میری دعائیں لے جاؤ۔

دعاگو

تمہاری پھوپھی اماں

میں نے خط الٹ پلٹ کر دیکھا کہ آخر کب آیا تھا یہ خط اور میں نے اس کا جواب دیا بھی تھا یا نہیں۔ خط پر تاریخ ہی درج نہیں تھی۔ دوسرا خط کھولا کہ شاید اس سے کوئی سراغ ملے۔

منّن، ارے بھئی سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں کیسے مخاطب کروں۔ تمہیں بتادو کہ کیا القاب استعمال کروں۔ پتہ نہیں مجھے یہ خط لکھنا بھی چاہئے تھا یا نہیں۔ مگر اماں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ بیتاب ہو کر خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اماں کا حال کیا پوچھو ہو۔ کمر بستر سے لگ گئی ہے۔ سارے سے اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ روتی رہتی ہیں کہ سب پاکستان چلے گئے۔ جنازے کو کون کاندھا دے گا۔ آنسو ہیں کہ تھمنے میں نہیں آتے۔ سب سے بڑھ کر تمہیں یاد کرتی ہیں۔ کس حسرت سے کہتی ہیں کہ بس ایک مرتبہ جواد کی صورت دیکھ لوں۔ پھر دم آرام سے نکلے گا۔ جواد، اماں میں اب کچھ نہیں رہا۔ بس سانس کی ڈوری چل رہی ہے۔ شیطان کے کان بہرے اور میرے منہ میں خاک، پتہ نہیں کس وقت ٹوٹ جائے۔

تو بس یہ بتانے ہی کے لئے یہ خط لکھا تھا۔ آگے تمہیں اختیار ہے۔ وہاں جا کے تم ہم سب ہی کو بھول گئے۔ یقین نہیں آتا۔ کل رات ہی کی تو بات ہے۔ اماں کی

طبیعت اک ذرا سنبھلی ہوئی تھی۔ تمہارا ذکر لے کر بیٹھ گئیں۔ کتنی دیر تک کرتی رہیں۔ کبھی بچپن کی کوئی شرارت، کبھی لڑکپن کی کسی دلگی کا ذکر۔ ہائے جواد، تم بچپن میں اتنے نکھٹو تھے۔ کچھ کچھ تو مجھے بھی یاد ہے۔ مجھے بھی تو بہت ستاتے تھے۔ خیر مجھے بھی غصہ آجاتا تھا۔ جیسا کہ اماں بتاتی ہیں، بچپن میں، میں بہت جلے تن تھی۔ ذرا سی بات ہوئی اور اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ جاتی۔ آخر تمہیں ہی جھکنا پڑتا تھا۔ خیر اب ان باتوں کو کیا یاد کرنا۔ وہ زمانہ خواب ہوگیا۔ تم اتنی دور چلے گئے، بقول اماں اللہ میاں کے پچھواڑے۔ اماں جب تمہاری باتیں کر رہی تھیں تو کبھی ہنستی تھیں کبھی رونے لگتی تھیں۔

ویسے اماں کا دکھ سمجھ میں آتا ہے۔ خون کا رشتہ اپنی جگہ مگر پالے کی محبت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اماں بتاتی ہیں ممانی کی زندگی میں بھی اماں ہی تمہیں گود میں رکھتی تھیں۔ انہیں سے تم ہلے ہوئے تھے۔ ان کی لوری کے بغیر تم سوتے بھی کہاں تھے۔ چھم چھم کرتی آئی ری چڑیا، میرے ننھے کا منگن لائی ری چڑیا۔ اماں نے کس چاؤ سے یہ لوری سنائی جیسے سچ مچ تمہیں سلا رہی ہیں۔ پھر منہ پہ آنچل رکھ کے رونے لگیں۔ میری بھی آنکھ بھر آئی۔ خیر--------

تو منّن، ایک پھیرا لگا جاؤ۔ اماں کی حسرت پوری ہو جائے گی۔ ہمارا بھی مان رہ جائے گا۔ ہے نا۔ خوب مزہ رہے گا۔ ہئی۔ آرہے ہو نا؟

اچھا لو اللہ نگہبان۔

راقمہ

میمونہ

اور اس کے ساتھ ہی تیسری چٹھی برآمد ہوگئی۔ تاریخ اصل میں اس چٹھی میں درج تھی۔

برادر خورد جواد میاں

دور افتادوں کی دعا لو اور یہ خبر اندوہ اثر سنو کہ ہماری تمہاری اچھی پھوپھی اماں کل بروز جمعہ بوقت صبح صادق بتاریخ ۱۲/ ذی الحجہ اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو

سدھار گئیں۔ میاں جانی کے بعد ان کا سایہ ہم سب کے لئے غنیمت تھا۔ وہ سایہ اٹھ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ○ خیر موت برحق ہے۔ مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ بندے کا مقدور بس اس قدر ہے کہ رخصت ہونے والے کے لئے دعائے مغفرت کرے اور صبر کی سل سینہ پہ دھر لے۔

ہماری پھوپھی اماں ایک داغ سینہ پہ رکھ کر لے گئیں کہ پاکستان جانے والے اقارب کی دید نہ کر سکیں۔ تمہیں تو انہوں نے آخری دنوں میں خط بھی لکھا تھا۔ آخری وقت پر بار بار دروازے کی طرف دیکھتی تھیں۔ تم نہ آئے تو ضرور کوئی مجبوری ہو گی۔

چونکہ اگلا مہینہ محرم الحرام کا ہے اس لئے طے پایا ہے کہ رسم چہلم اسی مہینے میں کر لی جائے۔ چنانچہ ۲۷/ ذی الحجہ کی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔

تمہاری خیریت کا طالب

عاصی پر معاصی چھوٹے میاں

اب مجھے یاد آیا کہ یہ ان دنوں کے خط ہیں جب عشرت سے میرا عشق چل رہا تھا۔ اس وقت تو مجھے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ عشق کا جنون سوار تھا۔ اٹھتے بیٹھتے عشرت کا خیال۔ کوئی دوسرا خیال آتا ہی نہیں تھا۔ ایسے عالم میں یہ خط ایک ایک کر کے موصول ہوئے۔ ان کا دل پہ کوئی اثر ہوا ہوتا تو جواب دیتا۔ اب جو احساس ہوا کہ پھوپھی اماں نے کس محبت سے خط لکھا تھا اور پھر میمونہ نے کتنے مان سے کتنے محبت بھرے لفظوں میں پھیرا لگانے کی تاکید کی تھی تو میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ پہ ملامت کی۔ میں اس وقت اتنا بے حس، اتنا پتھر دل ہو گیا تھا۔ اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ بار بار خیال آتا کہ پھوپھی اماں نے جواب نہ ملنے پر کیا سوچا ہو گا، کتنی انہیں اذیت ہوئی ہو گی۔ اور میمونہ، اسے کتنا ملال ہوا ہو گا۔ پھوپھی اماں تو اب منوں مٹی کے نیچے سوئی پڑی ہیں۔ ان کی بلا سے، میں پشیمان ہوں یا نہیں ہوں۔ مگر میمونہ۔ اور میرے اندر ایک لہر اٹھی کہ فوراً ویزے کی تدبیر کرو اور وہاں جا کے میمونہ سے معافی مانگو۔

"صاحب مجو میاں تو ابھی تک نہیں آئے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" نعمت خاں کہہ رہا تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے آیا یا میں خیالوں میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اس کے کمرے

میں داخل ہونے کا مجھے پتہ ہی نہ چلا۔

"ارے ہاں نعمت خاں، میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ مجو میاں تو آج نہیں آئیں گے۔ روٹیاں تو ابھی نہیں پکائی ہیں۔"

"نہیں۔ اب پکانے لگا ہوں۔ مگر مجو میاں کیوں نہیں آئیں گے۔"

"ادھر وہ میرٹھ والوں کی طرف گئے تھے۔ وہاں آج کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ان کے جاتے ہی کرفیو لگ گیا۔ کیسے آ سکتے ہیں۔"

"صاحب جی، حالات بہت خراب ہیں۔"

"ہاں حالات خراب ہیں۔"

"جی اللہ رحم ہی کرے۔" نعمت خاں بڑبڑایا۔

پھر بولا "پھر آپ کھانا کھالیں۔ روٹی پکانے لگا ہوں۔"

"ابھی ذرا ٹھہر جاؤ۔"

نعمت خان پر اس جواب کا اثر خوشگوار نہیں ہوا۔ خاموشی سے واپس چلا گیا۔

میں پھر اسی خیال میں گم تھا۔ پہلی بار مجھے اپنے عشق پر غصہ آیا۔ عشق اپنی جگہ۔ مگر آدمی کو اتنا باولا تو نہیں بننا چاہئے کہ باقی رشتوں کا کوئی احساس ہی نہ رہے۔ اور پھوپھی اماں تو میری پھوپھی کم اور ماں زیادہ تھیں۔ میمونہ نے ٹھیک کہا۔ امی کے ہوتے ہوئے بھی میں پھوپھی اماں ہی سے چپکا رہتا تھا۔ ان کی آنکھ بند ہونے کے بعد تو پھر پھوپھی اماں پھوپھی اماں بھی تھیں اور ماں بھی تھیں۔ پھوپھی اماں نے کیا سوچا ہو گا۔ اور میمونہ کیا سوچتی ہو گی۔ پھر اندر وہی لہر اٹھی۔ وہاں جانا چاہئے اور جاکر۔۔۔۔۔۔ مگر اس وقت نہیں گئے تو اب جا کر کیا لو گے۔ میں نے جب تصور کیا کہ میمونہ مجھے کن نظروں سے دیکھے گی اور چھوٹے میاں کس سرد مہری سے پیش آئیں گے تو دل بیٹھ گیا اور جانے کا جذبہ سرد پڑ گیا۔ مگر خیالوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ پشیمانی کا جیسے دورہ پڑ گیا ہو۔ لہر دب کر پھر ابھر آئی۔ مجھے جانا چاہئے۔ ایک جھرجھری سی آئی۔ ضرور جانا چاہئے۔ اس طرح شاید چند دنوں کے لئے تنہائی کا مداوا بھی ہو جائے۔ شاید پھر تازہ دم ہو جاؤں۔ مگر۔۔۔۔۔۔ اور پھر مجھے میمونہ کی متوقع سرد مہری اور چھوٹے میاں کے زہر بھرے فقروں اور بڑی بھابی کے طعنوں کا خیال آیا اور پھر جیسے مجھ پہ اوس سی پڑ گئی ہو۔ پھر بھی، میں نے اپنی ہمت بندھاتے ہوئے سوچا۔

(6)

ان تین خطوں نے میرے ساتھ عجب کیا۔ وہ جو میرے اندر ایک پتھری سی بن گئی تھی اور پھیلتی چلی جا رہی تھی وہ جیسے پگھل رہی ہو اور حافظہ واپس آ رہا ہو۔ سچی بات ہے مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ جیسے حافظہ کی جگہ طاق نسیاں نے لے لی ہو۔ اب نقشہ ہی اور تھا۔ جیسے یادوں کا قافلہ طاق نسیاں کو توڑ کر نکل پڑا ہو اور حافظہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ کتنی دفعہ گمان ہوا کہ مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے، مگر جب یاد کرنے بیٹھا تو ان دنوں کی زندگی کے کچھ انمل بے جوڑ ٹکڑے حافظہ میں ابھرے اور وہ بھی دھندلے دھندلے۔ یادوں کا ایک سیلاب تھا کہ اندر امنڈ رہا تھا پیچ و تاب کھا رہا تھا، مگر ابھی بہہ نکلنے کی راہ نہیں مل رہی تھی۔ سارا وجود جنبش میں تھا۔ اور پھر وہی دبدا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ جانے میں وہی اندیشہ کہ کہیں سرد مہری سے سابقہ نہ پڑے۔ پھوپھی اماں اب تھوڑا ہی ہیں کہ ساری باتوں کو بھول کر بے اختیار گلے سے لگا لیں۔ میں انہیں بھول سکتا ہوں تو ان کے لئے بھی مجھے یاد رکھنا کیا ضرور ہے۔ اور میمونہ۔ وہ بیشک نہ بھولی ہو مگر معاف کیسے کرے گی۔ اصل میں میمونہ کی سرد مہری کا تصور ہی مجھے جانے کے خیال سے زیادہ روک رہا تھا اور پریشان کر رہا تھا۔ ایک دفعہ یہ بھی خیال آیا کہ وہ اب وہاں کہاں بیٹھی ہو گی۔ اب تک بڑی بھابی کے کولھے سے لگی بیٹھی ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ غرض سو طرح کے خیال اور اندیشے ستا رہے تھے۔ اور پھر جانے کے خیال سے اب باز بھی نہیں آ سکتا تھا۔ ایک خواہش اچانک بیدار ہو گئی تھی۔

اسے سلانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ واپس آتی ہوئی یادیں اس خواہش کو غذا فراہم کر رہی تھیں۔ پھر اچانک ہی مجھے ایک اور خیال آیا۔ کہیں یہ سب عمر کا چکر تو نہیں ہے۔ اس خیال نے مجھے بہت اداس کیا۔

"یار ان دنوں تم زیادہ ہی کھوئے ہوئے دکھائی دے رہے ہو۔" مجو بھائی نے کہا۔ مجو بھائی نے میرے دل کا چور بہت جلدی پکڑ لیا میں نے ہاں ہوں کر کے ٹالنا چاہا۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ اب مجھ سے بھی ضبط نہیں ہو رہا تھا۔

"مجو بھائی" دیر بعد میں نے بات کرنے کے لئے زبان کھولی۔ "میں سوچتا ہوں------"

"کیا۔" مجو بھائی نے غور سے مجھے دیکھا سوالیہ نظروں کے ساتھ "کیا سوچتے ہو بھائی؟"

"میں سوچتا ہوں کہ میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

مجو بھائی نے قہقہہ لگایا۔ "تمہیں کیسے یہ عرفان ہوا؟"

"مجھے بھولی بسری باتیں یاد آنے لگی ہیں۔ بھولے بسرے دن، بھولے بسرے لوگ۔"

"اچھا۔ اماں یہ کب سے۔"

"اس رات جب آپ توصیف کی طرف رک گئے تھے۔ تو پتہ ہے میرے ساتھ کیا ہوا۔"

"کیا؟"

"آپ کو تو ادھر مشاعرے اور کرفیو نے پکڑ لیا۔ میں نے سوچا کہ چلو آج وقت ملا ہے نئی کتاب جو ہاتھ پڑی ہے اسے پڑھ ڈالیں۔ کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا کہ کاغذوں میں سے کچھ خط نکل آئے۔ یہ خط میرے دھیان ہی میں نہیں تھے۔ کب آئے تھے۔ میں نے ان کا جواب دیا تھا نہیں دیا تھا۔"

"خط۔ اچھا؟ کس کے؟"

"ایک ہماری پھوپھی اماں کا خط تھا۔ لگتا ہے کہ آخری دنوں میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد کا جو خط ہے وہ ان کی بیماری کے بارے میں ہے۔ تیسرے میں انتقال کی

اطلاع ہے۔"

"کب آئے تھے یہ خط؟"

"یہی تو یاد نہیں آرہا۔ اور کمال ہے کہ پہلے دونوں میں سے کسی خط پہ تاریخ درج نہیں ہے۔"

"بھلے آدمی، تمہیں اپنی پھوپھی اماں کے مرنے جینے کی خبر نہیں۔"

"یہی احساس تو مجھے کھائے جا رہا ہے۔" چپ ہوا، سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر بولا۔ بس اس وقت سے جیسے یادوں کا تانتا لگ گیا ہو۔ کب کب کی باتیں یاد آرہی ہیں۔ مگر پھر کوئی بات پوری طرح یاد بھی نہیں آتی۔ جیسے حافظہ یادوں کو سمیٹنے سے عاری ہو۔ بس یوں سمجھو کہ میں حافظہ اور فراموشی کے درمیان لٹکا ہوا ہوں۔ یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال ہے۔"

"اس کا ایک ہی علاج ہے۔"

"کیا؟"

"شادی کرلو۔"

"مجو بھائی، میں نے آپ سے اپنی تکلیف بیان کی ہے۔ آپ حسب معمولی دلگی پہ اتر آئے۔ کبھی تو کسی کی بات سنجیدگی سے سن لیا کرو۔"

"میں سنجیدہ ہوں اور تمہارے سارے احوال کو جانتا ہوں۔ اس کے بعد یہ بات میں نے کہی ہے۔ پیارے، شادی کرلو۔"

"میری عمر دیکھ رہے ہو۔"

"کیوں، تمہاری عمر کو کیا ہوا، ابے چو نگھٹ، یہی عمر تو شادی کرنے کی ہے۔ جس عمر میں تم نے شادی کی تھی وہ عمر کوئی شادی کرنے کی تھی۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا یا نہیں کیا تھا۔"

"کیا تھا۔"

"اس وقت تم نے میری بات نہیں مانی۔ پھر پچھتائے۔ اب نہیں مانو گے، پھر پچھتاؤ گے۔ میاں، جوانی میں تنہائی کچھ نہیں کہتی۔ اس نے اب عمر کے ڈھلنے کے ساتھ کاٹنا شروع کیا ہے۔ اور ابھی تو آغاز ہے۔ آگے آگے دیکھنا۔ سو میرا مشورہ مان لو۔

عافیت اسی میں ہے۔"

"اپنے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔"

"اپنے بارے میں۔" مجو بھائی نے زبردست قہقہہ لگایا "استاد، میں نے تو شروع ہی میں یہ بات دماغ سے نکال دی تھی۔ یہ غم پالنے کی کبھی سوچی ہی نہیں۔ سو میں عافیت میں ہوں۔ تنہائی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اور تم میرے شغل اشغال دیکھتے ہو۔ مگر جو شخص ایک دفعہ ازدواجی زندگی کا مزہ چکھ چکا ہو اور سوئے اتفاق سے ایک عدد اولاد کا بھی باپ ہو، اسے تنہائی بہت دکھ دیتی ہے۔ ارے نیک بخت بیٹے ہی کو اپنے ساتھ رکھا ہوتا۔ اس وقت اس کی شادی کر دی ہوتی۔ اس کے اولاد ہوتی۔ پوتے پوتیوں میں تنہائی آئی گئی ہو جاتی۔ ہاں کیا حال ہے ارشاد کا۔ کوئی خط وط آیا۔ واپس آنے کی نیت ہے یا نہیں ہے۔"

"یہاں آکر ان حالات میں وہ کیا کرے گا۔ ادھر خوش ہے۔ میں بھی اس سے واپس آنے کی بات نہیں کرتا۔"

"اور شادی؟ اس بارے میں کیا کہتا ہے۔"

"اس بارے میں فی الحال نہ اسے کوئی پریشانی ہے اور نہ مجھے۔"

مجو بھائی ہنسے۔ بولے "آج پریشانی نہیں ہے۔ مگر کل یہ پریشانی پیدا ہو سکتی ہے۔ کل کلاں کو اس نے کسی میم سے شادی رچالی تو پھر کیا کرو گے۔ ویسے اگر اسے وہیں رہنا ہے تو اس کے لئے کسی گرین کارڈ والی کا بندوبست کیا جائے۔ کراچی میں ایسی آسامیاں موجود ہیں۔ میری نظر میں ہیں۔ کہو تو کہیں ڈول ڈالوں۔"

"دیکھا جائے گا۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔"

نعمت چائے بنا کر لے آیا تھا۔ مجو بھائی کے لئے بنائی۔ پھر اپنے لئے ایک گھونٹ کے ساتھ میں کیسی سی کیس نکل گیا۔ ادھر مجو بھائی نے بھی اپنا سگریٹ سلگا لیا تھا۔

"مجو بھائی" چائے پیتے پیتے مجھے عجیب سا خیال آیا۔ "یہ جو تمہارے لوگ ہیں۔ تمہارے ساتھ میں بھی اب ان سے مل جل رہا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں۔ پہلے تو نہ مجھے ان سے ملنے کی کبھی تمنا ہوئی تھی نہ تم نے مجھے اس راہ پر لگانے کی کوشش کی تھی۔ اب جو تم مجھے لئے لئے پھرتے ہو تو اس میں کوئی حکمت ہوگی۔ خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ

لوگ ------ " جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے۔

"وہی بات کہو گے کہ یہ ویسے نظر نہیں آتے۔ یار باتوں کو دھرایا مت کرو۔ اس سے مجھے لگتا ہے کہ تم واقعی بوڑھے ہو گئے ہو۔"

"شاید دھرا ہی رہا ہوں۔ یار مجھے لگتا ہے کہ جیسے ان میں کوئی چیز کم ہو گئی ہو۔"

مجو بھائی ہنسے "کوئی چیز کی بات کرتے ہو۔ استاد، یہ تو پورے کے پورے کم ہو گئے ہیں۔ ان کی تو کایا کلپ ہو چکی ہے۔ اب یہ خالص کراچی والے ہیں۔"

"اور یہ جو ہمارا لکھنؤ، ہماری دلی کرتے رہتے ہیں۔"

"سب فراڈ۔ مگر خیر انہیں معاف کر دو۔ یہ فراڈ ان کی مجبوری ہے۔"

"مجبوری کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ کراچی میں رہنے کے لئے آدمی کو کوئی نہ کوئی فراڈ کرنا پڑتا ہے۔"

"پھر تو بڑی مشکل ہے۔ آدمی ان سے بچ کر کہاں جائے۔"

"بھئی تمہارے لئے کیا مشکل ہے۔ تم پہلے بھی خفقانی تھے۔ آدمیوں سے بھاگتے تھے۔ اب تم نے ایک نیا طوطا پال لیا۔" مجو بھائی رکے۔ پھر بولے "میاں جواد، میں تمہیں دیکھ کے بہت حیران ہوتا ہوں تم کیا شئے ہو۔ اب تم نے یادوں کا جھمیلا اپنے ساتھ لگا لیا۔ آخر کیوں؟

میں ہنس دیا۔ "مجو بھائی، میری بھی تو مجبوری ہے۔ کراچی میں رہنے کے لئے مجھے بھی تو کسی فراڈ کی ضرورت تھی۔"

مجو بھائی نے قہقہہ لگایا۔ "یار آج تم نے مجھے لاجواب کر دیا۔ مان گئے۔"

"مگر ایک بڑی مشکل ہے۔"

"کیا؟"

"پہلے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ مجھے بہت کچھ یاد ہے۔ جب یاد کرنے کے لئے بیٹھتا ہوں تو یادیں جیسے حافظہ سے پھسلتی چلی جا رہی ہوں۔ یا شاید میرا وہم ہوتا ہے کہ مجھے اتنا کچھ یاد ہے۔" یہ کہتے کہتے میں افسردہ ہوا۔ "سچی بات ہے اب مجھے کچھ یاد بھی نہیں ہے۔ میں خالی ہوں ------ بالکل خالی۔"

"یار تم نے ایک لاکھ روپے کی بات کہہ دی تھی، مگر پھر اپنی فضولیات پہ اتر آئے۔ چلو اٹھو تمہیں کہیں اچھی سی چائے پلواتے ہیں۔"

"اچھی سی چائے، وہ کہاں پلواؤ گے۔"

"اب یہ تم پر موقف ہے کہ تم کونسے برانڈ والی چائے پینا چاہتے ہو۔ لکھنؤ والی، دلی والی، میرٹھ والی۔ ہر ایک کا اپنا ذائقہ ہے۔"

"ان میں سے تو کوئی بھی منظور نہیں ہے۔ اگر چلنا ہی ہے تو وہ جو تمہارے شکارپور والے ہیں ان کی طرف چلیں۔"

"اچھا اچھا" مجو بھائی ہنسے "کہاں جا کر تمہارا پانی مرا ہے۔ ارے یار وہ شکارپوریئے ہیں۔ ویسے میں نے اسی وقت بھانپ لیا تھا کہ چچا کربلائی تمہیں ہٹ کر گئے ہیں۔"

"مجو بھائی، یہ جو آپ کا دلی لکھنؤ میرٹھ امروہے کا کراؤڈ ہے ان کے مقابلہ میں تو شکارپوریئے کربلائی صاحب ہی غنیمت ہیں۔ ان میں سچائی کی ایک رمق نظر آتی ہے۔"

"بس تھوڑے سال گزر جانے دو۔ تم بھی بالکل چچا کربلائی بن جاؤ گے۔ استاد اسی طرف جا رہے ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"چلو خیر کوئی بات نہیں۔ جو تمہاری مرضی وہ ہماری مرضی۔"

اور وہاں پہنچ کر مجو بھائی نے پہلی بات یہی کہی "چچا، یہ ہمارے دوست جواد آپ کے بہت گرویدہ ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا چلو تمہیں ان سے ملا کر لاتا ہوں۔"

کربلائی صاحب بہت خوش ہوئے۔ بولے "میاں، ہم سے مل کر کوئی کیا لے گا۔ تھوڑی ٹوٹی پھوٹی یادیں لئے بیٹھے ہیں۔ چراغ سحری ہیں۔ جب تک قضا کے فرشتے کو دھیان نہیں آتا ٹمٹما رہے ہیں۔ جس روز اس نے ایک پھونک مار دی بس پھر چراغ کو بجھا سمجھو۔" پھر فوراً ہی لہجہ بدلا۔ "اچھا تو تم جواد حسن ہو۔"

"جی۔"

"تم اس روز بتا رہے تھے کہ میرٹھ کے ہو۔"

"ہاں میرٹھ سے تعلق رہا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔ میاں میں نے میرٹھ دیکھا ہے۔ سرکاری نوکری میں یہی فائدہ ہے۔ تبادلے ہوتے رہتے ہیں۔ آدمی مختلف شہر دیکھ لیتا ہے۔ تو میرا میرٹھ کے گورنمنٹ ہائی سکول میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ وہاں میں نے تین سال پڑھایا ہے۔ میاں وہ جو بھلا سا تھیٹر تھا قتل تمیزن، وہ تم نے دیکھا تھا۔"

"شہرت سنی تھی۔ دیکھا نہیں۔"

"ظاہر ہے کہ تم نے تمیزن کو بھی نہیں دیکھا ہو گا۔"

"جی نہیں۔"

"میاں پھر تم نے میرٹھ میں کیا دیکھا۔ تمیزن بہت بانکی عورت تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ چھپن چھری تو وہ تھی۔ خود بعد میں قتل ہوئی۔ پہلے اس نے بہتوں کو قتل کیا۔ میاں میں نے وہ کوٹھا اپنی آنکھ سے دیکھا جہاں وہ قتل ہوئی تھی۔ اوپر نہیں گیا۔"

"چچا اگر اوپر بھی چلے گئے تو کیا ہو گیا۔"

"نا بھائی نا۔ ہم نے اپنے ایمان میں کبھی خلل نہیں آنے دیا۔ بس گزرتے گزرتے ایک دوست نے بتایا کہ یہ جو سامنے کوٹھا نظر آ رہا ہے یہاں رہا کرتی تھی تمیزن۔ البتہ بوم ہاپوڑی کو میں نے خوب دیکھا ہے۔ لاریوں کے اڈے پہ کھڑے اپنا کلام کس مزے سے آواز لگا کر بیچتے تھے۔ بوم کا نیا کلام چار آنے میں چماری نامہ دو آنے میں۔ اور کچھ نہیں تو بھلے آدمی نے چماری نامہ ہی لکھ ڈالا۔ بھئی اگر تحصیلدار کا چماری پہ دل آگیا تھا تو تمہیں کیا۔ یہ قصے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ میم ہو یا چماری، عورت تو عورت ہوتی ہے۔ ویسے میاں جو اودھم تمہارے میرٹھ کی نوچندی کا جواب نہیں تھا۔"

"ہاں نوچندی میں بہت رونق ہوتی تھی۔"

"میاں رونق سی رونق۔ علی گڑھ کی نمائش کا تو نام ہی نام تھا۔ بلکہ وہاں کے ایک شاعر نے یہ ڈینگ بھی ہانکی تھی کہ ------ کیا وہ شعر تھا ------ ہاں

سجاوٹ میں بناوٹ میں لگاوٹ میں دکھاوٹ میں
علی گڑھ کی نمائش ہند بھر میں سب سے بہتر ہے

بالکل غلط۔ اس نمائش میں پشاوری پراٹھے کباب اور کالے برقعوں کے سوا اور کیا تھا۔ بلند شہر کی نمائش میں یہ بھی نہیں تھا۔ مگر میرٹھ کی نوچندی۔ وہاں کیا نہیں تھا، سبحان اللہ، ایک پھیرا لگا لو تو آنکھوں میں نور دل میں سرور۔ "ایسے بڑبڑا رہے تھے جیسے سچ مچ نوچندی میں گھوم رہے ہیں۔ رکے۔ پھر بولے "میاں جواد حسن، رونق اپنے شکارپور میں بھی کم نہیں تھی۔ پینٹھ وہاں کیا لگتی تھی کہ آس پاس کے گانوؤں سے ایک خلقت ڈھلتی تھی۔ اور محرم میں، ان دنوں تو رونق ہی اور طرح کی ہوتی تھی۔ میاں جھوٹ مت جاننا، امام کی سواری آتی تھی۔ ان دس دنوں میں وہیں قیام رہتا تھا۔ لو اس پہ یاد آیا۔ رات میں نے خواب دیکھا جیسے میں----------

"پھر کوئی خواب دیکھ لیا۔" سیدانی چچی نے بیچ میں ٹوک دیا۔ وہ بھی اس گفتگو بیچ اپنے کام سے فارغ ہو آن موجود ہوئی تھیں اور پاندان کھول لیا تھا۔ کربلائی صاحب کی روانی میں کھنڈت ڈال دی۔ غصے سے بولیں "پھر وہی تختہ لوٹا شکارپور خواب میں آگیا ہوگا۔ اے مجو بھیا، انہیں سمجھاؤ۔ کب تک اس نحوست مارے شہر کی مالا جپیں گے۔"

ایک دریا بہہ رہا تھا کہ رک گیا۔ چچا کربلائی نے کس معصومیت اور بیچارگی سے سیدانی چچی کو دیکھا اور چپ ہو گئے۔ اب سیدانی چچی کے بولنے کی باری تھی۔ ان کی اپنی دلچسپیاں تھیں چھوٹتے ہی سوال داغا "اے مجو بھائی، اس ڈوبے رشتے کا کیا بنا۔ لکھنؤ والوں نے جواب دے دیا یا ابھی بات چل رہی ہے۔"

"بس لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے دونوں کو سمجھایا تو ہے۔ دونوں کو کیا اصل میں تو لکھنؤ والے ہتھے سے اکھڑے ہوئے تھے۔ انہیں راہ پہ لاتا تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ آپ لوگ ہوش کی دوا لیں۔ ایسا اچھا لڑکا آپ کو کہاں ملے گا۔ اور جنہوں نے آپ کو بھڑکایا ہے وہ خود اس مار میں ہیں کہ ادھر سے رشتہ ٹوٹے تو وہ اپنی بیٹی کے لئے اسے اچک لیں۔"

"اے سچ کہو ہو۔"

"سچ۔ اصل قصہ تو یہی ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ جہاں کسی لڑکی کی بات چلی لوگ کس طرح اس میں بھانجی مارتے ہیں۔"

"لوگوں کی کیا پوچھو ہو۔ کان میں ان کے بھنک پڑ جائے بس پھر ٹوہ میں لگ جاتے ہیں۔ پشتوں پہلے کی ایسی ایسی بات نکال کے لاتے ہیں کہ رشتہ نہ ٹوٹتا ہو تو ٹوٹ جاوے۔"

"یہی تو میں نے سمجھایا۔ میں نے کہا کہ جن لوگوں نے ان کے سید نہ ہونے کا شوشہ چھوڑ دیا وہ کون لوگ ہیں۔ آخر ہمیں بھی تو کچھ ان کے متعلق اتا پتہ ہے۔ رہی شجرۂ نسب کی بات، تو یہ تو سوچو کہ جس قیامت میں ہم لوگ اپنے گھروں سے نکلے ہیں اس میں شجرۂ نسب کا کسے ہوش تھا۔ جان بچا کر لے آئے، یہ کم کمال کی بات ہے۔"

"پھر کیا بولیں۔"

"اس وقت ان کا خدا سیدھا تھا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ بس میری کوشش یہ ہے کہ جلدی سے نکاح ہو جائے۔"

"یہی میں کہوں ہوں کہ اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ ذرا ڈھیل ڈالو، پھر سو طرح کی باتیں نکلتی چلی آتی ہیں۔ میں نے تو یہی سوچا ہے کہ جس روز اچھا رشتہ مل گیا بس اس روز کھڑے کھڑے نکاح کے دو بول پڑھوا کے رخصت کر دوں گی۔"

"وہ جو سری والوں کے یہاں بات چل رہی تھی اس کا کیا ہوا۔"

"اے بھیا وہ تو چیونٹیوں بھرا کباب تھا۔ چھ بہنیں، تین بھیئے، اور ان کی اولاد، چینگا پونی۔ اور پھر نوکری بھی خشک پروفیسری۔ اماں جان کہنے لگیں کہ میرا پوت کتابیں لکھتا ہے۔ اے میں نے کہا کہ بیاہ کوئی کتابوں سے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ آج کل تو چھوٹی چھوٹی نوکریوں والے اتنا کما رہے ہیں کہ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔"

"ہاں کمانے کی مدیں آج کل بہت نکل آئی ہیں۔"

"بھیا، ایک تو میں یہ سنتے سنتے تھک گئی کہ لڑکا ایم اے ہے۔ ارے ایم اے، بی اے کو کیا کریں۔ کمانے کھٹانے والا بھی تو ہو۔ اب اللہ رکھے ہمارا بھانج داماد ہے۔ انٹرنس پاس کیا تھا۔ ماں باپ نے اسے پولیس میں کانسٹیبل بھرتی کرا دیا تھا۔ تھا سمجھدار، افسروں کی ایسی خدمت کی کہ انہوں نے اسے تھانیدار لگا دیا۔ اس نے مکان ایسا بنایا ہے کہ پورا محل ہے۔ ڈیوڑھی میں دو دو موٹریں کھڑی ہیں۔ اس کے نام جو پلاٹ ہیں وہ الگ ہیں۔ بس میں تو کوئی ایسا ہی چاہوں ہوں۔ تمہاری نظر میں کوئی ایسا نہیں ہے۔"

"چچی، کیا بتاؤں، جو نوجوان میری نظر میں ہیں کمبخت سب پڑھے لکھے ہیں۔ اور پڑھے چلے جا رہے ہیں۔ تھمنے ہی میں نہیں آتے۔ جسے دیکھو ریسرچ کے خبط میں مبتلا ہے۔ لکھنؤ والوں کے جو صاحبزادے ہیں ان سے تو میں نے کہہ دیا کہ صاحبزادے، اگر سب نوجوان تمہاری طرح افلاطون بن جائیں تو پاکستان کا کام کیسے چلے گا۔ کہنے لگا کہ مجو بھائی، پاکستان کو تو ویسے بھی پڑھے لکھے آدمی کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ میں تو بس اپنی لگن میں پڑھ رہا ہوں۔"

"اب مجو بھیا تم ہی بتاؤ، ایسے خبطیوں کو اپنی بیٹی کون دے۔ آنکھوں دیکھتے تو اپنی جنی کو جہنم میں نہیں دھکیلا جاتا۔"

اندر ہی اندر میں کتنا بے چین ہو رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ خواہش تو یہی تھی کہ سیدانی چچی خاموش ہو جائیں اور چچا کربلائی پھر شروع ہو جائیں وہیں سے جہاں سے ان کی بات کاٹی گئی تھی۔ بات ان کی کاٹی بھی کہاں گئی عین اس مقام پر جب وہ اپنا نیا خواب بیان کرنے لگے تھے۔ پتہ نہیں وہ کیا خواب تھا۔ سیدانی چچی بولے چلی جا رہی تھیں اور خواب کے متعلق میرا تجسس بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ تو جب سیدانی چچی نے تھوڑا دم لیا اور پاندان کی طرف توجہ کی تو میں نے اس وقفہ کو غنیمت جانا اور گیند چچا کربلائی کی طرف لڑھکا دی۔ "قبلہ، آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟"

"ہاں چچا آپ بھی تو کچھ بولیں۔" شاید مجو بھائی بھی سیدانی چچی کے خیالات سے سیر ہو چکے تھے اور اب منہ کا مزہ بدلنا چاہتے تھے "آپ کچھ بول ہی نہیں رہے۔"

"ارے بھائی، ہم کیا بولیں۔" اور پھر چپ، جیسے خواب بیان کرنے کی جو انہوں نے ہمی باندھی تھی اس میں کھنڈت پڑ جانے کے بعد سے ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اور کیا بات کی جائے۔ ادھر وہ یہ توقع لئے بیٹھا تھا کہ چچا کربلائی موقع پا کر پھر اپنا خواب بیان کریں گے۔ اس کی توقع سیدانی چچی کے یہاں اندیشہ بن کر ابھری۔ انہوں نے خطرے کو بھانپ کر پھر ٹوک دیا۔ "ہاں وہ کیا بولیں گے۔ یہی تو رونا ہے کہ گھر میں کچھ ہوتا رہے وہ کچھ بولتے ہی نہیں۔ گھر سے دلچسپی ہو تو کچھ دیکھیں، کچھ سوچیں، کچھ بولیں۔ ہر پھر کے وہی خواب کا قصہ اور ہر خواب میں اسی نحوست مارے شکارپور کی رام کہانی۔"

"چچا ایک بات میں بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔" مجو بھائی نے ٹکڑا لگایا "یہ آپ کے خواب کا لینڈ سکیپ کیوں نہیں بدلتا۔ ارے نہ سہی کراچی، مگر آپ تو کربلا بھی جا چکے ہیں۔ وہ لینڈ سکیپ میرا مطلب۔ یہ ہے کہ کربلا کو آپ کبھی خواب میں نہیں دیکھتے۔"

"میاں وہ تو آخری خواب ہوگا۔" اور یہ کہتے کہتے چچا کربلائی میری طرف متوجہ ہوئے "میاں جواد حسن، تم کربلا گئے ہو۔"

"جی نہیں۔ ابھی تک تو یہ شرف حاصل ہوا نہیں ہے۔"

"اچھا؟ یہ تو افسوس کی بات ہے۔ آدمی کو ایک مرتبہ کربلا ضرور جانا چاہئے۔ بس ایک ہی پھیرے میں آدمی کے سارے دلدر دور ہو جاتے ہیں۔" رکے۔ پھر سوچ کر بولے "میاں، ہم سے ایک چوک ہوگئی۔ اب پچھتاتے ہیں۔ بہت بڑی چوک ہوئی۔"

"چوک۔ چچا آپ سے کیا چوک ہوئی۔" مجو بھائی بولے۔

"کیا پوچھتے ہو مجو میاں، اب یہ دیکھو کہ کربلا تو کوئی قسمت والا ہی پہنچتا ہے۔ جسے مولا یاد کریں گے وہی پہنچے گا۔ تو میرا بلاوا آیا میں پہنچ گیا۔ مگر میں واپس کیوں آیا۔ اب پچھتاتا ہوں۔ بہت بڑی غلطی ہوگئی۔" ٹھنڈا سانس بھرا "زندگی میں ٹھوکریں لکھی تھیں۔ مرتے گرتے یہاں آئے۔ کراچی میں خراب ہو رہے ہیں۔ اولاد امریکہ میں، ہم کراچی میں، دل شکارپور میں، روح کربلا میں۔ بس دبدا میں ہوں۔ مجو میاں۔"

"جی۔"

"سچ سچ بتاؤں میں واقعی دبدا میں ہوں۔ بس شکارپور اور کربلا کے درمیان لٹکا ہوا ہوں۔ مٹی اپنی طرف کھینچتی ہے، ایمان اپنی طرف۔ روح کہتی ہے کہ اس اجڑی بستی میں کیا رکھا ہے، ادھر تو جنت کی کھڑکی کھلی ہے۔ تو ایک طرف مٹی، دوسری طرف جنت کی کھڑکی، سخت مشکل میں ہوں۔" کربلائی صاحب چپ ہو گئے۔ اور ایسے چپ ہوئے کہ پھر سیدانی چچی ہی بولتی رہیں، وہ نہیں بولے۔ پتہ نہیں اپنے خیالوں میں غلطاں وہ کس سفر پہ نکل گئے، کربلا کے سفر پہ یا شکارپور کے سفر پہ۔

اسی رات میں نے باتوں باتوں میں مجو بھائی سے دل کی بات کہہ دی۔ "مجو بھائی، سوچ رہا ہوں کہ ادھر کا ایک پھیرا لگا آؤں۔"

"اچھا؟" مجو بھائی نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ "اتنے زمانے بعد پھیرا لگانے کا

خیال آیا ہے۔ ہو گیا نا کربلائی صاحب کا اثر تم پہ۔"

"کربلائی صاحب کا یہ اثر نہیں ہے۔ اصل میں ان خطوں نے میرے اندر ایک احساس جرم پیدا کر دیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

آگے مجھ سے کہا نہیں گیا۔ مجو بھائی نے فقرہ پورا کرنے کے لئے زیادہ وقت بھی نہیں دیا۔ بولے "یار، تمہارا معذرتی لہجہ کیوں ہے۔ اس میں ایسی بری بات کیا ہے۔ عزیزوں سے ملنے جا رہے ہو۔ ضرور جاؤ۔" رکے۔ پھر بولے کچھ بڑبڑاتے ہوئے "زمین بڑی کمبخت چیز ہے۔ جب تک اسکا خیال نہ آئے اس وقت تک خیریت ہے۔ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ عمریں گزار دیتے ہیں۔ اس کے خیال کو قریب پھٹکنے ہی نہیں دیتے۔ لیکن اگر ایک مرتبہ اس کا خیال آ جائے تو بس پھر وہ پکڑ لیتی ہے۔"

"آپ کو ادھر کا کبھی خیال نہیں آیا۔ ادھر کوئی عزیز قریب، کوئی دوست۔۔۔۔۔۔کوئی۔۔۔۔۔۔"

"کوئی محبوبہ، یہی کہنا چاہتے ہو۔ نہیں۔"

"خوش قسمت آدمی ہو۔"

"یہی سمجھ لو۔ بہرحال میں اس طرح سوچتا ہوں کہ جس طرح اس کوچے سے ہم نکلے تھے اس کے بعد ادھر کا رخ کریں۔ نہیں ہرگز نہیں۔"

"بہت غیرت مند ہو۔" میں ہنس دیا۔

"میں تو اسی طرح سوچتا ہوں۔ ویسے میں تمہیں نہیں روک رہا۔ تم نے جو اپنے اندر بیٹھے بٹھائے ایک احساس جرم پیدا کر لیا ہے اس کا علاج تو یہی ہے۔"

"ابھی تو سوچ رہا ہوں۔ وہاں جانا اتنا آسان تو نہیں ہے۔"

"مشکل کیا ہے؟"

"پہلی مشکل تو ویزا ہی کی ہے۔"

"وہ مجھ پہ چھوڑ دو۔ آگے چلو۔"

میں لاجواب ہو گیا۔ اور مجھے اس وقت احساس ہوا کہ اب میرے لئے اس سفر سے کوئی مفر نہیں ہے۔ میں نہ بھی چاہوں تو مجو بھائی مجھے ادھر دھکیل دیں گے۔

(7)

میں نے اچانک محسوس کیا کہ گاڑی کی رفتار میں فرق آگیا ہے اور سیٹی کی آواز میں ایک اضطراری کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ یوں تو یکسانیت تھی۔ رفتار تیز تھی مگر اس میں عجلت کا عنصر شامل نظر نہیں آتا تھا۔ بس تیز چل رہی تھی اور بیچ بیچ میں سیٹی کی آ... بلند ہوتی جو رات کے سناٹے میں دور تک کی مار کرتی نظر آتی۔ مگر اب یوں محسوس کہ گاڑی عجلت میں ہے اور جلدی سے کسی منزل پر پہنچنا چاہتی ہے۔ ابھی میں اپنی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک مسافر سوتے سوتے چونکا۔ اٹھ کر بیٹھ گھڑی دیکھی اور بولا "ویاس پور آرہا ہے۔" اس کے اس مختصر فقرے نے عجب ا کہ کتنے ہی سناٹے خراٹے لیتے مسافر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ "ویاس پور آگیا؟"

"ہاں بس آنے والا ہے۔"

جو خود نہیں اٹھے انہیں ان کے ساتھ والوں نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ "اٹھو۔ ویا پور آگیا۔"

"ویاس پور آگیا؟" اور اچانک جاگنے والوں نے جلدی جلدی بستر لپیٹنا شرو کر دیا۔

پورے ڈبے میں ایک کھلبلی تھی۔ ویاس پور آگیا' ویاس پور آگیا۔ خود میر۔ اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ تو ویاس پور آگیا۔ تھوڑی دیر پہلے تک یہ سارے مسا

میرے لئے اجنبی تھے۔ رات بھر میں ان سے بے تعلق بیٹھا رہا تھا۔ اور اب اچانک مجھے ان کے ساتھ ایک بھید بھرے رشتے کا احساس ہونے لگا۔ تو ہم سب ویاس پور کے مسافر ہیں۔ مجھے لگا کہ اس ڈبے ہی کے نہیں پوری گاڑی کے مسافر سب مسافر ویاس پور کے مسافر ہیں۔ تب میں نے ایک انس کے ساتھ ان سب مسافروں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ کسی نے سوئچ آن کر دیا تھا اور اب پورے ڈبے میں روشنی تھی۔ ویسے اندھیرا اب باہر بھی پہلے جتنا نہیں تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ آسمان اجلا ہو چلا تھا۔ مخالف سمت میں دوڑتے ہوئے درخت کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک بھوت سے نظر آ رہے تھے۔ اب اجلتے جا رہے تھے۔ پوری فضا جاگتی جا رہی تھی جیسے ساری زمین و آسمان کو پتہ چل گیا ہو کہ ویاس پور آنے والا ہے۔

گاڑی اب ایک نئی طرح سے شور کر رہی تھی۔ پہیوں کی گڑگڑاہٹ نے ایک نیا رنگ پکڑ لیا تھا، جیسے بہت عجلت میں گردش کر رہے ہوں۔ پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے زیادہ سیٹی کی آواز بیتابی کی چغلی کھا رہی تھی۔ ارد گرد کا منظر بھی تیزی سے بدلتا اور تیزی سے اجلا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ویاس پور پہنچنے کی سب ہی کو جلدی تھی اور میں تھا کہ دیکھے جا رہا تھا۔ تیزی سے گزرتے درخت مجھے جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ بس یوں لگ رہا تھا کہ میں ان سب کو پہچانتا ہوں اور ان سب نے مجھے پہچان لیا ہے۔ مسرت اندر سے ابلی پڑ رہی تھی اور درختوں تک پہنچنے کے لئے بیتاب تھی۔ شاید ادھر سے بھی مسرت کا دھارا نکل رہا تھا اور مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ پھر اچانک مجھے ایک خیال آیا اور بس فوراً ہی میں نے قریب کے منظر سے نظریں ہٹا کر دور نظر دوڑائی۔ "دلکشا، پہلے تو چلتی گاڑی سے نظر آ جایا کرتی تھی۔ اب نظر نہیں آ رہی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ محسوس کیا کہ شور کرتے پہیوں کی رفتار میں فرق آ گیا ہے۔ گاڑی اب قدرے آہستہ چل رہی تھی۔ مخالف سمت میں دوڑتے درختوں اور منظروں کی رفتار میں بھی فرق آ گیا تھا۔ اندر کے حال سے بے خبر میں باہر کے منظر کے ساتھ پیوست ہو چکا تھا۔ مگر اندر کے شور نے مجھے پھر اندر کی طرف ایک نظر ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ کتنے مسافر سامان اٹھا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ "ویاس پور آ گیا۔" اور اس کے ساتھ ہی گاڑی ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ سٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی۔ میں نے مخالف سمت میں نظر

ڈالی۔ دور کی پٹڑی پر ایک گاڑی مسافروں سے لدی پھندی کھڑی تھی اور انجن سے کالا کالا دھواں نکل رہا تھا۔ اجلی فضا میں امڈ تا بل کھاتا یہ دھواں کتنا زندہ نظر آ رہا تھا۔

گاڑی اب پلیٹ فارم کے برابر برابر چل رہی تھی۔ ہجوم جو پلیٹ فارم پر امڈا ہوا تھا تیزی سے پیچھے کی طرف سرک رہا تھا۔ جو قلی چلتی گاڑی میں چڑھ آئے تھے ان میں سے ایک کو میں نے لپکا، اس پر اپنا سامان لادا اور عجلت سے باہر نکلا۔ مگر یہ عجلت گاڑی سے باہر آنے تک تھی۔ باہر آ کر میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ کھڑے ہو کر قریب و دور کا جائزہ لیا۔ پلیٹ فارم کی ایک ایک تفصیل پر نظر ڈالی۔ پھر میری نظر ٹین کے اس لمبے سائبان پر گئی جس کو سہارا دینے والے شہتیروں پر جنگلی کبوتر نیچے بہتے ہوئے سراسمہ ہجوم سے بے نیاز ایک سکون سے بیٹھے تھے۔ دیر تک میں انہیں دیکھتا گیا۔ پھر دل ہی دل میں ایک گونہ اطمینان کے ساتھ کہا، یہ تو سب اسی طرح ہے۔

ہجوم کو چیرتا ہوا ایک شخص تیزی سے میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ قریب آیا تو میں نے پہچانا اور اس کی طرف لپکا "ارے شنکر تو؟" ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

"یار جواد تو کتنا بدل گیا ہے؟"

"اور تو؟"

"ہاں میں بھی۔ بدلنا تو یار تھا ہی۔ زمانہ بھی تو کتنا بیت گیا ہے۔ مجھے تو بالکل یقین نہیں تھا کہ تو آئے گا۔" لہجہ بدل کر "اچھا کدھر ہے۔" قلی پر نظر ڈالی۔ بولا "چلو۔"

"ٹھہر یار۔"

"کیوں، کیا بات ہے؟"

"دیکھ لینے دے۔" ایک دفعہ پھر میں نے سٹیشن کے قریب و دور کا جائزہ لیا۔ دور پھیلی ہوئی پٹڑیوں سے لے کر ٹین کے سائبان تک ایک ایک تفصیل کا پھر سے جائزہ لیا۔ شہتیروں پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کو دیکھا "یار شنکر، کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے۔"

"اچھا یہاں سے تو نکل--------- پھر تجھے پتہ چلے گا کہ کتنا کچھ بدل چکا ہے سب کچھ۔"

شنکر قلی کو ساتھ لے کر تیز تیز چل رہا تھا اور میں تھا کہ ارد گرد دیکھتا آہستہ

آہستہ چل رہا تھا۔ اسٹیشن سے نکل کر میں نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے سامنے کھڑے تانگوں، ٹمٹوں اور رکشاؤں پر نظر ڈالیں۔ تعجب سے بولا "یار شنکر، اب یہاں رکشا بھی چلتی ہے۔"

"ہاں" شنکر نے لاپروائی سے کہا اور تیزی سے کار کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور نے اتر کر ڈگی کھولی۔ سامان رکھا۔ میں غور سے دیکھتا رہا۔ پھر رہا نہ گیا۔ کار میں بیٹھ کر بولا "یار وہ جو تمہارے یہاں تانگہ ہوا کرتا تھا۔" اور اس کے ساتھ ہی ایک سجا سجایا تانگہ اپنے بالا قد گھوڑے کے ساتھ میری آنکھوں میں پھر گیا۔

"یار، رامو کے مرنے کے ساتھ پتاجی نے تانگہ کا ٹنٹا ہی ختم کر دیا۔"

"رامو مر گیا؟"

"ہاں یار۔"

مجھے کتنا افسوس ہوا۔ موت کی یہ پہلی خبر تھی جو میں نے ویاس پور میں قدم رکھنے کے ساتھ سنی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں بالکل چپ ہو گیا۔ مگر مور کی آواز نے جو کہیں قریب ہی سے بلند ہوئی تھی اور سرعت سے فضا میں گونجتی چلی گئی تھی ایک دم سے افسوس کی کیفیت کو زائل کر دیا۔ اصل میں کار اس وقت لالہ ہردیال کی بغیچی کے برابر سے گزر رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی آہستہ کرنے کو کہا اور بڑے اشتیاق کے ساتھ بغیچی پر نظر ڈالی۔ نظر چھدرے درختوں کے بیچ سے گزرتی ہوئی کنوئیں تک گئی جس کے آس پاس کئی دھوتی پوش دنتون کرتے نظر آرہے تھے۔ کنوئیں کو، اس کے آس پاس کھڑے درختوں کو، گلاب کی کیاریوں کو، کیوڑے کی جھاڑی کو سب کو میں نے آسانی سے پہچان لیا۔ بس دنتون کرنے والوں کو نہیں پہچان سکا۔

بغیچی جلد ہی گزر گئی، اور آس پاس کی وہ کوٹھیاں بھی جو درختوں میں گھری کھڑی تھیں۔ اس کے بعد بازار شروع ہو گیا۔ امرت دھارا بلڈنگ اور اس سے چار قدم آگے دال منڈی۔ بازار بند تھا۔ جہاں ڈھیر پڑے رہتے تھے، گیہوں کے، کپاس کے، گڑ کی بھیلیوں کے وہاں اس وقت میدان صفا چٹ تھا۔ جہاں تہاں دانے دنکے پڑے تھے جن پر جنگلی کبوتروں کی ٹکڑیاں اتری ہوئی تھیں۔ آس پاس کچھ گڑ سلیں بھی

حصہ بنانے کے لئے آن موجود ہوئی تھیں۔ آدمی غائب، پرندے موجود۔ بس سڑک پر کہیں کہیں مہتر جھاڑو دیتے نظر آ رہے تھے۔ اس پُر سکون فضا میں، میں نے ایک مرتبہ پھر اطمینان کا سانس لیا۔ دل ہی دل میں کہا کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ سب اسی طرح ہے۔

اس وقت سے اب تک کتنی باتیں ہو چکی تھیں۔ کھانے کی میز پر آ کر بھی باتوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ جیسے پتہ ہی نہ ہو کہ کیا کھا رہے ہیں اور کھا بھی رہے ہیں یا نہیں کھا رہے۔ باتیں، باتیں، باتیں، کب کب کے قصے، کہاں کہاں کے بکھیڑے۔

بولتے بولتے میں رکا۔ کچھ دیر چپ رہا۔ پھر بولا "شنکر یار، اپنے گھر بھی تو جانا ہے۔"

"گھر؟" شنکر نے مجھے تعجب سے دیکھا "وہاں لوگ ہیں ابھی؟"

"پتہ نہیں کون ہے اور کون نہیں ہے۔ بہر حال چھوٹے میاں تو ہیں۔ تمہیں ان لوگوں کا کوئی اتا پتہ نہیں؟"

"نہیں۔ آخری بار میں تمہارے تایا جی کی مرتیو کے سمے گیا تھا۔ پھر جانا نہیں ہوا۔ پھر اڑتی اڑتی یہ خبر سنی کہ دکلشا بک رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ بالآخر انہوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔"

"تم نے غلط سنا۔ ویسے تو اس دوران میرا ان سے رابطہ نہیں رہا۔ لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ کم از کم چھوٹے میاں نے یہاں ٹکے رہنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔"

"تمہارے آنے کی انہیں اطلاع ہے؟"

"نہیں۔ میں نے سوچا کہ جب اتنے دن سے خط نہیں لکھا ہے تو اب کیا لکھوں۔ بس وہاں جا کر ہی ملوں گا۔"

"ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ اطمینان سے کل ادھر چلیں گے۔"

"پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن یار اب مجھے بے چینی ہو رہی ہے۔ میں یہاں آ کر گھر نہ جاؤں، یہ بات عجب سی لگ رہی ہے بس ابھی چلنا ہے۔" جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا "بس اب اٹھ کھڑے ہو۔"

دال منڈی میں جہاں صبح کبوتروں اور گڑسلوں کے سوا کوئی مخلوق نظر نہیں آ رہی تھی اب ایک خلقت امنڈی ہوئی تھی۔ بازار میں یہاں سے وہاں تک سروں کا سمندر۔ اس میں پھنسی ہوئی کار چیونٹی کی چال چل رہی تھی۔ اور گرد کتنی اڑ رہی تھی۔ حلوائیوں کی گلی سے گزرتے گزرتے اس گرد میں دھواں بھی شامل ہو گیا اور مکھیاں بھی۔ ویاس پور صبح کتنا پر سکون نظر آیا تھا۔ اور کتنا اجلا۔ اب احساس ہو رہا تھا کہ ویاس پور کتنا میلا ہو چکا ہے۔ خدا خدا کر کے کار بازار سے نکلی۔ کچھ کشادگی کا احساس ہوا۔ دلکشا والی سڑک پر مڑتے ہوئے دل کتنی تیزی سے دھڑکا۔ مگر پھر کتنا حیران ہوا۔ یہاں سے وہاں تک دکانیں ہی دکانیں اور لوگ ہی لوگ۔ میرے تصور میں تو وہ خاموش سڑک تھی جس کی ایک سمت میں اونچے درخت اور کھیت، دوسری سمت میں یہاں سے وہاں تک لمبی سرخ سرخ اینٹوں والی ایک دیوار، اندر کیا تھا۔ اس کا ٹھیک اندازہ مجھے کبھی نہیں ہوا۔ بس ایک اسی طرح کی اینٹوں کا بنا ہوا ایک بھاری سا ستون کھڑا نظر آتا تھا جو بعض دنوں میں مردہ سا اور بعض دنوں میں مستقل دھواں اگلتا اور بھک بھک کرتا دکھائی دیتا۔ اصل میں یہ روئی کا بیچ تھا جس کی حد ختم ہونے کے بعد بس تھوڑے قدم چل کر ہم دلکشا میں داخل ہو جاتے۔ مگر اب تو اس بھاری دیوار کے برابر برابر یہاں سے وہاں تک دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ اور دوسری سمت والے اونچے درخت اور کھیت، وہ کہاں گئے اور اتنے آدمی سڑک پر کہاں سے آ گئے۔ کتنی وحشت ہو رہی تھی نئی خلقت کو دیکھ کر۔

کار سے اتر کر میں چند قدم چلا اور سکتہ میں آ گیا۔ "دلکشا کہاں ہے،" منہ سے

بے ساختہ نکلا۔ گیٹ سے کتنی دور تک پتلے سے کچے رستے پر تانگہ چلتا رہتا تھا۔ دائیں بائیں درخت ہی درخت، درختوں کے پیچھے درخت کچھ اونچے اور گھنے، کچھ جھاڑیوں کی طرح کے، آم، امرود، جامن، پھراناں، آڑو، آلو بخارا اور کیلے کے درختوں کی دو رویہ قطار جس کے بیچ سے تانگہ میں بیٹھ کر گزرتے ہوئے کتنا اچھا لگتا۔ سب درخت کہاں گئے۔ اور دلکشا کی عمارت؟ گرد آلود میدان میں دور تک نظر دوڑائی۔ دور اینٹوں کا ایک ڈھیر نظر آرہا تھا، ایک ڈھئی ہوئی عمارت، قریب جاکر غور سے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔ منہدم در و دیوار کے بیچ بس ایک زینہ تھا جسے میں پہچان سکا۔ عجیب بات ہے۔ ڈھئی ہوئی عمارت میں بس ایک زینہ ہوتا ہے جو اپنی شکل کو کسی نہ کسی طور برقرار رکھتا ہے۔

صاف ستھری سیڑھی پر بیٹھ کر میں نے اپنے آپ کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔ میں بھی جیسے ملبہ بننے لگا تھا۔ کتنی دیر تک گم سم بیٹھا رہا۔ شنکر نے بھی بولنا ضروری نہیں سمجھا۔ ہاں کچھ دیر بعد وہ قریب و دور کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑایا "یہاں کوئی نظر بھی نہیں آرہا۔ کس سے پوچھا جائے۔"

شنکر کے اس فقرے پر میں نے نظریں اٹھا کر اردگرد کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ دور ایک سمت میں ایک آباد گوشہ نظر آیا۔ نیم کا پیڑ، سائے میں چارپائی پڑی ہوئی، قریب گھوڑا بندھا ہوا اور بے جتا تانگہ۔ اس کے روبرو ایک کچی چہار دیواری، دروازے پر لٹکتا ایک میلا پھٹا پردہ۔ یاد آیا، یہاں بھوپت رہا کرتا تھا۔ اٹھ کر تیزی سے اس سمت میں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

ایک شخص کالا کلوٹا ساٹھا پاٹھا میلی دھوتی بنیان میں اندر سے برآمد ہوا۔ مجھے غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر تڑپ کر بے ساختہ بولا "منن میاں، تم؟"

میں حیران کہ یہ کون ہے آخر "بھئی میں تمہیں پہچانا نہیں۔"

"میں بھولو ہوں جی۔ بھوپت کا بیٹا۔"

"اچھا اچھا بھولو۔" مجھے یاد آگیا تھا "اور بھوپت کہاں ہے؟"

"اس کی تو مرتیو ہو گئی جی۔"

"اچھا--------- یہ کب ہوا؟" "بس جی۔" بھولو نے ٹھنڈا سانس بھرا "جب کوٹھی اور باغ کا تیا پانچا ہوا تو بابو بہت دکھی ہوا۔ بس دنوں میں ڈھے گیا۔"

سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہوں۔ رکتے رکتے پوچھا "سب لوگ کہاں ہیں۔"

"سب لوگ کون جی۔ بس چھوٹے میاں ہی تو رہ گئے ہیں۔ وہ پرانی حویلی میں چلے گئے۔"

"پرانی حویلی-------اچھا-------"

بھولو میری معلومات میں مزید اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پرانی حویلی کا حوالہ پھر دیا اور کچھ کہنے لگا تھا کہ سامنے نظر آنے والی عمارت پر میری نظر گئی میں چونکا "یہ کیا ہے؟"

"یہ-------- یہ جی دھرم شالا ہے۔"

"دھرم شالا؟" میں چکرایا "یہ کوئی نئی دھرم شالا بنی ہے۔ وہ تو اور تھی۔" میرے تصور میں دھرم شالا اور اس کے اردگرد کا سارا منظر گھوم گیا، اپنی ایک ایک تفصیل کے ساتھ۔ چھوٹی اینٹوں والی مستطیل نما چار دیواری، چھوٹا سا دروازہ، باہر سے یوں نظر آتا کہ اندر بس پیپل کے پیڑ میں اور کچھ نہیں ہے۔ اردگرد وہ سناٹا جیسے جنگل بیابان ہو۔ ساری فضا کتنی بھید بھری تھی کہ پتہ بھی ہلتا تو حیرت اور خوف کا عالم چھا جاتا۔

"منن، او منن۔ بندر۔"

"بندر؟---------- کہاں ہے؟"

"دھرم شالا والے پیپلوں میں۔"

میں اصل میں ان دنوں منن تھا۔ جواد تو میں رفتہ رفتہ بنا۔ اور اس فضا کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا لڑکا درختوں کے بیچ واہی تواہی پھرتا بس جیسے نظروں کے سامنے آن کھڑا ہوا ہو۔ جیسے وہ میرے وجود سے الگ ایک وجود تھا جو گزرے وقت کے ساتھ کہیں گم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ایسے دیکھا جیسے یہ میں نہیں ہوں۔ کوئی اور ہے۔ صیغہ غائب، جب دیکھو میمونہ کے ساتھ چپکا ہوا۔ دونوں ہی واہی تواہی پھرتے تھے۔

"اچھا دھرم شالا والے پیپلوں میں؟"

"ہاں وہیں دکھائی دیا تھا۔"

منّن نے کھڑے کھڑے ان دور کھڑے گھنے اونچے درختوں کی ٹہنیوں کا جائزہ لیا "وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"وہیں تھا۔"

"پھر کہاں اڑنچھو ہو گیا۔"

پھر وہ دونوں بندر کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے نرکلوں کی باڑھ تک گئے۔ یہ ان دونوں کے لئے آخری حد تھی جہاں سے آگے غیر علاقہ شروع ہو جاتا تھا، ایسا علاقہ جہاں قدم رکھنا ان کے لئے ایک جوکھم تھا۔ اور آگے تھا کیا۔ یہاں سے وہاں تک جہاں تہاں تھوہڑ کھڑی نظر آتی تھی۔ بھوڑ سے پرے دھرم شالا اور دھرم شالا سے پرے کیا تھا۔

کبھی وہاں تک گیا ہوتا تو پتہ چلتا۔ بس دور سے کچھ نرکل، کچھ گھنے اونچے پیڑ دکھائی دیتے تھے اور بس۔ باڑھ تک جا کر دونوں ٹھٹھک گئے۔

"کہاں تھا بندر؟"

"اس پیپل پہ۔" دھرم شالا کے سب سے اونچے والے پیپل کی طرف میمونہ نے انگلی سے اشارہ کیا۔

منّن نے غور سے دور کھڑے پیپل کی ایک ایک ٹہنی کا جائزہ لیا "وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

سونگھتا سونگھتا جانے کدھر سے بھولو بھی آن پہنچا۔ "منّن میاں کیا دیکھت ہو۔"

"بندر۔"

"باندر؟" بھولو نے تعجب سے کہا۔

"ہاں اس اونچے والے پیپل پہ بندر تھا۔ میمونہ نے دیکھا تھا۔ جانے کدھر گیا۔"

"باندر نہیں ہو سکتا جی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔"

"باندر تو سب کے سب نگر سے بھاگے ہوئے ہیں۔ لنگور مہاراج کہیں سے آن

نکے ہیں۔ بس باندر غائب۔"

"پر میں نے تو دیکھا تھا۔ دم ایسی لمبی جیسے رسی ہو۔ بالکل بھورا اور منہ کالا۔"

بھولو ہنسا "فیروے تو لنگور تھا۔"

"لنگور تھا؟" اس نے جھرجھری لی "چلو چل کے دیکھیں۔"

"منی میاں، ادھر سنبھل کے جائیو جی۔"

میمونہ نے تجسس سے پوچھا "دھرم شالا میں کون رہتا ہے۔"

ششں وپنج میں پڑ گیا "ہاں واں پہ کون رہتا ہے۔"

"مجھے پتہ ہے۔" بھولو نے اعتماد سے کہا۔

"تجھے کیسے پتہ ہے۔"

"میں جی ایکوں باری جی کڑا کرکے دھرم شالا میں گھس گیا۔ کیا دیکھوں ہوں کہ پیپل تلے ایک سنڈ مسنڈ سادھو بیٹھا ہے انگ پہ بھبوت ملے۔ آنکھیں بند ہیں اور مسکان کر ریا اے۔ سامنے دیوا بل ریا اے۔ باتی کی لو میں ایک سندر بیر بیٹھی مسکان کر رئی ہے۔ کانوں میں بالے، ناک میں بلاق، میں جی واں سے تراٹ ہولیا۔"

منی اور میمونہ دونوں حیرت اور خوف سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر منی نے ایک دم سے جھرجھری لی "جھوٹ۔"

میمونہ نے تائید کی "جھوٹا۔"

"مت مانو جی۔"

"چلو چل کے دیکھتے ہیں۔" منی نے یکایک اعلان کیا۔

"نہیں۔" میمونہ نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"میمونہ بی بی۔" بھولو نے ڈھارس دلائی۔ "ڈرو مت جی۔ میں آگے آگے چلتا ہوں۔"

اور واقعی بھولو نے اعتماد سے قدم بڑھایا اور آگے آگے چلنے لگا۔ وہ دونوں پیچھے پیچھے۔ لگتا تھا کہ دھرم شالا یہ رہی مگر وہ تو دور کھسکتی جا رہی تھی۔ بھوڑ میں چلتے ہوئے لگ رہا تھا کہ بیابان ریگستان میں چلے جا رہے ہیں۔

چلتے چلتے ٹھٹھکا۔ خوف بھری آواز میں سرگوشی میں بولا "سانپ۔"

وہ دونوں بھی ٹھٹھک گئے۔ یہ لمبا سانپ ان سے چند قدم کے فاصلہ پر لہراتا چلا جا رہا تھا۔ میمونہ نے خوف سے منّی کی انگلیوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ سانپ اطمینان سے لہراتا ہوا دھرم شالا کی دیوار کے برابر کھڑی جھاڑیوں میں گھس کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"چلو واپس۔" منّی نے اعلان کیا۔ اور فوراً تینوں پلٹ لئے۔ تھوڑی دور تک آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ پھر ایک دم سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سب سے آگے بھولو، سب سے پیچھے میمونہ۔

انہوں نے رہٹ پہ جا کے دم لیا جہاں اونٹ اپنی سست رفتار کے ساتھ گردش میں تھا اور پانی ایک خاص رفتار کے ساتھ نالی سے ہوتا ہوا کھیتوں میں جا رہا تھا۔ بھوپت ایک کنارے پہ بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ چلم پیتے پیتے اس نے تینوں پہ نظر ڈالی جن کے سانس پھولے ہوئے تھے۔

"للا جی، لوئن میں کہاں پھرت ہو۔"

"بابو سیانپ۔" بھولو نے اطلاع دی۔ "دھرم شالا کے دھورے تھا۔ اتنا لمبا۔"

"کوڑیالا تھا۔؟"

"ہیے۔"

بھوپت متفکر ہو گیا۔ چلم کا لمبا گھونٹ لیا۔ پھر بولا "بہت زہری ہے۔ میں تو واکو مارن لگے تھا۔ پر دھرم شالا کی سانکل کھول کے سادھو مہاراج نکل آئے۔ اور کلکل ڈال دی۔ کہنے لگے کہ مورکھ شیش جی کی سنتان کو دکھ دینے لگا ہے۔ بس مو کو کپکپی آ گئی اور لٹھیا اٹھی کی اٹھی رہ گئی۔"

وہ، تینوں دم بخود تھے۔ میمونہ نے قمیص کے دامن سے گردن اور منہ کا پسینہ پونچھا۔ کتنی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ رات کو جب پھوپھی اماں کی بغل میں لیٹ کر اس نے دوپہر کی ساری واردات سنائی تب کہیں جا کر اس کا خوف زائل ہوا۔

"اماں، پتہ ہے دوپہری کو کیا ہوا۔ دھرم شالا کے پاس جو جھاڑیاں ہیں نہیں، اکھ کی جو جھاڑیاں ہیں-------"

"دھرم شالا کے پاس؟" پھوپھی اماں نے اس کی بات کاٹی "بیٹی وہاں تو کیا

کرنے گئی تھی۔"

"میں تو نہیں جا رہی تھی۔ منن پیچھے پڑ گیا کہ دھرم شالا چل کے دیکھیں واں پہ کون رہتا ہے۔"

"جھوٹ۔" منن نے جو پھوپھی اماں کی دوسری بغل میں لیٹا تھا تردید کی۔ "اس میمونہ کی بچی ہی نے تو مجھ سے کہا تھا کہ دھرم شالا کے پیپل پہ لنگور ہے۔ تو میں نے کہا کہ چلو چل کے دیکھے لیتے ہیں۔"

"نا میرے لال ادھر مت جایا کرو۔ اور یہ دوپہریاں تو ویسے بھی سناہٹی ہیں۔ مٹے سادھو جنتر منتر کرتے رہوے ہیں۔ واں پہ بھوت پریت کا ڈیرا ہے۔"

"پھوپھی ماں، میں بھوت سے بالکل نہیں ڈرتا۔"

"ہوں نہیں ڈرتا۔" میمونہ نے اس کی آواز کی نقل اتارتے ہوئے کہا "سانپ کو دیکھ کے تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ اماں، یہ لمبا یہ موٹا سانپ۔ بالکل ہمارے پاس سے لہرکھا کے نکل گیا۔"

"ہائے اللہ، ارے کم نصیبو تم کہاں مارے مارے پھرتے ہو۔"

"پھوپھی اماں، کیا بتاؤں اس وقت میری غلیل میرے پاس نہیں تھی۔ ایسا غلہ تاک کے مارتا کہ بلبلا جاتا۔"

"لال میرے، ایسی بات بھول کے بھی کبھی مت کریو۔ اس زہری سے اللہ بچاوے۔ مر جاوے تو مصیبت، بچ جاوے تو مصیبت۔ چوٹ کھایا سانپ بہت پھپھناوے ہے۔ مارا جاوے تو اس کی سانپن بدلہ لینے کے لئے پھپھناتی پھرے ہے۔"

"اماں" میمونہ نے سوال اٹھایا "سانپن کو کیا پتہ کہ کس نے اس کے سانپ کو مارا ہے۔"

"اے لو اسے پتہ نہ چلے گا۔ سانپ کے مرنے کے بعد وہ دوڑی آوے ہے اور سانپ کی آنکھوں میں جھانکے ہے۔ سانپ مرتے وقت مارنے والے کو ایسے دیکھے ہے کہ اس کی آنکھوں میں مارنے والے کی تصویر اتر آوے ہے۔ بالکل جیسے کسی نے فوٹو کھینچ لیا ہو۔ سانپن بس واں سے مارنے والے کا کھوج لے لیوے ہے اور بدلہ لینے کے لئے چل پڑے ہے۔ اور سانپ بچ جاوے تو وہ موا ایسی گرہ میں باندھے ہے کہ جب

تک بدلہ نہ لے لے اسے کل نہیں آوے۔ اس سے بدلہ نہ لے سکے تو بیٹے سے لے لے گا، بیٹے سے نہ لے سکے تو پوتے سے لے لے گا۔ راجہ پر تھمت کے ساتھ یہی تو ہوا تھا۔"

"راجہ پر تھمت کے ساتھ؟ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔" فن نے اور میمونہ نے بیک وقت سوال کیا۔

"ارے ہوا یہ کہ راجہ پر تھمت کا دادا بہت سورما تھا۔ ایک دفعہ وہ تیر کمان لے کے سانپوں سے بھرے ایک بن میں گھس گیا۔ سب سانپوں کو ایک ایک کر کے تیروں سے چھید ڈالا۔ پر ایک سانپ کو تیر اچٹتا سا لگا۔ وہ بچ کے نکل گیا۔ بس اس کا بچنا غضب ہو گیا۔ وہ تو اس سورما کی جان کا بیری ہو گیا۔ خیر اس سورما پہ تو اس کا بس نہ چلا۔ اس کا بیٹا بھی بچا رہا۔ جب خیر سے پوتا تخت پہ بیٹھا تو اس زہری نے کہا کہ باپ دادا تو بچ کے نکل گئے۔ پوتے کو نہیں چھوڑوں گا۔ ادھر پر تھمت کو بھی پتہ چل گیا کہ ایک سانپ اس کی جان کا بیری ہوا ہے۔ جھوٹ مت جانیو اس نے اپنے رہنے کے لئے ایسا محل بنوایا کہ اوپر سے پرندہ پر نہیں مار سکے اور نیچے سے کیڑا رینگ کے بھی نہ جا سکے۔ پر یہ زہری بھی بلا کا بنا ہوا تھا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ راجہ کے لئے پھلوں کا ٹوکرا جا رہا ہے۔ وہ جھٹ گنڈار بن کے ایک امرود میں گھس بیٹھا۔ اب ادھر کی سنو۔ سارے پھلوں میں سے وہی ایک امرود راجہ کے جی کو بھایا۔ امرود کو کاٹ کے کھانے لگا تھا کہ ایک گنڈار بلبلاتی دکھائی دی۔ ہنس کے بولا کہ لو جی یہ ہے وہ کیڑا جو مجھے ڈسے گا۔ بھیا اتنا اس کا کہنا تھا کہ وہ گنڈار ایک ساتھ تڑپ کر یہ لمبا سانپ بن گئی۔ ایک پھنکار ماری اور اسے گردن پہ ڈس لیا۔ پھر لیجیو دوڑیو ہوتی رہی وہ تو سٹک گیا۔ اور ادھر راجہ نے دم کے دم میں دم دیدیا۔"

"فن میاں، تم نے تو دیکھا تھا جی۔ پہلے یاں پہ تھا کیا۔ چار ٹوٹی پھوٹی دیواریں، ایک دروازہ اور پیپل کے پیڑ۔"

"ہوں۔" میں نے لمبا سانس لیا۔ تصور کا سلسلہ بکھر گیا تھا۔

"اور وہ جو بھوڑ ہوا کرتی تھی وہ بھی غائب ہو گئی۔"

"اور یہ جگہ جہاں میں کھڑا ہوں؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ مجھے عجب سا

احساس ہوا یہ دیکھ کر کہ وہ جگہ جو کل تک شاد آباد تھی دیکھتے دیکھتے اجاڑ ہو گئی اور اس کے متصل زمین کا وہ ٹکڑا جہاں ایک بھید بھری ویرانی کا ڈیرا تھا کس طرح آباد ہوا ہے کہ ساری بھید بھری فضا غارت ہو گئی۔ "یار شنکر یہ علاقہ تو برباد ہو گیا چلو چلتے ہیں۔" اور میں بھاری قدموں سے واپس چلنے لگا۔

"منّن میاں حویلی جا رہے ہو جی؟"

"ہوں"

"میں بھی چلوں گا۔" وہ تیزی سے پردہ اٹھا کر اندر گیا اور دم کے دم میں کُرتا گلے میں ڈالتا لپک کر آیا اور پیچھے پیچھے ہو لیا۔

واپس پھر اسی راستے پر جہاں آگے یہاں سے وہاں تک ایک طرف درخت تھے اور کھیت اور دوسری طرف سرخ اینٹوں والی ضخیم لمبی دیوار اور اس میں جابجا مکلے جن میں جنگلی کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے اور اب دو رویہ دکانیں تھیں، چھتوں والی کم، ڈیرے تمبو والی زیادہ اور ہر قسم کا مال چوڑیاں، چھلے، کنگھیاں، سرمے دانیاں، منہ سے بجانے والے باجے، پھرکنی، چکئی، لٹو، پتنگوں کی بھی دکانیں نظر آ رہی تھیں جن پر ڈھیر قسم کے للرے اور کلرے تنگے نظر آ رہے تھے۔ مگر آتے ہوئے یہاں جو استعجاب پیدا ہوا تھا وہ اب نہیں تھا۔ بس سڑک کو تنگ پا کر اور لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر خفقان ہو رہا تھا "یار شنکر ویاس پور میں اتنی خلقت کہاں سے ٹوٹ پڑی۔" اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے نکلا "بہت بدل گیا ہے ویاس پور۔"

پھر جس جس سڑک جس جس بازار سے گزرا اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ وہی احساس کہ ویاس پور کتنا بدل گیا ہے۔ زمانہ، میاں زمانہ۔ مجو بھائی کا بے فکری کے انداز میں کہا ہوا فقرہ مجھے یاد آیا اور مجھے ایک اداسی نے آ لیا۔ زمانہ، میاں زمانہ۔

"لو جی اپنی گلی آ گئی۔"

نظر ڈالی۔ ہاں بالکل وہی گلی ہے، میں نے سوچا۔ مگر، فوراً ہی ایک حیرانی نے مجھے آ لیا، یہ گلی اتنی تنگ کیسے ہو گئی۔ آگے تو خاصی چوڑی ہوا کرتی تھی۔ کتنی کشادہ لگتی تھی۔ اور یہاں تو نئی دکانیں بھی نہیں کھلی ہیں۔ وہی پرانی دکانیں، کوئی دودھ ربڑی کی، کوئی پتنگوں کی، کوئی چوڑیوں کی، اور آخر میں عطار کی۔ عطار والی دکان کا

میں نے خاص طور سے جائزہ لیا کہ شاید ٹوئیاں عطار اپنے مٹھی بھر جثے اور کمان کمر کے ساتھ اسی طرح بیٹھا امام دستے میں گھاس پھوس کوٹ رہا ہو، نسخے باندھ رہا ہو۔ مگر اس کی جگہ کوئی اجنبی صورت بیٹھی تھی۔ میرے سارے تجسس پر اوس پڑ گئی۔ بس اس کے بعد ہی پرانی حویلی کا پھاٹک آگیا۔ میں تو بھوچکا رہ گیا۔ خوشی مگر اس کے ساتھ حیرت کتنی ہوئی۔ یہ پھاٹک پہلے کتنا اونچا اور کتنا چوڑا ہوتا تھا۔ اور اب کتنا چھوٹا نظر آرہا تھا۔ اور اب مجھے احساس ہوا کہ ویاس پور کے رستے ہی تنگ نہیں ہوئے ہیں، وہ سب گھر بھی جو پہلے بہت بڑے اور بلند نظر آتے تھے۔ اب چھوٹے اور پست دکھائی دے رہے ہیں جیسے پچک گئے ہوں اور سکڑ گئے ہوں۔ پرانی حویلی بھی پچکی پچکی نظر آرہی تھی۔ کتنی بلند و بالا ہوا کرتی تھی، اور اسی کے ساتھ کتنے منظر تیزی سے میری آنکھوں میں پھر گئے۔

دادا میاں اپنی چگی سفید ڈاڑھی کے ساتھ ملے دلے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ماتمیوں کے بیچ آکر بلند آواز سے کہتے یا حسین، ماتم رک جاتا اور پھر وہ فوراً انگشت شہادت بلند کر کے شروع ہو جاتے السلام علیک یا ابا عبداللہ، السلام علیک یا بن العلی، السلام علیک یابن الحسین اصل میں دلکشا میں پرانی حویلی سے سب کچھ منتقل ہو گیا تھا۔ بس عزاخانہ منتقل نہیں ہو سکا تھا۔ علم عجب ہوتے ہیں کہ جہاں ایک دفعہ کھڑے کر دیئے جائیں وہاں وہ دیکھتے دیکھتے جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ پھر ان کے گرد اتنی نشو و نما ہو جاتی ہے کہ انہیں وہاں سے اٹھانے کا مطلب ہوتا ہے ایک ہرے بھرے پیڑ کو جڑ سے اکھاڑنا۔ سو دادا میاں نے بیٹے کے سامنے اس حد تک تو سپر ڈال دی تھی کہ تنگ گلی سے نکل کر کسی کشادہ مقام پر کوٹھی تعمیر کی جائے اور وہاں رہائش اختیار کی جائے۔ سو اپنے باغ کے بیچ کوٹھی تعمیر کی۔ مگر ایک بات انہوں نے اپنی منوائی جس کے تحت برس کے برس دس دن کے لئے پورا کنبہ پورے تام جھام کے ساتھ پرانی حویلی میں آکر ڈیرا کرتا۔ یہ دس دن کہنے کو دس دن تھے۔ اصل میں پورا ایک زمانہ ہوتا تھا۔ کتنا کچھ ہو جاتا تھا اس زمانے میں اور دادا میاں ان دنوں میں کتنے متحرک کتنے سرگرم نظر آتے تھے۔ جائیداد کے معاملات گھربار کے قصے، شادی بیاہ کے بکھیڑے سب چھیتے بیٹے کے سپرد کر دیئے تھے۔ اپنی سرگرمی بس محرم تک محدود کر لی تھی۔ ان دنوں میں دن رات چک پھیری کی طرح پھرتے تھے ہاں مجلس کے اوقات میں جم کر بیٹھتے تھے۔ منبر کے روبرو، مرثیہ خواں

کی ایک ایک ادا پر جھومنا، ایک ایک مصرعہ پر داد دینا، وقفہ وقفہ سے صلوٰۃ پڑھنا اور ایک دم سے گریہ کی آواز بلند کرنا۔ اپنے بلند گریہ کے ساتھ وہ پوری مجلس پر چھائے رہتے تھے۔ بلکہ گریہ کی ابتدا ہی ان کی رقت بھری چیخ سے ہوتی تھی۔ اور حاضرین مجلس مرثیہ خواں سے نہیں اس چیخ سے اشارہ لیتے تھے۔ اور شروع ہو جاتے تھے اور ہاں------- اچانک ایک اور ہی تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی۔ پھر میرا گمشدہ وجود من کی صورت میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وجود جو میرے لئے اب صیغہ غائب تھا۔ اچکن پہن کر سلمہ ستارہ ٹنکی ٹوپی سر پر جما کر جھجکتے جھجکتے اماباڑے میں اس کا داخل ہونا اور دادا میاں کے پہلو میں جا بیٹھنا۔ "دادا میاں ہم بھی پڑھیں گے۔"

"ضرور پڑھو بیٹے۔"

اور جب منبر پر بیٹھتا تو دادا میاں کا کہنا "بیٹے دلو رام کوثری کی رباعی پڑھو۔" اور اس کا فوراً شروع ہو جانا۔

کیا پہنچا مسیحا جو فلک پر پہنچا
مقصود کو اپنے نہ سکندر پہنچا
اللہ غنی کوثری ایسا چالاک
گنگا سے جو پھسلا لب کوثر پہنچا

اس کے ساتھ ہی اماباڑہ غائب، پھر دادا میاں کی دوسری تصویر، پرانی حویلی کی بیٹھک۔ بندے علی آئے بیٹھے ہیں۔ بیچ میں حقہ رکھا ہے اور اخبار زمیندار، جس کے مطالعہ کے بعد مسلمانوں کے زوال پر ایک افسوس بندے علی کی طرف سے، دوسرا افسوس معہ محاکمہ کے دادا میاں کی طرف سے۔

"سید صاحب، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مسلمان تو برگزیدہ قوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شفیع محشر سے اس کی بخشش کا وعدہ کر رکھا ہے۔ پھر وہ آج کیوں ذلیل و خوار ہے۔"

"بھائی بندے علی، کوئی بھی متنفس ہو، اعمال کی سزا تو اسے ملنی ہے۔ یہ دیکھو کہ مسلمانوں کے اعمال اس وقت کیسے ہیں۔ دور کیوں جاتے ہو، ترکوں ہی کو دیکھ لو۔ کلام اللہ کی زبان پاک سے منحرف ہو کر انہوں نے تو اپنی نمازوں کو بھی برباد کر ڈالا۔ تو جب

مسلمان مسلمان نہ رہیں تو ان پر خدا کا قہر تو نازل ہوتا ہی ہے۔"

"سچ کہا آپ نے سید صاحب، یہ سب مذہب سے روگردانی کا نتیجہ ہے۔" بندے علی نے کتنی جلدی نکتہ کو سمجھ لیا۔

"بھائی بندے علی، ڈاکٹر سر محمد اقبال کا جواب شکوہ پڑھو۔ مسلمانوں کے ادبار کی ساری وجہ آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔"

بندے علی نے حقہ کا گھونٹ بھرا، پھر بولے "سید صاحب، سنا ہے کہ ڈاکٹر سر اقبال نے کوئی نظم لکھی ہے جس میں اہل اندلس کی بربادی کا تذکرہ بڑے پر سوز انداز قلمبند کیا ہے۔ میرا بھتیجا یعقوب الحسن علی گڑھ کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ پچھلے دنوں آیا تھا تو بتا رہا تھا کہ علی گڑھ میں اس نظم کا بہت چرچا ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب نے ایسی شاعری کی ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔"

"اچھا؟ بھئی اگر ایسا ہے تو برخوردار سے کہو کہ وہ نظم کہیں دستیاب ہو تو اس کی نقل لے کر آئے۔" ٹھنڈا سانس بھرا۔ پھر کہنے لگے "بھائی بندے علی، اندلس کی تاریخ بھی اپنی جگہ فسانہ عبرت ہے۔ مسلمانوں نے کیا عروج پایا اور پھر کس طرح قعر مذلت میں گرے کہ صفحہ ہستی ہی سے نابود ہو گئے۔ اور وجہ بس ایک، دین سے پھر گئے۔ جب تک دین سے پیوست رہے کیسی ترقی کی کہ پورا یورپ دم بخود تھا۔ اور کیسا کیسا پہنچا ہوا بزرگ پیدا ہوا۔ بھائی بندے علی، آپ نے کبھی سنا کہ کبھی کوئی فاتح، کوئی شہنشاہ کوئی عامل کوہ قاف تک پہنچا۔"

"کوہ قاف۔" بندے علی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے "سید صاحب کوہ قاف تو جنوں اور پریوں کا مسکن ہے۔ انسان کا وہاں کہاں گزر۔"

دادا میاں مسکرائے "درست فرمایا آپ نے۔ مگر شیخ موسیٰ ابو عمران الصدرانی نے تو کوہ قاف کی چوٹی پر جا کر نماز پڑھی تھی۔ اور ارواح خبیثہ میں سے کسی کی مجال نہیں ہوئی۔ کہ ان کی نماز میں خلل ڈالے۔"

"اچھا؟" بندے علی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "یہ تو میں پہلی مرتبہ سن رہا ہوں۔ کون بزرگ تھے یہ۔"

"اندلس کے بزرگ۔ اپنے وقت کے قطب ایک روز جی میں عجب سمائی کہ کوہ

قافؔ پر جا کر نماز پڑھی جائے۔ ظہر کا وقت قریب تھا۔ ادھر آپ نے نیت کی اور ادھر آپ کوہ قاف پر۔ ظہر کی نماز قافؔ کی چوٹی پر ادا کی۔ عصر کی نماز کوہ قاف کی تلیٹی میں آکر پڑھی۔ کسی مرید نے پوچھا، یا شیخ کوہ قاف کی بلندی کتنی ہے۔ فرمایا، تین سو سال کی مسافت جتنی۔"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔" بندے علی کتنی دیر تک سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے رہے۔"

"بھائی بندے علی، آپ کو پتہ ہے کہ کوہ قاف کے گرداگرد کیا ہے۔ ایک اژدھا جو کوہ قاف کی نگہبانی کرتا ہے۔ حضرت شیخ ابومدین نے شیخ موسیٰ سے کہا تھا کہ شیخ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو کسی روز کوہ قاف پر جائے گا۔ جب ادھر جائے تو کوہ قاف کے پاسبان کو سلام کرنا مت بھولنا۔ شیخ کو کوہ قاف پر چڑھتے چڑھتے یہ بات یاد آئی۔ فوراً با آواز بلند کہا اے کوہ قاف کے پاسبان، تجھے میرا سلام پہنچے۔ اژدھے کی طرف سے جواب آیا وعلیکم السلام۔ اور پھر پوچھا ابومدین کا کیا حال ہے۔ شیخ نے کہا، اے زمین کے باسی اور اے کوہ قاف کے پاسبان، تو ابومدین کو کیسے جانتا ہے۔ اژدھا ہنسا اور بولا، اے سادہ لوح، اس زمین پر کوئی ایسا بھی ہے کہ ابومدین کو نہ جانے۔"

دادا میاں چپ ہو گئے اور حقے کی نے منہ میں لے لی۔ حقہ گڑگڑا رہے ہیں اور بندے علی خیالوں میں غلطاں خاموش بیٹھے ہیں۔ پھر آہستہ سے "سبحان اللہ قربان جاؤں اس کی قدرت کے۔"

"بھائی بندے علی، یہ اسرار الٰہی ہیں ہم آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اور سلطنتوں کا آنا جانا بھی اسرار الٰہی میں سے ہے۔ اب سوچو کہ کتنی بڑی سلطنت تھی اور کیسے کیسے اہل اللہ اس سلطنت میں پیدا ہوئے۔ ابوالحجاج شیخ یوسف کا قصہ تو میں آپ کو سنا ہی چکا ہوں۔ مگر پھر کیا ہوا۔ کمبخت مسلمان دین سے غافل ہو گئے۔ رنگ و نسل کے جھگڑوں میں گھر گئے۔ عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ شعر و شاعری، رقص و سرود، شراب و کباب، رقاصائیں، آتش نفس مغنیائیں، لب و رخسار، زلف و کاکل۔ سلطنت کو تو پھر جانا ہی تھا۔ ساتھ میں خود بھی مٹ گئے۔"

بندے علی تھوڑے تامل کے بعد بولے "مگر سید صاحب، یہ تو کاتب تقدیر پہلے

ہی لکھ چکا تھا۔ میں نے اس باب میں ایک حدیث پڑھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرمایا آپ نے کہ ایک روز میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حضور حاضر ہوا۔ دیکھا کہ آپ گریہ فرما رہے ہیں۔ میں تادیر دیکھا کیا، پھر یوں ملتمس ہوا کہ یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر سے فدا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے اتنی شدت سے گریہ کیا ہے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ حضور نے فرمایا، اے ابن عباس میں نے دیکھا کہ جزیرۃ العرب سے دور مغرب کی سمت میں ایک جزیرہ ہے، جزیرۃ الاندلس، اس میں اسلام کا بول بالا ہے۔ پھر اچانک زوال آتا ہے۔ مسلمان وہاں سے نکالے جاتے ہیں اور اسلام اس زمین سے مٹ جاتا ہے۔"

دادا میاں نے بہت کان لگا کر اس حدیث کو سنا۔ پھر کہنے لگے "مگر کتب صحیحہ میں یہ پیشگوئی بھی تو ملتی ہے کہ اسی سرزمین پر ایک مرتبہ پھر اذان کی آواز گونجے گی۔ تین فاتحین تین اطراف سے اس سرزمین پر یلغار کریں گے اور ایک دن وہ آئے گا کہ وہ تینوں ایک دسترخوان پر کھانا تناول کریں گے۔"

"ایسا کب ہو گا۔"

"جب حضرت امام مہدی ظہور فرمائیں گے۔" اور اس کے ساتھ ہی دادا میاں کا جھکنا اور امام کو جو کہیں پردہ غیب میں ہیں جھک کر سلام کرنا۔

یہ تصویر بھی غائب ہوئی۔ پھر تیسری تصویر، دادا میاں دلکشا میں ہیں جہاں وہ کبھی اس طرح حقہ پیتے بندے علی سے باتیں کرتے نہیں دیکھے گئے۔ بس جیسے اپنی جگہ سے اکھڑ گئے ہوں۔ پلنگ پر لیٹے ہیں نقاہت طاری ہے۔ آنکھیں کھولتے ہیں۔ پھوپھی اماں کی طرف دیکھتے ہیں جو کئی دن سے سرہانے بیٹھی سورۂ یاسین پڑھ رہی ہیں۔ سب آل اولاد جمع ہے۔ دور گئے ہوئے رشتہ دار بھی آن پہنچے ہیں۔ اس زمانے میں موت مرنے والے کو پوری مہلت دیتی تھی کہ جو کہنا ہو کہہ لو، جس کی صورت دیکھنی ہو دیکھ لو۔ دادا میاں نے کہ غشی میں چلے گئے تھے اچانک آنکھ کھولی۔ آہستہ سے کہا "جناب امیر تشریف لائے ہیں۔" ساتھ ہی آنکھیں بند کر لیں، ہمیشہ کے لئے اور پھوپھی اماں نے اونچی آواز سے رونا شروع کر دیا۔ سب ہی رو رہے تھے-------

"لو جی میں چھوٹے میاں جی کو جا کے بتائی آؤں۔" اور بھولو تیر کے موافق اندر پھاٹک میں گیا۔ اور اسی تیزی سے میں بیتے دنوں کی گزرگاہوں سے واپس آیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک حیرانی نے مجھے آلیا۔ لڑکیاں کتابوں سے بھرے بیگ کاندھوں میں ڈالے قطار اندر قطار پھاٹک سے نکل رہی تھیں۔ یاں کوئی سکول کھل گیا ہے؟ بس میں اپنے آپ سے پوچھ کر رہ گیا۔ اور کس سے پوچھتا۔ بھولو اندر جا چکا تھا۔ جس پھرتی سے گیا تھا اسی پھرتی سے واپس آیا۔ "لو جی چھوٹے میاں جی خود ہی آ رہے ہیں۔" اور میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ لمبا قد چھریرا بدن، گوری رنگت، سفید ہلکی داڑھی، بر میں ململ کا کرتا، چھوٹی موری والا پائجامہ، سر پہ رامپوری کالی ٹوپی، بنے بنائے دوسرے میاں جان چھڑی ٹیکتے چلے آ رہے ہیں۔ میں پھر حیران ہوا۔ چھوٹے میاں اتنے بوڑھے ہو گئے، اتنی جلدی میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ اس بیچ کتنے برس گزر گئے ہیں۔ بڑھ کر سلام کیا۔ چھوٹے میاں نے کس محبت سے گلے لگایا۔ اسی محبت سے بڑی بھابی نے زنان خانے کے دروازے پر استقبال کرتے ہوئے گلے لگایا۔ "اے بھیا، یہ عید کا چاند کدھر سے نکل آیا۔ ایسے اچانک بھی کوئی آتا ہو گا۔ ارے دو پیسے کا پوسٹ کارڈ ڈال کے خبر تو دے دی ہوتی کہ سٹیشن پہ جا کے ہم تمہیں لے آتے۔ کون لے کے آیا ہے۔"

"شنکر گاڑی لے کے پہنچ گیا تھا۔"

"ہاں ہاں وہی تمہارا رشتے دار ہے۔ ہم تو غیر ہیں۔ یاں جانے کیسے آ گئے۔ وہیں پہ براجتے۔ سیٹھ مندر کی کوٹھی ہے۔ نوکر چاکر، بگھی موٹر، واں جو آرام ملتا یاں پہ تھوڑا ہی ملے گا۔"

"نیک بخت، گلے شکوے طعنے مہنے بعد میں ہوتے رہیں گے۔ اسے ذرا دم تو لینے دو۔"

"بہت دم لینے دیا۔ اب تو میں ناک میں دم کر دوں گی۔ پاکستان میں بہت پھولی پھولی کھائی ہیں۔ اب ذرا میاں کے مزاج تو پوچھوں گی۔ ارے میں پوچھوں ہوں کہ کیا پاکستان میں ڈاک خانے کی اوڑا پڑ گئی ہے۔ ڈوبے پوسٹ کارڈ کی بھی کوئی اوقات ہے۔ چار حرف خیریت کے لکھ کے چھٹے چھما ہے بھیج دیا کرتے تو کونسی تمہاری دولت میں کمی

آجاتی۔"

"اپنا سمجھتے تب خط لکھتے۔" چھوٹے میاں نے ٹکڑا لگایا۔

"بھیا میں یہ پوچھوں ہوں کہ پاکستان کے پانی میں کیا ملا ہوا ہے کہ جو وہاں جاتا ہے اس کا خون سفید ہو جاتا ہے۔"

"بڑی بھابی مجھے بھی تو کچھ پوچھنے دیں۔ میری سمجھ میں تو ابھی یہ بھی نہیں آیا ہے کہ یہ پرانی حویلی پھر سے کیسے آباد ہو گئی۔ اور دلکشا-------"

"بھیا مت پوچھو۔" بھابھی نے دلخراش لہجہ میں کہا "کیوں ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتے ہو۔ پاکستان جانے والے ہمیں تباہ کر گئے۔"

میں کھسیانا سا ہو گیا۔ بس اتنا کہا "اب وہاں اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔"

"ارے کسی کی آہ لینی اچھی نہیں ہوتی۔ میں نے پیارے میاں سے کہہ دیا تھا کہ تم ہمیں اجاڑ کے جا رہے ہو۔ اللہ نے چاہا تو تم بھی واں پہ جا کے سکھ نہیں پاؤ گے۔ سو وہی ہوا۔ پچھلے برس آیا تھا۔ کہنے لگا، بڑی بھابی، آپ نے ایسی بددعا دی کہ میں ابھی تک بے ٹھکانہ ہوں۔ میں نے کہا کہ بھیا بددعا میں نے نہیں دی۔ تمہاری زمین نے تمہیں بددعا دی ہے۔ آباد زمین کو اجاڑنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ پیارے میاں، زمین بھی کوستی ہے۔ ارے پاکستان میں آباد ہونے کے شوق میں ہمیں تو نہ اجاڑتے اور خاندان کا کھیل بکھرواتو نہ کرتے۔"

"مجھے تو کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں سیدھا دلکشا کی طرف گیا تھا۔ وہاں تو اب کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تو بھلے سے بھولو مل گیا جو یہاں لے آیا۔ تو گویا اسے پیارے میاں کا کارنامہ سمجھا جائے۔"

"پیارے میاں کی ہاں میں ہاں ملانے والے بھی تو موجود تھے۔ سب سے بڑھ کر تمہارے چھوٹے میاں۔"

"اس بے ایمان نے۔" چھوٹے میاں نے ناخوشگواری کے لہجہ میں کہا "چھوٹے بھائی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔"

"اجی اچھے میاں کو تم کم مت سمجھو۔ بلکہ پیارے میاں کے دماغ میں یہ بات ڈالنے والا وہی تھا۔ پاکستان جانے کا شوشہ تو اسی نے چھوڑا تھا۔ بس میاں جان کی آنکھ

بند ہوتے ہی دونوں کے تیور بدل گئے۔ پہلے پاکستان جانے کا شور ڈالا۔ پھر جائیداد کے بٹوارے کا شغلہ چھوڑا۔ تمہارے چھوٹے میاں الہ میاں کا جی۔ رضامند ہوگئے۔ تم جانو کہ مسلمانوں کی جائیدادوں کی قیمت اب کیا رہ گئی ہے۔ اونے پونے بیچا، حصہ بٹایا اور پاکستان چلے گئے۔"

"اچھا کیا چلے گئے۔ یہاں رہ کر کرتے بھی کیا۔" چھوٹے میاں نے بظاہر ان کے جانے کو جائز قرار دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں اچھا ہی کیا۔ جاتے ضرور جاتے۔ مگر ہمیں تو نہ اجاڑتے۔ ارے وہ تو اس حویلی کے بھی کوڑے کرنے کے درپے تھے۔ وہ تو میں جوتی لے کے کھڑی ہوگئی کہ نامرادو، تم تو پاکستان میں جا کے گلچھرے اڑاؤ گے، ہم نگھرے کس چوکھٹ پہ جائیں گے۔ جب انہوں نے زیادہ اکڑ تکڑ کی تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ حویلی تو جدی پشتی ہے۔ اکیلی ڈپٹی دل حسن کی اولاد اس کی مالک نہیں ہے۔ کراچی میں منن بیٹھا ہے اس سے پوچھو۔ اورنگ آباد میں جا کے اپنی چھوٹی پھوپھو کو رضامند کرو۔ اور میمونہ بھی تو ہے۔ پھوپھی اماں کی اکیلی نشانی۔ اس سے دستخط کراؤ۔ بس اس پہ ان کے ہوش خطا ہوگئے۔"

وہ داخل ہوئی، بالاقد، چھریرا بدن، گندمی رنگت، ایک لٹ بالکل سفید بر میں سفید ساڑھی۔ میں تو اسے تکتا رہ گیا۔

"اے ہے رک کیوں گئی۔ کوئی غیر تو گھر میں نہین آگیا ہے۔ منن ہے۔ پہچانا نہیں تو نے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "بھیا تم نے بھی اسے نہیں پہچانا میمونہ ہے۔"

میں اتنا ہی کہہ سکا۔ "اچھا کتنی بڑی ہوگئی ہے۔"

"اور کیا اتنی ہی رہتی۔ اس وقت تھوڑا ہی لگتا تھا کہ اتنا قد نکالے گی۔"

"اس وقت تو چھٹنکی تھی۔" میری بات سن کر بڑی بھابی ہنس دیں۔ میمونہ نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

"سکول کو نبٹا آئی؟" پھر رک کر بولیں۔

"اب ذرا باورچی خانہ دیکھو۔ منن میاں بھی آگئے ہیں۔ میرا تو اٹھنے کو جی نہیں

چاہ رہا ہے۔"

میمونہ خاموشی سے باورچی خانے کی طرف مڑ گئی۔

"وہ دونوں شروع سے کراچی ہی میں ہیں۔ تمہارا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہے؟"

"میں تو آپ سے سن رہا ہوں کہ وہ کراچی میں ہیں۔"

"پاکستان جا کے سنا ہے کہ یہی حال ہوا ہے لوگوں کا۔" بڑی بھابی پھر شروع ہو گئیں۔ "یاں سے اکٹھے گئے۔ واں پہ جا کے ایسے تتر بتر ہوئے کہ نہ ایک دوسرے کے مرنے جینے میں شریک نہ دکھ سکھ میں حصہ دار۔ سنیں ہیں کہ شادیئیں بھی وہاں لوگوں نے غیروں ہی میں کی ہیں۔"

"اپنی ٹھیک سے اکھڑنے کے بعد یہی ہوتا ہے۔" چھوٹے میاں نے پھر ایک محاکمہ کیا۔

"ویسے وہ وہاں کیا کر رہے ہیں۔ ان کا پتہ معلوم ہو جائے تو پھر ان سے ملنے کی کوشش کی جائے۔"

"پیارے میاں کو تو تم جانو ہی ہو۔" بڑی بھابی بولیں۔ "اس خدا کے بندے نے زندگی بھر کیا کیا۔ باپ دادا کی کمائی تھی بے دریغ خرچ کیا۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ وہاں بھی یہی کیا۔ کوئی اجاڑنے والی مل گئی ہوگی۔ اسے نہال کر دیا۔ خود اجڑ گئے۔ وہاں تو باپ دادا کی جائیداد نہیں تھی کہ سہارا دیتی۔ اجڑ کے بیٹھ گئے۔ وہ تو یہ کہو کہ اللہ نے ایک پوت دے دیا سنا ہے کہ وہ انجینئر بن گیا ہے۔ بڑھاپے کا سہارا بس وہی ہے۔ باقی رہے اچھے میاں تو وہ شروع ہی سے سیانے تھے۔ پیسہ الغاروں ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ کیچڑ میں بھی کوڑی دکھائی دے جاوے تو دانتوں سے اٹھالیں۔ بھیا آنکھ سے نہیں دیکھا کانوں سنی کہتی ہوں۔ افسروں کو میاں بہت کھلاتے پلاتے ہیں۔ اسی زور پہ ٹھیکے ملتے ہیں۔"

"نیک بخت اس اکیلے کو کیوں نکو بناتی ہو۔ پاکستان میں تو دستور ہی یہ ہے۔"

"ارے میں کسی کو کیا نکو بناؤں گی۔ نکو تو آدمی اپنے کو تکوں سے بنتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ اس نگوڑے آسمان تلے بہت سر اٹھا کر نہیں چلنا چاہئے۔ اب بے دو برس

ادھر دار کے مہینے میں اچھے میاں اپنی دلہن کو لے کر آئے تھے۔ اے بھیا وہ تو زمین پہ قدم نہیں رکھے تھی۔ میں نے کہا کہ واری جاؤں خدا تمہیں موتیوں میں سفید اور سونے میں پیلا رکھے۔ میں تمہاری جیٹھانی ہوں۔ جو کہوں گی تمہارے بھلے کو کہوں گی۔ تمہارے دولہا میاں بہت منتوں مرادوں والے ہیں۔ آٹھویں کی شب بی بی کا سقہ بنا کرتے تھے۔ ہماری ساس نے اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے منت مانی تھی کہ جب اچھا بڑا ہو جاوے گا اور کمانے لگے گا تو آٹھویں کی شب چھوٹے حضرت کی حاضری اسی کی طرف سے ہوا کرے گی۔ سو ماشے اللہ سے اچھے میاں کمانے لگے ہیں۔ تم برس کے برس منی آرڈر کر دیا کرو۔ رہ گئی سقائی تو وہیں شاہ خراسان میں جا کے آٹھویں کی شب کو سقہ بنا دیا کرو۔ اے بھیا، وہ تو بہتے سے اکھڑ گئی۔ تنک کے بولی، ہم رہتے تو ہیں پاکستان میں، حاضری یہاں کریں۔ مولا یہاں بھی ہیں وہاں بھی ہیں۔ حاضری وہاں بھی ہو سکتی ہے۔ میں کال کھاتی منہ سے بات نکال کے چور بن گئی۔ پھر میں نے کوئی بات ہی نہیں کی۔"

بھولو نے دروازے پہ دستک دی۔ "بی بی جی، میں جاؤں؟ منن میاں کو کہیں جانا تو نہیں ہے۔"

"اے ہے، منن میاں کو ذرا دم تو لینے دے۔ اور کمبخت تو کہاں مر گیا تھا۔ آج اتنے دنوں بعد تیری صورت نظر آئی ہے۔ ہاں ہاں تو نے بھی دیکھ لیا کہ اب تو اس ڈیوڑھی پہ خاک اڑے ہے۔ اس کی مٹی لینے میں کے کوڑی کا فائدہ ہے۔"

"نئیں، بی بی جی، یو بات نئیں ہے۔"

"اور کیا بات ہے۔ بھوپت جیتا ہوتا تو ہمارے ساتھ یہی کرتا۔ مگر تیری آنکھ میں تو سوئر کا بال ہے۔ نئے مالکوں نے سبز باغ دکھا دیا ہوگا۔ اب تو تو ان کے گن گائے گا۔"

"بی بی جی مالک گنوان ہو سو ہی گن گائے جاویں ہیں۔ ای او گن ہارنے تو مورے پیچھے ٹکٹکی لگائے رکھی ہے کہ نکلو یاں سے۔ پر میں نے بھی زمین پکڑی ہوئی ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ سیٹھ نے سارے درخت کٹوا دیئے ہیں۔" چھوٹے میاں نے پوچھا۔

"سرکار، وانے تو سگری تھاں کو اوجڑ کر کے رکھ دیا۔ سیٹھ تو بڑا ستیاناسی نکلا۔"

"کیا منصوبہ ہے اس کا۔"

"مل لگاوے گا جی۔"

"سیٹھ سے ہمیں کیا لینا ہے۔" بڑی بھابی بولیں "تو کیا کرے ہے۔"

"میں جی تانگہ چلاؤں ہوں۔ بڑی سرکار والا تانگہ مورے ہی سنگ تو ہے جی۔"

"کس شوق سے میاں جان نے اسے خریدا تھا۔ کیا شان تھی اس کی۔ پر اس میں کتنے دن بیٹھنا انہیں نصیب ہوا۔" بڑی بھابی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"اب بھی چم چم کرتا ہے جی۔ بہت سنبھال کے رکھا ہے میں نے۔"

"کل بس آجانا تانگہ لے کے۔ ذرا عزیزوں رشتہ داروں سے ملنے جائیں گے عزیزوں رشتہ داروں میں اب ہے کون۔ دلہن خالہ، ننھی چچی، مراد علی تایا، اللہ اللہ خیر سلا۔ یہ ہمارے عزیز رہ گئے ہیں۔ کتنا بڑا کنبہ تھا۔ کیسا بکھرا ہے جیسے دانے بکھرتے ہیں۔" بڑی بھابی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"اچھا جی سویرے سویرے آجاؤں گا۔"

بھولو چلا گیا۔

"اب ذرا چل کے باورچی خانے میں دیکھوں۔ بیچاری میمونہ اکیلی لگی ہوئی ہے۔ اس کمبخت گلشن کے جب تک سر پہ کھڑے نہ ہو کام نہیں کرتی اور ہنڈیا کو تو وہ ہاتھ ہی نہیں لگاتی۔"

"میمونہ آپ کے ساتھ رہتی ہے۔" کتنی دیر سے میرے اندر چرخی چل رہی تھی۔ آخر میں نے جھجکتے جھجکتے پوچھ ہی لیا۔

"اور کس کے ساتھ رہتی اس کے کونسے بھنے بھتیجے بیٹھے ہیں۔ جو تھے وہ نو دو گیارہ ہو گئے۔" رکیں۔ پھر بولیں "تم شاید یہ پوچھنے لگے ہو کہ اس کا بیاہ کیوں نہیں ہوا۔ تو بھیا تم پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈالو اور پھر یہ بات پوچھو۔"

"بھئی اس نے ایک سیدھی سی بات پوچھی ہے۔ تم بات کہاں سے کہاں لے گئیں۔" چھوٹے میاں نے ٹوکا۔

"اجی میں نے بھی سیدھا سا ہی جواب دیا ہے۔ ویسے مجھے پھوپھی اماں رہ رہ کے یاد آوے ہیں۔ انہیں اور کیا دیکھنا تھا۔ بس ایک بٹی کو دیکھ دیکھ کے جیویں تھیں۔ اس کے بیاہ کا انہیں کتنا ارمان تھا۔ سارے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔ پہلے کتنی چہکتی تھیں۔ منّن کے جانے کے بعد بس انہیں چپ ہی تو لگ گئی۔ اس کے بعد تو پھر ڈھیتی ہی چلی گئیں۔ انہیں دیکھ کے میاں جان الگ کڑھتے تھے۔ اور انہیں تو دہرا غم تھا۔ ارے یہ بھی تو انہیں خیال بہت ستاوے تھا کہ جس بھتیجے کو انہوں نے اولاد سے بڑھ کر چاہا وہ انہیں بڑھاپے میں کس طرح چھوڑ کر چلا گیا۔ کہا کریں تھے کہ دنیا کیا کہے گی کہ اس شخص پر ایک بھتیجا اتنا بھاری تھا کہ اسے پاکستان ڈھکیل دیا۔ اور اپنی اولاد کو کیسا سنبھال کر رکھا۔ میں نے کہا کہ میاں جان ایسی بات تھی تو جب اس نے پاکستان جانے کی بات کی تھی تو آپ نے اسے گھڑک دیا ہوتا۔ پھر اس کی مجال تھی کہ گھر سے قدم نکالتا۔ ٹھنڈا سانس بھر کے بولے، کیسے گھڑکتا۔ بھائی ہی کی سہی مگر تھی تو پرائی اولاد۔"

"ارے تم کیا پرانا قصہ لے کر بیٹھ گئیں۔" چھوٹے میاں نے انہیں بیچ میں ٹوکا۔ "جواد میاں یہ کیا موقوف ہے۔ وہ تو ایک رو تھی کہ خلقت کو بہائے لئے جا رہی تھی۔ اب سوچو تو حیرانی ہوتی ہے کہ جو گئے وہ کیا سوچ کر گئے تھے اور جو رک گئے وہ کیا سوچ کر رکے رہ گئے۔"

"اے ہے بیچاری بچی" بڑی بھابی کو ایک مرتبہ پھر باورچی خانے کی یاد آئی۔ "اکیلی چولھے پہ جھکی ہوئی ہے۔ تھکی ہاری سکول سے آوے ہے۔ یاں آ کے توے چولھے میں جھک جاوے ہے۔"

"سکول" اب میری سمجھ میں آیا کہ لڑکیاں کیوں قطار در قطار حویلی سے نکل رہی تھیں۔

"ہاں بھیا ہم نے حویلی میں سکول کھول لیا ہے۔" بڑی بھابی نے وضاحت کی۔ "ایک پنتھ دو کاج، ایک تو یہ کہ یہ ران جہان حویلی ہمارے قبضہ میں اب کہاں رہ پاتی۔ حکومت کمبخت ماری بھلا ہمارے پاس چھوڑتی۔ سکول کے کھلنے سے خدا تمہارا بھلا کرے حویلی بھی بچ گئی۔ اور میمونہ کے لئے ایک شغل بھی نکل آیا۔ اب نہ وہ اپنے آپ پہ بھاری ہے نہ ہم پہ بھاری ہے۔ اور منّن میاں کیا بتاؤں، کتنے سلیقہ سے سکول چلا

رہی ہے۔ بس۔"

"بڑی بھابی کھانا لگ گیا ہے۔" میمونہ نے آ کر اعلان کیا اور فوراً ہی واپس چلی گئی۔ بڑی بھابی کا بیان ادھورا ہی رہ گیا۔ سب کھانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

(8)

اب میں اپنے سامان میں آ چکا تھا۔ لگ رہا تھا کہ میرے سارے بکھرے اجزا مجھ سے آن جڑے ہیں معہ مَن کے۔ اور اب میں اکٹھا ہوں اور سالم۔ اس احساس نے مجھے جیسے طمانیت سے بھر دیا ہو۔ بس ایک رات کے اندر اندر یہ کایا کلپ ہوئی تھی۔ پتہ نہیں سوتے میں اندر کونسا عمل چلا تھا یا کسی نے کیا پڑھ کر پھونک دیا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو میں اکٹھا تھا اور شاداب۔ آنکھ کس وقت کھلی، یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ کتنی دیر تک یہ سمجھتا رہا کہ کہیں دور سے جو یہ کوئل کی آواز آ رہی ہے۔ یہ خواب ہے۔ آنکھیں موندے بے ہلے جلے اسی ایک کروٹ پڑا رہا جیسے ذرا کروٹ لی تو کوئل کی آواز گم ہو جائے گی۔ اور خواب تتر بتر ہو جائے گا۔ دور کے کسی درخت کی پھننگ پہ بیٹھی کوئل کو جیسے پتہ چل گیا ہو۔ ایک دم سے چپ ہو گئی۔ تب میں نے آنکھ کھولی اور تب پتہ چلا کہ میں تو جاگ رہا تھا۔ لیٹے لیٹے اوپر دیکھا۔ سکون اور سرور سے بھرا آسمان مجھ پر چھایا ہوا تھا۔ کتنے زمانے بعد میں کھلے آسمان تلے سویا تھا۔ لیٹے لیٹے جتنے آسمان کو اپنی نظروں میں سمیٹ سکتا تھا اتنا سمیٹا۔ آسمان کتنا تازہ نظر آ رہا تھا اور کتنا مانوس۔ ویاس پور کا آسمان جسے میں نے زمانے بعد دیکھا تھا۔

احاطے کے کونے میں کھڑے گھنے نیم پیڑ کے بیچ ایک شور برپا تھا۔ اٹھا اور اٹھ کے نیم کے قریب گیا۔ شور اچانک تھم گیا۔ پھر ایک دم سے غول کا غول چڑیوں کا ٹہنیوں کے بیچ سے بھرا کھا کر نکلا اور دم کے دم میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے اندر

سرور کی ایک دھار بہہ نکلی۔

واپس آ کر سرکنڈوں والے مونڈھے پہ آ بیٹھا۔ سامنے میز پر تھرماس کے برابر رکھی سگریٹ کی ڈبیا اٹھا کر ایک سگریٹ نکالی۔ ہونٹوں میں لگا کر سلگا رہا تھا کہ سامنے کوٹھے کی چھت پر نظر گئی جہاں منڈیر پہ ایک بندر چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ کتنی دیر تک میں بندر کو تکا کیا۔ بندر بھی جیسے منڈیر کے ساتھ چپک کر ساکت ہو گیا ہو۔

ایک کالا کلوٹا لڑکا، بر میں ایک میلا چیکٹ بنیان اور پھٹا پرانا نیکر، ہاتھ میں لمبا سا ڈنڈا، مستعدی سے سیڑھیاں چڑھتا نظر آیا۔ "اے لڑکے، ادھر آؤ۔"

لڑکا اس تحکمانہ آواز سے مرعوب سا ہو گیا۔ قریب آیا۔ چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

"یہ ڈنڈا لے کے کہاں جا رہے ہو۔"

"بندر کو مارن لگا ہوں۔"

"واپس جاؤ۔ بندر کو کچھ نہیں کہنا ہے۔"

لڑکا اس ہدایت پر کتنا حیران ہوا۔ بھلا بندر کو مارنے سے بھی کوئی منع کر سکتا ہے، سوائے اس کے کہ کوئی ہندو ہو۔ واپس برآمدے کی طرف ہو لیا۔ پھر پکارا "بی بی جی وے بندر کو مارن نئیں دیتے۔"

"کون مارن نہیں دیتے۔" میمونہ کی آواز باورچی خانے کی طرف سے آئی۔

"وے جو پاکستان سے آئے ہیں۔"

اتنے میں وہ باہر برآمدے میں نکل آئی تھی۔ دور سے باہر کا جائزہ لیا۔ پھر برآمدے سے نکل کر لان میں آئی۔ رسان سے پوچھا "آپ کو یہ بندر بہت عزیز ہے۔"

"مجھے عزیز ہو یا نہ ہو مگر تمہارا اس نے کیا بگاڑا ہے۔ کوٹھے پہ بیٹھا ہے تمہارا کیا لیتا ہے۔"

"اچھا آپ اس بندر کو بہت بھولا سمجھ رہے ہیں پتہ ہے کل اس نے کیا کیا۔" کوٹھے پہ بیٹھے بندر پہ ایک نظر ڈالی۔ "یہی کمبخت تھا۔ میرا دوپٹہ باہر پڑا رہ گیا تھا۔ میرے فرشتوں کو خبر نہیں کہ کس وقت لے بھاگا۔ وہ تو دینا نے مجھے بتایا۔ میں نے کتنا للچایا، ڈرایا دھمکایا مگر ذرا جو ٹس سے مس ہوا ہو۔ جب تک سارے دوپٹے کی چندی چندی نہیں کر دی اسے چھوڑا نہیں۔"

"آج اس کے لئے کیا نذرانہ رکھا گیا ہے۔"

"میمونہ کو کوئی جواب بن نہ پڑا۔ چپ ہوئی۔ پھر بولی "اچھا آپ نہائیں دھوئیں، میں ناشتہ لگانے لگی ہوں۔"

"اتنی سویرے؟"

"مجھے سکول بھی جانا ہے۔"

"اچھا؟"

"ہاں، جلدی کریں۔"

میں کس سعادت مندی سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف ہولیا۔ دل میں تھوڑا تھوڑا خوش کہ میمونہ دھیرے دھیرے کھلتی جا رہی ہے۔

نہا دھو کر ناشتے کی میز پر آ کر بیٹھا تو کتنا خوش تھا۔ جیسے برس برس کا جما ہوا میل اتر گیا ہو۔ کتنا ہلکا ہلکا اپنے آپ کو محسوس کر رہا تھا۔

"ارے دلبر حسن کا پوت آیا ہے۔ کہاں ہے۔" ننھی تائی اپنی دہری کمر اور سفید چونڈے کے ساتھ دروازے ہی سے ہانکتی پکارتی داخل ہوئیں۔

"ننھی تائی آگئیں۔" بڑی بھابی نے مجھ خبردار کیا اور اٹھ کر آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ "ننھی تائی، آپ نے کیوں زحمت کی۔ مَیں تو خود سلام کرنے آپ کی طرف آ رہا تھا۔ ناشتے میں ذرا دیر ہو گئی۔ اور وہ کمبخت بھولو بھی تانگہ لے کے ابھی تک نہیں آیا ہے۔"

"اری میں نے سنا تو دل تڑپ گیا۔ ارے کدھر ہے۔" میں ڈائننگ روم سے نکل کر برآمدے میں آیا جہاں ننھی تائی تخت پہ اپنی نشست سنبھال چکی تھیں۔ جھک کر سلام کیا۔ ننھی تائی نے بیٹھے بیٹھے سر پہ ہاتھ پھیرا، بلائیں لیں، دعائیں دیں۔ "جیتے رہو، خوش رہو۔" پھر تفصیل سے سر سے پیر تک کا جائزہ لیا اور بولیں "پوت میرے، یہ تم نے اپنا حال کیا بنا رکھا ہے۔ سر میں تو کھچڑی پک رہی ہے۔ کیسے کالے کالے اور گھنے بال ہوا کریں تھے۔"

"ننھی تائی، آپ کس زمانے کی بات کر رہی ہیں۔ اس وقت عمر کیا تھی۔ اب کیا ہے۔"

"اے ہے کونسی زیادہ عمر ہو گئی۔ کل کی تو بات ہے جب اللہ رکھو تم بی اے میں پاس ہوئے تھے اور تمہارے تایا نے اس خوشی میں کنبہ میں لڈو بانٹے تھے۔"

"اری دلہن، اری تیرا کونسا دیور آیا ہے۔"

آواز پہلے آئی۔ دلہن خالہ بعد میں نظر آئیں۔ بڑی بھابی نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ میرے قریب لا کھڑا کیا۔ "منن آیا ہے۔"

"منن؟" دلہن خالہ چکرائیں۔

"اے دلہن خالہ، آپ کو کیا ہو گیا۔ دلبر چاچا کا بیٹا منن۔"

"اچھا اچھا دلبر کا پوت منن۔ اری کیا بتاؤں، میں تو بس اب سٹری بتری ہو گئی ہوں۔ سمجھ پہ پتھر پڑ گئے ہیں۔ ارے میں نے تو اس کا گوموت کیا ہے۔ اے مرے لال، کیسے ہو۔"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"اور اللہ کا سب سے بڑا شکر تو یہ ہے کہ تمہارا ہم گرے پڑوں کو دیکھنے کو جی چاہا۔ برسوں بعد صورت دکھائی ہے۔ مگر شکر ہے کہ صورت دیکھنے دکھانے کا خیال تو آیا۔"

"ہاں بی بی یہ بھی شکر کی بات ہے۔" ننھی تائی بولیں۔ "ایک بخت مارا میرا پوتا ہے۔ جب جانے لگا تو میں نے کہا کہ لال جیسے پیٹھ دکھا رہے ہو ویسے صورت بھی دکھائیو۔ جلدی آئیو۔ بولا، دادی بہت جلدی آؤں گا۔ اور فوج کے ساتھ آؤں گا۔ لو وہ آج تک آ رہا ہے۔"

"اے بوا۔" دلہن خالہ کہنے لگیں "تمہارے پوتے پہ کیا موقوف ہے۔ سب جانے والوں نے یہی کیا۔ میں نے تو اپنی بہو کو لکھ دیا تھا کہ بہو، تم پاکستان میں دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ ہم صرف تمہاری صورت کے بھوکے ہیں۔ جو لال تم میں ٹنکے ہوئے ہیں انہیں نہیں توڑیں گے۔ مگر ذرا جو پسیجی ہو۔ خیر جب اپنی کوکھ کا نکلا پتھر دل ہو گیا تو اس کی کیا شکایت۔ وہ تو پرائی کوکھ کی ہے۔"

انوری بھی سونگھتی سونگھتی آ پہنچی۔ "بڑی بھابی سنا ہے کہ منن آیا ہے۔ تمہیں مبارک ہو۔"

"آ بیٹھ۔ تجھے بھی مبارک ہو۔"

"ارے بھیا اچھے تو ہو۔" رک کر "اکیلے آئے ہو۔"

"جی۔"

"اچھا۔" معنی خیز انداز میں کہا اور چپ ہو گئی۔

انوری نے کہاں کہاں کے قصے سنا ڈالے۔ ننھی تائی اور دلہن خالہ دونوں کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ کتنی بے خبر ہیں کہ برادری کنبہ میں ہونے والی کسی بات کا انہیں پتہ ہی نہیں ہے۔

"سلیمن چچی کا پوت بھی آیا ہوا ہے۔"

"اچھا؟ وہ تو پاکستان چلا گیا تھا۔"

"ارے کوئی آنا چاہے تو پاکستان کسی کو روکتا تھوڑا ہی ہے۔ آٹھ سال پہلے گیا تھا۔ وہاں ماشے اللہ اچھا کما رہا ہے۔ ماں نے لکھا کہ بیٹا ہم نے تمہاری منگنی کر دی ہے۔ اب آ کے شادی کر لو۔ ادھر ماں نے لکھا اور ادھر وہ چھٹی لے کے آ گیا۔"

"یہ اس کی سعادت مندی ہے۔" ننھی تائی بولیں۔

"ننھی تائی۔" انوری کہنے لگی۔ "اس کی سعادت مندی کی تو یہ سن لو کہ آٹھ سال پاکستان میں رہا۔ اور کراچی جیسے نگر میں جہاں کی لڑکیاں ایک حرافہ ہووے ہیں۔ مگر اس بندۂ خدا نے مجال ہے کہ کسی کو آنکھ بھر کے دیکھا ہو۔"

جب سب رخصت ہو گئے تو بڑی بھابی نے انوری کی ایک ایک بات کو یاد کیا اور غصے میں سو سو سنائیں۔ "کیسی چندرا چندرا کے باتیں کر رہی تھی۔ بات کہیں کی اشارہ منی کی طرف۔ وہ بات گئی گزری ہوئی۔ اسے جتانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں بس ضبط کر گئی، نہیں تو ایسی خبر لیتی کہ یاد کرتی۔ اور میں تو کہوں ہوں کہ شرع میں کیا شرم۔ نکاح کے بول پڑھے گئے تھے۔ پھر تمہیں کیا اعتراض ہے۔"

"شبراتی آیا ہے جی۔" دینا نے باہر سے آ کر اطلاع دی۔

"کیا کہوے ہے۔" بڑی بھابی نے اپنا سلسلہ کلام موقوف کر دیا تھا۔

"پاکستان والے میاں جی کو سلام کرنے آیا ہے۔"

"سلام کرنے والے تو چین نہیں لینے دیتے۔ بھیا تم تو کل سو گئے تھے۔ اس کے

بعد جو سلام کرنے والوں کا تانتا بندھا ہے کچھ نہ پوچھو کہ تمہارے چھوٹے میاں کا کیا حال ہوا۔ گلی کے سارے ہی دکاندار، باری باری کرکے آئے۔ بلکہ پچھلی گلی والوں کو بھی جیسے جیسے پتہ چلتا گیا آتے گئے۔ تمہارے چھوٹے میاں نے سب کو یہ کہہ کے رخصت کیا کہ لمبے سفر سے آئے ہیں۔ تھکے ہوئے ہیں، آرام کر رہے ہیں۔ اب یہ متا شبراتی آن ٹپکا۔"

"اچھا بھئی آتا ہوں۔" میں نے دینا کو مطلع کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

تہمد باندھے ہوئے، بر میں ململ کی بنیان، گلے میں تعویذ، ہاتھ میں کوزہ جس پر کاغذ ڈھکا تھا، یہ تھا شبراتی، مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔ "سلام جی، منن میاں۔"

"سلام۔" میں نے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"منن میاں نے مجھے پہچانا نہیں۔" اب شبراتی چھوٹے میاں سے مخاطب تھا جو مونڈھے پہ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دو باری میں مونڈھے پر بیٹھ کر حقہ پینا اور آتے جاتوں سے مخاطب ہو کر باتیں کرنا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ حقہ کی نَے سے منہ اٹھا کر بولے "بھئی یہ شبراتی ہے۔ مولا حلوائی کا بیٹا۔ اپنی اسی گلی میں اس کی دودھ دہی کی دکان ہے۔"

"منن میاں، اتنی جلدی بھول گئے۔ میں تو تمہارا آڑی تھا۔ یاد نئیں ہے ایک بیریو ہوا کہ حلوائیوں والی گلی میں تم نے غلیل چلائی۔ غلہ گڑسل کے پونٹے پہ جا کے لگا۔ گڑسل لوٹ پوٹ ہو گئی۔ رگھو حلوائی نے دیکھ لیا۔ رول مچادی کہ مسلوں نے پنچھی کی اتیا کر دی۔ لو جی میں نے کیا کیا کہ گڑسل کو مٹھی میں دابا، تمہیں بیلچے سے پکڑا اور کشمیروں والی گلی میں سٹک گیا۔ حلوائی سگرے تاپتے رہ گئے۔"

میں حیران ہو کر سنتا رہا۔ کچھ یاد نہ آیا کہ کب ایسا ہوا تھا۔

"لو جی تمہارے لئے ربڑی لایا ہوں۔" شبراتی نے کوزہ میری طرف بڑھا دیا۔

"ربڑی؟ کیسی ربڑی ہے؟"

"لو اور سنو۔ منن میاں پوچھ رئے ہیں کہ کیسی ربڑی۔ ہماری دکان کی ربڑی کی تو اتنی مشہوری ہے کہ باہر سے بھی لوگ اس کی چاٹ میں یاں پہ آوے ہیں۔"

"بھئی لے لو۔" چھوٹے میاں نے حقہ پیتے پیتے کہا۔

میں نے ربڑی کا کوزہ سنبھالا۔ دو چار باتیں کیں۔ پھر شبراتی نے خود ہی رخصت لے لی۔ "دکان اکیلی ہے۔ پھر آؤں گا۔"

کاغذ سے ڈھکا کوزہ لے کر میں اندر گیا۔ میمونہ سکول سے فراغت پا کر آ چکی تھی بلکہ میز پر کھانا بھی چن چکی تھی۔

"کھانا لگ گیا ہے۔" یہ اطلاع دیتے دیتے نظر کوزے پر گئی۔ "یہ کیا ہے۔"

"ربڑی، شبراتی دے گیا ہے۔"

"ربڑی۔" میمونہ بیتاب ہو گئی جیسے اس کے منہ میں پانی بھر آیا ہو۔ "کھانے کے بعد کھائیں گے۔ بہت مزہ آئے گا۔"

کھانا کھاتے کھاتے میں کہنے لگا "یہ ربڑی وہ دوستی میں لے کر آیا تھا۔ کہتا تھا کہ تمہارا پرانا آدمی ہوں۔ کب کب کے قصے سنا رہا تھا۔ مجھے تو ایک بات بھی یاد نہیں آئی۔"

"اسے یاد ہے۔ تمہیں یاد نہیں ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔" میمونہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھے تو اب کوئی بھی بات یاد نہیں ہے۔"

وہ ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "کوئی بھی بات یاد نہیں ہے؟"

"نہیں۔" پھر جیسے میرے لئے اس کا جواز پیش کرنا ضروری تھا۔

"زمانہ بھی تو بہت ہو گیا۔"

"اچھا؟" جیسے اسے دھچکا لگا ہو۔ چپ ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی "ہاں زمانہ بہت گزر گیا ہے۔"

پھر کھانے کے آخر تک اس نے کوئی بات نہیں کی۔

"میمونہ تم نے ربڑی نہیں کھائی۔" بڑی بھابی نے کہا "تمہیں تو ربڑی بہت اچھی لگتی ہے۔"

"بڑی بھابی، پیٹ بہت بھر گیا۔ پھر کھاؤں گی۔"

مردانے کا صحن گرم موسم کے باوجود کتنا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ دینا نے آج یہاں اتنا پانی چھڑکا تھا کہ صحن میں دن کی دھوپ میں جتنی تپش جذب ہوئی تھی سب مرگئی تھی۔ جب میں رات کو یہاں آکر اپنے بستر پہ دراز ہوا تو عجب فرحت کا احساس ہوا۔ ٹھنڈی زمین، اس سے اٹھتی ہوئی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو، چھوٹے میاں کے حقے کی نیند آور گڑگڑاہٹ۔ تاروں بھرا آسمان، لگ رہا تھا کہ جلد ہی سو جاؤں گا اور کل رات والی نیند سے بھی زیادہ گہری نیند سوؤں گا۔ تاروں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں مندنے لگی تھیں۔ غنودگی کی کیفیت تھی۔ بس اسی غنودگی میں شبراتی کی بات کا خیال آیا۔ اور وہ پورا منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ حلوائیوں کی گلی سے گزرتے گزرتے میں نے گڑسلوں کو وہاں کھڑے چھپل پہ شور کرتے دیکھا اور بے ساختہ میرا ہاتھ اپنی غلیل پہ گیا۔ جیب سے غلہ نکال غلیل میں فٹ کرکے جو مارا تو باقی گڑسلیں اڑ گئیں، ایک گڑسل پٹ سے زمین پہ گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ اور اس کے ساتھ آس پاس کی دکانوں سے ایک شور اٹھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ شبراتی نے پھرتی دکھائی۔ پھڑکتی ہوئی گڑسل کو مٹھی میں دبوچا، میرا ہاتھ پکڑا "منن میاں بھاگو۔" کتنی دیر تک ایک گلی سے دوسری گلی میں، دوسری گلی سے تیسری گلی میں بس گلی گلی چکر کاٹتے رہے۔ لگتا تھا کہ گلیوں کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ کیسے نکلے، یہ یاد نہیں آیا۔ ایک یاد سے دوسری یاد، دوسری یاد سے تیسری یاد، میں پھر گلیوں کے جال میں تھا۔ یادیں بھی گلیاں ہوتی ہیں۔ نیند آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں گلیوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

ناشتے کی میز پر میں پچھلی صبح کی طرح تازہ دم آکر بیٹھا۔ مگر ناشتہ کرتے کرتے جب مجھے رات کا خیال آیا تو دم بھر کے لئے تعجب ہوا۔ "عجیب بات ہے۔"

"کیوں کیا ہوا۔" میمونہ نے سوال کیا۔

"رات مجھے نیند ہی نہیں آئی۔"

"رات گرمی بھی تو بہت تھی۔"

"گرمی؟ نہیں گرمی تو ایسی نہیں تھی۔ اچھی خاصی خنکی تھی۔"

"تو پھر یہ سمجھ لیجئے کہ اب یہ جگہ آپ کے لئے نئی جگہ ہے۔ نئی جگہ پر نیند مشکل سے آتی ہے۔ ایک دو راتیں تو اس طرح گزرنی ہی چاہئیں۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ کل یہاں مجھے پہلی رات تھی اور میں لیٹتے ہی سو گیا۔ اور جب صبح اٹھا تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ زمانے بعد مجھے پوری نیند آئی ہے۔"

"پھر کیا بات ہوئی۔"

"بس ہوا یہ کہ سونے لگا تھا کہ دھیان اچٹ گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر؟"

"شبراتی کی بات کا دھیان آیا۔ گزری بسری باتیں یاد آتی چلی گئیں۔"

"آپ تو کہتے تھے کہ مجھے پچھلی کوئی بات یاد ہی نہیں ہے۔ رات رات میں یہ کیا انقلاب آ گیا۔"

"میرے ساتھ یہی ہوتا ہے، لگتا ہے کہ مجھے پچھلی کوئی بات یاد نہیں ہے۔ مگر کسی کسی وقت یادیں اس طرح امنڈتی ہیں کہ میں ان میں بہتا چلا جاتا ہوں۔"

"اچھی عادت ہے آپ کی۔" وہ مسکرائی کتنا اطمینان تھا اس کی مسکراہٹ میں۔

"پتہ ہے جب میں یہاں آیا ہوں تو میرے ساتھ کیا ہوا؟"

"کیا؟"

"میں تو اپنے پرانے حساب سے سیدھا دلکشا گیا تھا۔ وہاں کچھ بچا ہی نہیں۔ بس ایک عمارت کا ملبہ پڑا تھا۔ بس ایک دم سے میرا ذہن بھی چٹیل میدان بن گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ دلکشا کو اس کے مکینوں اس کے درختوں پرندوں کے ساتھ تصور میں لاؤں۔ مگر میرا تصور مجھے جواب دے گیا۔ بے تکے طور پر وہاں گھومتا پھرتا رہا۔ پھر جب دھرم شالا کی نئی عمارت کو میں نے دیکھا تو ایک دم سے میں چونکا اور ایک دم سے دھرم شالا کی وہ پرانی عمارت جو ہمیں خالی چہار دیواری نظر آتی تھی۔ میری نظروں

میں گھوم گئی۔ اور کس تفصیل کے ساتھ مجھے واقعات یاد آئے۔ میمونہ تمہیں یاد ہے ایک دفعہ تم نے وہاں کھڑے ہوئے اونچے پیپل پہ لنگور دیکھا تھا اور پھر ہم لنگور دیکھنے کے شوق میں اس طرف چلے تھے۔ رستے میں ہم نے دیکھا کہ ایک سانپ------- یاد آیا۔" "نہیں۔"

"نہیں۔ تمہیں یاد نہیں؟ تعجب ہے؟" مجھے کتنا تعجب ہوا۔

ادھر میمونہ جیسے یادوں میں کھو گئی ہو۔ لیکن جھرجھری لی۔ "ہاں یاد ہے۔" پھر چپ ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی "عجیب بات ہے۔ لنگور کو میں نے اس کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا۔"

"بس اس یاد نے دلکشا کی ساری یادوں کو میرے اندر زندہ کر دیا۔ کتنا کچھ یاد آگیا ایک دم سے۔"

"منن۔" میمونہ ابھی تک اسی یاد میں اٹکی ہوئی تھی۔

"ہاں۔" میں نے تعجب سے میمونہ کو دیکھا جس نے میری آمد کے بعد پہلی مرتبہ میرے بچپن والا نام لے کر مجھے مخاطب کیا تھا اور کتنی اپنائیت کے لہجہ میں۔

"کتنا لمبا سانپ تھا وہ۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ اگر وہ کہیں ہمیں کاٹ لیتا۔"

"پھر کیا ہوتا، ہم مرجاتے۔" میں نے سادگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے جیسے سنا ہی نہ ہو "منن۔" اس کے لہجہ میں کتنی حیرت اور کتنا ڈر سمایا ہوا تھا۔

"ہوں۔"

"اس دھرم شالا میں کیا تھا۔ کوئی کبھی اس کے اندر آتا جاتا تو نظر آتا نہیں تھا۔ باہر سے بس پیپل کے درخت دکھائی دیتے تھے۔"

"یا لنگور؟" میں نے مسکراتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔

وہ بھی ہنس پڑی "وہ بھی بس ایک ہی مرتبہ دکھائی دیا تھا۔"

(9)

آج صبح ہی سے گھٹائیں امنڈ رہی تھیں۔ بڑی بھابی نے آسمان پر ایک اڑتی سی نظر ڈالی اور فیصلہ سنا دیا "تلا کھڑا ہے۔ ٹوٹ کے برسے گا" پھر ناشتہ کرتے کرتے بولیں "آج تو کڑھائی کا دن ہے۔ پتہ نہیں گھر میں بیسن ہے بھی یا نہیں"

"بیسن" میمونہ بولی۔ "بیسن تو گھر میں کوئی نہیں ہے۔ جو تھا اس کی میں نے پچھلے جمعہ کو کھنڈویاں بنالی تھیں" "پھر منگانا پڑے گا"

میمونہ جلدی جلدی ناشتہ کر کے اپنے سکول چلی گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں آ بھی گئی۔

"ارے تم تو واپس آگئیں" میں اسے واپس آتے دیکھ کر کتنا خوش ہوا تھا

"میں نے سوچا کہ آج چھٹی کرو"

"کس خوشی میں؟"

"برکھا کی خوشی میں سوچا کہ تمہیں اپنے ہاتھ کی پھلکیاں کھلاتی ہوں اور ہاں اروی کے پتے بھی تو رکھے ہیں۔ کیا یاد کرو گے تم"

"شکریہ" میں مسکرا دیا

اصل میں اب ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف ہو چلے تھے۔ دیکھتے دیکھتے آپس میں کتنے گھل مل گئے تھے۔ کہ میں نے اپنے سارے دکھ سکھ پاکستان کے ایام کی ساری کہانی اسے سنا دی اور اس نے بھی کرید کرید کے ایک ایک بات مجھ سے پوچھی شادی کیسے کی۔ بیوی کیسی تھی کیا اسے بیماری ہوئی کیسے دنیا سے گئی۔ یہ مجھ سے کسی نے پوچھا بھی نہیں تھا اور میں نے بتایا بھی نہیں تھا اور اگر کوئی پوچھتا بھی تو میں بس

واقعہ کی حد تک ہی بتاتا۔ مگر میمونہ نے کتنی اپنائیت کے ساتھ پوچھا کہ میں نے پوری قلبی کیفیت کے ساتھ ایک ایک تفصیل اسے سنائی "بس ایک لڑکا ہے؟"

"ہاں"

"اسے تم نے امریکہ بھیج دیا۔ اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا"" بات یہ ہے میمونہ پاکستان میں بیٹے اپنے باپوں کے ساتھ وہی کر رہے ہیں جو ان باپوں نے اپنے باپوں کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے باپوں سے منہ موڑ کر پاکستان کی راہ پکڑی تھی اب ان کے بیٹے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر امریکہ کی طرف بھاگ رہے ہیں"۔

دھیرے دھیرے کر کے میں نے اپنی ساری ہی رام کہانی اسے سنا ڈالی اور اس نے کتنی دردمندی اور کتنی یکسوئی سے ساری رام کہانی سنی۔ اس کے بعد میں کتنا ہلکا ہو گیا تھا۔ دل پر برسوں سے جو ایک بوجھ سا تھا اور جو وقت کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اتر گیا اب تک مجھے کوئی ایسا ملا ہی نہیں تھا۔ کہ دردمندی سے میری رام کہانی سنتا۔ یہاں آیا تو بڑی بھابی اور چھوٹے میاں نے بھی سرسری مرحومہ کے متعلق اور بیٹے کے بارے میں پوچھا اور میرے رسمی جواب سے مطمئن ہو گئے پوچھنا اور سننا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو میمونہ کے سلوک سے پتہ چلا۔ تو اب میں ہلکا تھا۔ اور میمونہ کے یہاں بھی اگر میری طرف سے کوئی دل گرفتگی تھی تو وہ غیر محسوس طور پر دور ہو گئی تھی اب ہم ایک دوسرے سے کتنے قریب آ گئے تھے کس انہماک سے وہ اروی کے پتے بیسن میں لپیٹ لپیٹ کر تل رہی تھی اور کس شوق سے میں کھا رہا تھا کتنے زمانے کے بعد زبان کا ذائقہ واپس آیا تھا۔ خود کھا رہا تھا اور بھابھی کو ساتھ کھانے پر مجبور کر رہا تھا۔

"ارے بھیا کیا پوچھو ہو، نہ ہم وہ رہے نہ برساتیں وہ رہیں۔" بڑی بھابھی کھا کم رہی تھیں بیتی برساتوں کو زیادہ یاد کر رہی تھیں۔ "ساون کے ساتھ کڑھائی چڑھے تھی اور بھادوں تک چڑھی ہی رہوے تھی۔ مینہ بھی کمبخت چھاجوں برسے تھا۔ اور پکوان بھی اسی حساب سے پکے تھا۔ کھانے والے بھی تو کتنے تھے۔ اور روز نئی سے نئی فرمائشیں" بڑی بھابھی بولتے بولتے چپ ہو گئیں لمبا ٹھنڈا سانس لیا۔ پھر افسردگی لہجہ میں گھری ہو گئی "وہ زمانے ہی گذر گئے اب تو یہ حال ہے کہ مینہ برستا رہتا ہے اور میں ٹھنڈے چولہے کو دیکھتی رہتی ہوں۔ پتہ نہیں آج میمونہ کو کہاں سے کڑھائی کا خیال

آگیا" رئیس پھر بولیں "برساتیں بھی بخت ماری ویسی نہیں رہیں۔ کیسا جھکا لگتا تھا کہ پورا پورا ہفتہ گذر جاتا اور سورج کی صورت نظر نہیں آوے تھی۔ ارے ایک دفعہ تو ایسی جھڑی لگی کہ پندھرواڑہ بیت گیا۔ اور کمبخت مارا مینہ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا۔ کبھی پھوئیاں پھوئیاں، کبھی رم جھم کبھی دھڑاکے کے ساتھ۔ پھوپھی اماں نے کیا کیا کہ بی بی کے نام کی تسبیح درخت میں لٹکا دی۔ اے لو دن ڈھلتے ڈھلتے دھنک نکل آئی کہ آسمان کے اس کنارے سے اس کنارے تک پوری کمان۔"

"میمونہ تمہیں یاد ہے" مجھے بھی ایک برسات یاد آگئی تھی "جب ایک دفعہ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں ہم بھونڑ میں بڑھیاں پکڑتے پھر رہے تھے۔ ایک دم سے گھٹا امنڈ کے آئی اور ایسی بری کہ بھونڑ دیکھتے دیکھتے تکیا بن گئی۔ کن مشکلوں سے بھوپت نے ہمیں وہاں سے نکالا تھا۔"

"اور منی تمہیں یاد ہے" میمونہ کو بھی ایک برسات یاد آگئی "جب دلکشا والے باغ میں جو پرانا نیم تھا نا اس پر بجلی گری تھی۔ لگا تھا جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ نیم کے پرخچے اڑ گئے۔ بھوپت بتاتا تھا کہ اصل میں اس وقت اس نیم پر ناگ نکلا ہوا تھا۔ بجلی اس پر گری تھی"۔

بس پھر ہمیں بیتی برساتیں یاد آتی چلی گئیں۔ بڑی بھابھی نے شاید محسوس کیا کہ یہ ہماری ساجھے کی برساتیں ہیں جن میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو فالتو جانا اور آہستہ سے اٹھ کر چلی گئیں۔

ایک برسات، دوسری برسات، تیسری برسات، ایک دم سے ہمیں کتنی برساتیں اکٹھی یاد آگئی تھیں، جیسے گہری گھٹا امنڈ آئی ہو۔ یادوں کی گھٹا بھی کتنی ظالم گھٹا ہوتی ہے۔ ہم جیسے پھر سے بچے بن گئے ہوں۔ میمونہ اور منی، ایک دوسرے کی انگلی پکڑے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ اس دن کتنی بارش ہوئی تھی آنگن میں ندی امنڈی ہوئی تھی۔ دونوں برآمدے میں بیٹھے بنتے بگڑتے بلبلوں کو گن رہے تھے۔ بوندوں کے بیچ اچانک کوئی بلبلہ ابھرتا اور تیزی سے دوڑتا چلا جاتا "ارے ارے وہ دیکھو صاحب کا ٹوپ جا رہا ہے" وہ خوشی سے چلاتی اور اس دم بلبلہ اچانک سے پھٹ جاتا۔ پھر دوسرا ٹوپ پھر تیسرا ٹوپ اور پھر دونوں نے اپنی اپنی ناؤ چھوڑی۔ کاغذ کی دو ناویں کس تیزی

سے بہتی چلی جا رہی تھیں۔ میمونہ نے خوشی سے تالی بجانی شروع کر دی "آہا میری ناؤ آگے جا رہی ہے۔ منن کھسیانا ہو چلا تھا کہ میمونہ کی ناؤ بھی زد میں آ گئی۔ آنگن کے بیچ ایک بڑی سی اینٹ پڑی تھی ناؤ اس سے ٹکرا کر رک گئی اور پھر بھیگ کر کھلنے لگی۔ اب تالی بجانے کی منن کی باری تھی۔ منن کی ناؤ ڈولتی چلی جا رہی تھی۔ میمونہ روہانسی ہو گئی تھی۔ منن خوش تھا مگر تھوڑا آگے جا کر منن کی ناؤ آموں سے بھرے ناند سے جو بیچ آنگن میں رکھا تھا ٹکرائی اور فوراً ہی اس کے جوڑ جوڑ کھل گئے۔ آگے پیچھے دونوں ناویں ڈوب گئیں مگر منن نے تو فوراً اپنی توجہ ہٹانے کا اہتمام کر لیا۔ اپنی چکئی نکال گھمانی شروع کر دی کس تیزی سے چکئی اس کی انگلیوں کے بیچ سے نکل کر گھرر گھرر کرتی ہوئی اور ڈور کی حد تک پہنچ کر اسی تیزی سے مٹھی میں آ جاتی۔ میمونہ دیکھتی رہی دیکھتی رہی۔ پھر اس نے جواب میں اپنی لال پیلی پھرکنی نکالی اور گھمانی شروع کر دی منن جو بھی کرتا اس کے جواب میں میمونہ کو بھی کچھ کرنا ہوتا تھا۔ وہ دن جب منن بازار سے اچھا سا ٹیسو خرید کے لایا۔ میمونہ مچل گئی، میں بھی ٹیسو لوں گی۔ پھوپھی اماں نے ڈانٹا "باولی ہوئی ہے۔ ٹیسو لڑکیوں کے لئے تھوڑا ہی ہووے ہے۔ لڑکیاں تو جھانجی لے کے نکلیں ہیں۔"

تو میمونہ کیلئے جھانجی آ گئی مٹی کی لٹیا۔ اسکے گرداگرد آنکھ کی شکل کے سوراخ سوراخوں پر سبز سرخ پتنگیا کاغذ منڈھا ہوا۔ اندر دیولا ٹمٹماتا ہوا لوجی جھانجی میں پیسے پڑنے شروع ہو گئے۔ "واہ بیٹا مفت کے پیسے بٹور رہی ہو جھانجی کا گیت تو گا کے سناؤ۔"

جھانجی کا گیت اسے یاد ہوتا تو سناتی۔ منن نے تو ٹیسو کا گیت فوراً ہی سنا ڈالا

میرا ٹیسو یہیں اڑا
کھانے کو مانگے دہی بڑا
دہی بڑے میں پنّی
دھر دے مائی اٹھنی

"پھوپھی اماں، یہ ٹیسو جھانجی کا کیا بکھیڑا تھا۔" شاید بڑی بھابھی نے پوچھا تھا۔ پھوپھی اماں فوراً ہی شروع ہو گئیں۔ "ارے وہ ناس پیٹا گندھاری کا جنا، پانڈوؤں کی چلنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ کنھیا جی نے جھانجی بنا کے اس کا بیاہ اس سے کر دیا کہ اس کا

دھیان بٹ جاوے۔"

"ہائے اللہ"

"اے بی یہ سب ہندوانی باتیں ہیں۔ اللہ جانے اس میں کتنا سچ ہے کتنا جھوٹ ہے عذاب ثواب ہندوؤں کی گردن پہ۔ ہم نے تو جو سنا وہ سنا دیا۔ یہ بھی کہوے ہیں کہ جھانجی اصل میں ٹیسو کی جورو تھی۔"

"پھوپھی اماں، سچ کہو۔"

"اے بی میں کیا جانوں۔ ہندوؤں کی کہی سناؤں ہوں۔ ویسے ایک بات تو ہے اس کلموئے ٹیسو کو کون اپنی بیٹی دیتا۔ کنھیا جی نے اتنا احسان تو اس پر کیا کہ ایک گڑیا سی کنیا بنا کے اس کے حوالے کر دی کہ لو میاں گڈے گڑیا کو سنکھواؤ۔"

میمونہ نے فوراً ہی الاپنا شروع کر دیا۔

گاجر کی پینڈی گلنچو کا پھول

لو میاں گڈے تمہیں گڑیا قبول

"بارش تیز ہو گئی۔"

"کیا۔" میں چونک پڑا۔ میمونہ نے تیز ہوتی بارش کو دیکھ کر ایک اڑتا سا فقرہ کہا۔ اور ادھر یادوں کی بدلیاں تتر بتر ہو گئیں۔

بارش واقعی تیز ہو گئی تھی۔ پہلے سیدھی برس رہی تھی۔ پھر ترچھی برسنے لگی۔ اور اب دھواں دھار والے مرحلہ سے گزر کر اس کی رفتار میں ایک توازن بھی آ چلا تھا۔ تیزی کم، شور بھی کم۔ مگر تواتر کچھ اس قسم کا تھا کہ جیسے ایک زمانے سے یہ مینہ برس رہا ہے اور ایک زمانے تک برستا رہے گا۔ کتنی دیر تک کس انہماک سے ہم دونوں اس ترچھے مینہ کو تکتے رہے کتنی دیر تک یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ مینہ کا رخ بدل کر ہماری طرف ہو گیا ہے۔

بس وہ ایک دم سے چونکی "بوچھار آ رہی ہے۔" اپنا مونڈھا پیچھے سرکاتے ہوئے مجھے ہدایت کی "مُنی، تم بھیگ رہے ہو۔ مونڈھا اندر سرکا لو۔"

"نہیں۔"

"نہیں؟" میمونہ نے مجھے تعجب سے دیکھا "بوچھار تیز ہے۔ سارے کپڑے تر

بتر ہو جائیں گے۔"

"بیشک ہو جائیں۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔ پھر وضاحت کی میمونہ تمہیں یاد نہیں ہے۔ مجھے بارش میں بھیگنے کا، نہانے کا کتنا شوق تھا۔"

"تو تمہارا بچپنا ابھی گیا نہیں ہے؟"

اس فقرے نے مجھے افسردہ کردیا۔ "کاش اس بچپنے کو میں بچا کر رکھ سکتا۔" یہ کہتے کہتے میری نظریں سامنے صحن میں کھڑے بارش میں بھیگتے نیم پر گئیں اور جمی کی جمی رہ گئیں۔ جیسے یہاں کے آنے کے بعد پہلی مرتبہ اسے دیکھ رہا ہوں۔ کتنے سکون سے کھڑا بھیگ رہا تھا۔ جیسے یہی سکون اس سے پھوٹ کر پوری فضا میں سرایت کر گیا ہو، برستی ہوئی بارش میں بھی ورنہ جب وہ شروع ہوئی تھی تو اس میں ایک اضطراب کی کیفیت تھی اور اسی حساب سے پوری فضا میں ایک کھلبلی مچ گئی تھی۔ مگر اب بارش میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ ایک ہی رفتار کے ساتھ ہوئے چلی جارہی تھی۔ پیڑ، پودے، دیواریں، منڈیریں سب بوندوں میں شرابور، جیسے تشنگی مٹ چکی ہو اور اب سب آسودہ ہوں۔ اور نیم پر تو ایک سپردگی کا عالم تھا۔ بالکل وہی عالم۔ زمانے پہلے کا نقشہ ایک دم سے آنکھوں میں پھر گیا۔ جب آندھی اٹھتی تھی تو پورا نیم ہل جاتا تھا۔ ٹہنیوں کے بیچ کھلبلی مچ جاتی تھی۔ گرج، چمک، پھر دھڑاکے سے مینہ برسنا شروع ہو جاتا۔ آندھی تھمتی چلی جاتی۔ لگاتار برستی بوندوں میں شرابور ہو کر ٹہنیاں بھی شانت ہوتی چلی جاتیں۔ اور پھر نیم پر ایک سپردگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ نیم پر، بھرپوری فضا پر۔

"میمونہ، نیم کو دیکھ رہی ہو۔"

"ہاں دیکھ تو رہی ہوں۔ پھر؟"

"میں نے تو اسے ابھی تک دیکھا ہی نہیں تھا.......... ویسا کا ویسا ہی ہے۔" اور یہ کہتے کہتے میں حیرانی میں ڈوب گیا۔ اس زمانے میں بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ یہاں دو ہی تو بزرگ تھے۔ دادا میاں اور نیم۔ جیسے دونوں ہم عمر ہوں۔ مگر دادا میاں کی کمر جھکتی چلی گئی۔ بال پہلے ہی برف ہو چکے تھے۔ پھر ایک دن آنکھیں مند گئیں۔ اس روز یہ نیم کتنا مغموم نظر آرہا تھا۔ اکیلا رہ گیا تھا نا۔ مگر پھر اسی طرح شاداں اور فرحاں۔ ہم دونوں تو بس اس کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے تھے، جیسے اسی کا حصہ ہوں، جیسے

میمونہ اس کے تنے سے نکلی ہو' دھیرے دھیرے اور میں جیسے اس کی ٹہنیوں میں سے ایک ٹہنی۔ مگر' میں نے سوچا' باقی ٹہنیاں تو ابھی تک ہری بھری ہیں۔ بالکل پہلے کی طرح۔ اداس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مرتبہ پھر مجھے حیرانی نے آلیا۔ بالکل ویسا کا ویسا ہی ہے۔ کمال ہے۔ ہم بدل جاتے ہیں' درخت نہیں بدلتے۔ ہمارا نیم ویسا کا ویسا ہی ہے۔ ہاں اب-------۔ اور اس کے ساتھ کتنے نقشے کب کب کے میرے تصور میں گھوم گئے۔ جب اس کے موٹے گدے میں جھولا پڑتا تھا۔ میمونہ کتنا لمبا جھونٹا لیتی تھی کہ اس کا سر بکھرتے بالوں کے ساتھ اونچی ٹہنیوں کو جا چھوتا۔ مگر میمونہ بس جھولا ہی جھول سکتی تھی' لمبے جھونٹے لے سکتی تھی۔ نیم پر چڑھ نہیں سکتی تھی۔ خیر زیادہ اونچا تو میں بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔ مگر اس کے نیچے والے گدے تک تو پہنچ ہی سکتا تھا۔ کتنا مزہ آتا تھا اس گدے پر بیٹھنے میں' جیسے ہم زمین سے بلند ہو گئے ہیں اور نیم کا حصہ بن گئے ہیں۔ ٹہنیوں میں سے ایک ٹہنی۔ اس وقت میمونہ کتنی تلملاتی تھی۔ مگر میری اس میں کیا خطا تھی۔ میں اسے روکتا تھوڑا ہی تھا۔ بلکہ میں تو اسے سہارا دے کر اوپر چڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ ہی پھسل پھسل جاتی تھی۔ پھر بھی میں اسے سہارا دے کر چڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔ عجب سی لذت کا احساس ہوتا تھا۔ محض چھو لینے سے اور اس کوشش میں تو------ کتنے ایسے موقعے یکایک دھیان میں ابھر آئے۔ اور کسی کسی دفعہ تو وہ میرے سہارا دیتے دیتے ایسا پھسلتی تھی کہ------- دھیان میں لاتے لاتے میں خود ہی جھینپ گیا۔ پتہ نہیں' میں نے سوچا' میمونہ کو بھی یہ سب کچھ یاد ہے یا نہیں۔ یاد ہونا تو چاہئے۔

"میمونہ۔" آخر میں نے ہمت کی "یہ نیم بالکل بھی تو نہیں بدلا------ میرا مطلب ہے کہ جب ہم-------" میں کچھ کہتے کہتے جھجک گیا۔ پتہ نہیں میمونہ کو کچھ یاد آیا بھی یا نہیں۔ ہوں کر کے چپ ہو گئی۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا "میمونہ تمہیں بھی تو ایک شوق تھا۔"

"کونسا شوق؟"

"جھولا جھولنے اور ساونی گانے کا شوق۔"

"ہاں۔" میمونہ اب کے واقعی افسردہ ہو گئی۔ لیکن بس ہاں کہہ کر چپ ہو گئی۔

"کڑھائی تو چڑھی، جھولا نہیں پڑا۔ برسات آدھی منائی گئی۔"

"یہ لڑکیوں کا شوق ہوتا ہے۔ تمہیں اس گھر میں کوئی لڑکی نظر آتی ہے۔"

"تمہارے شوق کو کیا ہوا؟"

"تم میری عمر کو دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں، کیا ہوا تمہاری عمر کو؟"

وہ سٹپٹا کر چپ ہو گئی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور اندر چلی گئی۔ مینہ اسی ایک رفتار سے برسے جا رہا تھا اسی اپنے ترچھے انداز میں۔ میں واقعی تربتر ہو چکا تھا۔ مگر مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ سامنے صحن میں ندی امنڈی ہوئی تھی۔ بوندیں ایسے گر رہی تھیں جیسے ابلتے تیل میں پھلکیاں۔ کوئی کوئی بوند اس طرح پڑتی کہ پھول کر ٹوپ کی شکل بن جاتی۔ ٹوپ تیرتا چلا جاتا، پھر پھٹ جاتا۔ ایک ٹوپ، دوسرا ٹوپ، تیسرا ٹوپ، بنتے بگڑتے پانی کے ٹوپ۔ بارش ہوئے چلے جا رہی تھی اور میں بھیگتا چلا جا رہا تھا۔ شرابور ہو چکا تھا۔ اصل میں بارش میرے اندر بھی تو ہو رہی تھی۔ اندر جمی ہوئی گرد سب دھل دھلا گئی تھی۔ دھل دھلا کر ایک نیا آپا اندر سے نکل آیا تھا۔ یا شاید پرانا آپا نکھر کر ابھر آیا تھا۔ بس میں اپنے آپ کو اجلا اجلا محسوس کر رہا تھا جیسے اندر سے دھل گیا ہوں۔

وہ واپس آئی "منی، تم بالکل بھیگ چکے ہو۔ باتھ روم میں، میں نے پاجامہ کمربند ڈال کر اور کرتا ٹانگ دیا ہے۔ جا کر نہاؤ اور لباس بدلو"۔

میں بردباری سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف ہو لیا۔ نہا دھو کر اجلا کرتا پاجامہ پہن کر باہر نکلا تو دیکھا کہ بارش رک چکی ہے اور میمونہ مونڈھے پہ بیٹھی پت نالے سے گرتے موتی جیسے پانی کو یکسوئی سے تکے جا رہی ہے۔ میں مونڈھا کھسکا کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ پت نالے سے پانی پہلے بہت تیز گر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ تیزی قدرے کم ہوئی اور دھار بھی موٹی سے پتلی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور یہ دھار جب کھرنجے میں گرتی تھی تو لگتا تھا کہ پگھلی ہوئی چاندی بکھر رہی ہے۔

سامنے والی منڈیر پر اچانک ایک گرسل اتری۔ ایک پھریری لی، پروں کو پھڑپھڑایا اور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک دوسری گرسل اڑ کر آئی اور اترتے ہی اس نے بھی زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ [illegible]

شور مچایا اور ایکا ایکی پھر سے اڑ گئیں۔

"میمونہ، تم نے سنا انہوں نے آپس میں کیا کہا اور کیوں اڑ گئیں۔"

"تم نے سنا ہو گا۔ تمہیں معلوم ہو گا۔"

"پہلے جو گزرسل آئی تھی، وہ اصل میں نر تھا۔ اس نے پکار کر کہا کہ جانم، بارش رک گئی ہے۔ باہر نکلو۔ ذرا سیر کو چلتے ہیں۔ دوسری یہ آواز سن کر پردے سے برآمد ہوئی۔ خوش ہو کر بولی کہ ارے واہ واہ بہت اچھا موسم ہے۔ سیر میں بہت مزہ آئے گا اور دونوں سیر پر نکل گئے۔"

میمونہ کھلکھلا کر ہنسی۔

مگر اب میری نظریں منڈیر سے پھسل کر پوری دیوار کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ کائی لگی دیوار دھل کر کتنی چمک اٹھی تھی۔

"میمونہ، یہ سامنے والی دیوار کو دیکھ رہی ہو، کتنی کالی ہو گئی ہے۔ اور بیچ بیچ میں سبز کائی کیسی جھلک رہی ہے۔"

"ہاں واقعی۔" اور وہ ایسے دیکھنے لگی جیسے وہ پہلی مرتبہ اس دیوار کو دیکھ رہی ہے۔

"اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس حویلی نے کتنی برساتیں دیکھی ہیں۔ برساتیں ہم سے پہلے بھی آئی ہوں گی جو ہمارے بڑوں نے دیکھی ہوں گی۔ مگر ہم نے بھی ان برسوں میں جب میں ابھی یہیں تھا کتنی برساتیں دیکھ لیں۔ لگتا ہے کہ پورا زمانہ ہم نے جیا ہے، برساتوں کی ایک پوری صدی------ ہاں پوری صدی------ اگلی برساتیں آنے والے دیکھیں گے۔"

"آنے والے؟" میمونہ نے مجھے تیز نظروں سے دیکھا۔ لہجہ میں ایک ہلکی تلخی آ گئی۔ "کون آنے والے۔ سب تو چلے گئے۔"

میں چپ ہی تو ہو گیا، جیسے مجرم جرم کا احساس دلائے جانے پر چپ ہو جائے۔ کتنی دیر تک چپ بیٹھا رہا۔ میمونہ سے آنکھیں ملانے کی اور بات کرنے کی اب مجھ میں ہمت کہاں رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں پھر پڑنے لگی تھیں۔ پھر ہلکی سے تیز ہوتی گئیں۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ اپنی پرانی حویلی اپنی آخری برسات دیکھ رہی ہے۔

(10)

بڑی بھابی کا سروطہ اور زبان دونوں ہی اس دن کچھ زیادہ رواں تھے۔ کب لب کے قصے کہاں کہاں کی باتیں، جیسے حافظہ کے سارے دریچے کھل گئے ہوں۔ ویسے ان چند دنوں میں وہ اتنا کچھ سنا چکی تھیں کہ میرے جانے کے بعد سے اب تک خاندان جن مراحل سے گزرا تھا وہ سب اپنی تفصیلات کے ساتھ میری معلومات کا حصہ بن چکے تھے۔ خیر اپنے جانے کے بعد کے حالات سے تو میں بے خبر تھا ہی مگر اب پتہ چلا کہ اس سے پہلے کی خاندان کی تاریخ سے بھی میں اتنا باخبر نہیں تھا جتنا اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔ بس میں خبر اور بے خبری کے دوراہے پر تھا کہ یہاں سے چلا گیا۔ خاندان کی تاریخ کبھی اپنے کسی فرد پر اکٹھی منکشف نہیں ہوتی۔ بے شعوری سے شعور کی منزل کی طرف اور شعور کی منزل سے ذہنی پختگی کی طرف سفر کرتے ہوئے بڑے بوڑھوں کی باتیں کانوں میں پڑتی رہتی ہیں اور غیر محسوس طور پر اور بے ارادہ خاندان کی تاریخ شعور میں پیوست ہوتی چلی جاتی ہے۔ پتہ چلا کہ کتنی باتیں تھیں جن کا مجھے کوئی پتہ نہیں تھا۔ مثلاً جب سے میں نے ہوش سنبھالا پھوپھی اماں کو گھر میں براجمان دیکھا۔ کیا ان کا رعب داب تھا۔ تائی اماں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔ آخر دو صاحب حیثیت بھائیوں کی بہن تھیں۔ ایک کو چھوٹی بہن کی حیثیت سے عزیز تھیں۔ دوسرے پر بڑی بہن کی حیثیت سے رعب رکھتی تھیں۔ دلکشا کے چھوٹے بڑے ان کا لوہا مانتے تھے۔ باورچی خانے میں انہیں کا حکم چلتا تھا۔ مگر نہ میں نے کبھی سوچا نہ ویسے پتہ چلا کہ جب پھوپھا زندہ و سلامت

ہیں اور اپنے قصبہ میں ایک حیثیت کے مالک ہیں تو پھر پھوپھی اماں د لکشا میں کیوں براجی ہوئی ہیں۔ لڑائی بھی نہیں تھی۔ لڑائی ہوتی تو برسات کے برسات ان کی طرف سے آم کی پیٹیاں کیوں آتیں اور جاڑوں میں گنوں کی پھاندیاں اور گنے کے رس کے گھڑے کیوں آیا کرتے۔ ہاں خود کبھی نہیں آتے تھے۔ میں نے انہیں بس ایک ہی دفعہ دیکھا تھا جب وہ پیارے میاں کی شادی کے موقعہ پر اس نائی کو لے کر آئے تھے جو ان کی دانست میں قورے اور بریانی کے پکانے میں اتنی مہارت رکھتا تھا کہ دلی کے باورچیوں سے ٹکر لے سکتا تھا۔ مگر شادی کے پورے عرصے میں وہ جب نظر آئے باورچی خانے ہی میں نظر آئے۔ مونڈھے پہ بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پکانے والوں سے دنیا جہان کی باتیں کر رہے ہیں۔ اندر سے جب نائن کسی کام سے یہاں آتی تو اس سے تھوڑی چہل کرتے۔ اس کے چلے جانے کے بعد پھر باورچیوں سے مخاطب "ہاں کیا ذکر ہو رہا تھا میاں بلاقی۔"

"قادر کی بات ہو رہی تھی جی۔"

"ہاں قادر۔ اچھا پٹھا نکلا تھا۔ جانی پہلوان سے اس کی کشتی یاد ہے نا۔"

"ہاں جی، خوب یاد ہے۔"

"ہندو کس زور شور سے اسے میرٹھ سے لے کے آئے تھے۔ ویسے وہ پہلوان تھا زوردار۔ جب اکھاڑے میں اتر کے چکر لگاتا اور مٹی ملتا تو لگتا کہ مست ہاتھی آگیا ہے۔ قادر اس کے سامنے بھنگا لگ رہا تھا۔ مگر ظالم نے کیا دھوبی پٹرا مارا ہے کہ کیم شحیم جانی چت پڑا تھا۔"

"پر آغا میاں، تمہارے قادر کو اس ڈھڈو بالو نے چاٹ لیا۔"

"کیا بتائیں میاں بلاقی۔ ہم نے قادر کو بہت سمجھایا تھا کہ کمبخت عورت کے قریب مت جائیو۔ مارا جائے گا۔ مگر اس کی گدی میں بات آئی نہیں۔"

"آغا میاں، ایک بیر میرے جی میں آئی تھی کہ بالو کی چونیا پکڑ کے ایک جھانپڑ لگاؤں کہ ڈھڈو چھنالا ہی کرنا ہے تو کوئی اور گھر دیکھ۔ ہمارے پہلوان کو بخش دے۔ پر جی کچھ سوچ کے میں چپ ہو گیا۔" ٹھنڈا سانس بھرا اور پھر جاری "ہمارے اکھاڑے کی بہار قادر تک تھی۔ اب خاک اڑے ہے۔ اب سالا جو لمڈا آوے ہے وہ چار دن زور

کرے ہے اور اپنے آپ کو گاماں سمجھنے لگے ہے۔ پھر ہیرو بننے کے خناس میں بمبئی بھاگ جاوے ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو میاں بلاقی۔ وہ نمک حرام شدن۔ میں نے گھی کے کنستر کے کنستر اس کے اندر انڈیل دیئے۔ کیا جوان نکلا تھا۔ کیا اس کی چوڑی چھاتی تھی۔ مگر ہوا کیا۔ کہیں کمبخت نے بمبئی کی بلی' والی فلم دیکھ لی۔ بس سلوچنا پہ مرمٹا۔ کہنے لگا بمبئی جاؤں گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ ذات کی وہ یہودن ہے۔ تجھے گھول کے پی جائے گی۔ نہیں مانا۔ میں نے کہا، جا، مر۔ چلا گیا۔ پھر کیا ہوا۔ سلوچنا کی تو ڈیوڑھی تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ بمبئی کے بازاروں میں آوارہ پھرتا رہا۔ جب واپس آیا تو میاں بلاقی بچ جانا بالکل چوہا بن چکا تھا۔" حقے کا لمبا گھونٹ اور پھر جاری۔ "میاں بلاقی، عورت بڑی بلا ہوتی ہے۔ جو اس کے چکر میں پڑ گیا سمجھ لو کہ کام سے گیا۔"

یہ تھے پھوپھا آغا کہ کبھی شادی بیاہ کی تقریب سے یا کسی مرنے جینے کے موقعہ پر وارد ہوئے۔ مگر اس طرح کہ خانساماؤں اور باورچیوں کے بیچ بیٹھ کر اپنی حکمت کے موتی بکھیرتے اور رخصت ہو جاتے۔ پھوپھا جانی ان کے الٹ تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی، بر میں حیدر آبادی تراش کی شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ، پیروں میں بو والا گرگابی پمپ، کیا وقار تھا۔ بچ مچ پھوپھا نظر آتے تھے۔ حیدر آباد میں ملازمت کرتے تھے۔ آتے تھے تو بڑے وقار کے ساتھ بیٹھک میں معززین کے بیچ بیٹھ کر گفتگو کرتے۔ آصف جاہی دربار سے منسلک امرا کے قصے تھمنے ان کا موضوع ہوتے۔ مقامی معززین کتنے مرعوب ہوتے۔ اور کتنی حیرت سے وہ واقعات سنتے۔ ہاں چھوٹی پھوپھو بیچاری دبی دبی رہتیں۔ پھوپھی اماں کی شخصیت کے نیچے وہ اتنی دب گئی تھیں کہ ان کی موجودگی میں بات کرنے کی مجال ان میں کم کم پیدا ہوتی تھی۔ ایک چھوٹی پھوپھو پہ کیا موقوف تھا دوسرے بھی ان کے سامنے بات کرنے کی کتنی مجال رکھتے تھے۔ خود پھوپھا آغا بھی ان کے سامنے آکر بلی بن جاتے تھے۔ باورچی خانے میں بیٹھ کر خانساماؤں کے سامنے کتنا رعب گانٹھتے تھے۔ زنان خانے میں آتے تو اپنا سارا رعب داب پیچھے چھوڑ آتے۔ ویسے وہ زنان خانے میں آتے کہاں تھے۔ آتے بھی تو لئے دیئے سے رہتے۔ اور پھوپھی اماں سے بات کرتے تو میں نے انہیں کبھی دیکھا نہیں۔ لگتا تھا کہ دونوں کے بیچ میلوں کا فاصلہ ہے۔

یہ تو اب بڑی بھابی کی باتوں سے پتہ چلا کہ قصہ اصل میں کیا تھا۔ مشتری بائی فساد کی جڑ تھی۔ پھوپھا آغا کی راتیں تو مشتری بائی کے مجرے میں گزرتی تھیں۔ پھوپھی اماں کب تک برداشت کرتیں۔ ایک دن تاؤ کھایا اور میکے چلی آئیں۔ پھر کبھی واپس نہیں گئیں۔ بھائیوں کے بھرے پرے گھر سے جو انہیں شغف تھا اس نے انہیں کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ادھر پھوپھا آغا کا رویہ یہ تھا کہ تم روٹھے ہم چھوٹے۔ تجرد کے طعنہ سے بھی بچ گئے اور ازدواجی زندگی کے جھمیلوں سے بھی بری تھے ایک بیٹی دونوں طرف یہ ڈھارس دلانے کے لئے کافی تھی کہ ان کی شادی بے ثمر نہیں رہی۔

میرے پاپا جانی پر بھی شاید پھوپھی اماں کا پرچھاواں پڑ گیا تھا کہ ازدواجی زندگی سے انہیں بھی نفور رہا۔ جب تک جئے پردیس میں رہے۔ برس میں ایک پھیرا لگاتے تھے اور کتنا کچھ ساتھ لاتے تھے کہ گھر بھر جاتا تھا۔ اپنے پرایوں سے ملے جلے اور واپس۔ اللہ نے ایک اولاد نرینہ دی تھی اس پر قانع تھے۔ ایک دفعہ آئے تو بھانجی کو پیاری پیاری باتیں کرتے دیکھا، ریجھ گئے اور بیٹے کے لئے مانگ لیا۔ شاید اب کے اسی لئے آئے تھے۔ اس کے بعد خود نہیں آئے جنازہ آیا۔ اندر باہر ہنس پڑ گئی۔ کون تھا جس کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا۔ مگر جس پر یہ موت بھاری پڑی وہ میری امی جان تھیں۔ جدائی میں پہلے ہی گھلتی رہتی تھیں۔ اب دیکھتے دیکھتے سوکھ کر کانٹا ہو گئیں اور سال کے اندر اندر سدھار گئیں۔ مگر اس ڈھائی گھڑی کی موت کا راز اب آ کر کھلا۔ "چچا جانی جب آخری دفعہ آئے ہیں تو کتنے خوش تھے۔ جب پھوپھی اماں نے میمونہ کے لئے حامی بھر لی تو نہال ہو گئے۔ سمجھ رہے تھے کہ بہن نے دونوں جہان کی دولت انہیں بخش دی۔ مگر وہ دکھیا رانی خود بھی اجڑ گئی۔ انہیں بھی لے بیٹھی۔ کسی کمبخت نے راجہ کے کان بھر دیئے۔ راجہ کچے کانوں کا تھا۔ کہاں تو چچا جانی پر اتنا اعتبار کرتا تھا کہ ساری ریاست کا کاروبار ان پر چھوڑ رکھا تھا کہاں یہ بے اعتباری۔ بس چچا جانی نے ہیرے کی کنی چاٹ کر اپنے آپ کو ختم کر لیا۔"

ماضی کے کتنے اندھیروں اجالوں میں گھما پھرا کر بڑی بھابی اصل موضوع پر آئیں۔ "بھیا اگر تم ہماری مانو تو ایک بات کہیں۔"

"جی؟" میری سمجھ میں نہ آیا کہ بڑی بھابی کیا کہنا چاہتی ہیں۔

"بھیا ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ جو کہیں گے تمہارے بھلے کی کہیں گے۔ باہر کر کے تم نے دیکھ لیا۔ میں پوچھتی ہوں تم نے کتنا سکھ پایا۔ پھر وہی اکیلے کے اکیلے۔ اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ تم میمونہ سے شادی کر لو۔"

میں سٹپٹا گیا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا۔ "اب؟"

"اے بھیا میں نے ایسی کونسی غلط بات کہہ دی۔ تمہارے بھلے کی ہی کہی ہے۔ اور چچا جان نے جو سوچا تھا وہ بھی تمہارے بھلے ہی کے لئے سوچا تھا۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، جب پھوپھی اماں نے ہاں کر دی تو خوشی سے پھولے نہیں ساتے تھے۔ اور انصاف کی بات ہے پھوپھی اماں بھی تمہیں دیکھ کے جیتی تھیں۔ جب تم چلے گئے ہو تو تمہیں یقین نہیں آئے گا انہیں تو بالکل چپ لگ گئی۔ یہ غم انہیں لے بیٹھا۔ میمونہ، بیچاری بچی اکیلی رہ گئی۔ اور میاں جان کے بعد تو بالکل ہی اکیلی ہو گئی۔ اب کون ہے۔ اس دنیا میں اس کا۔ بیچاری بچی۔" چپ ہوئیں اور پھر چھوٹے میاں سے مخاطب ہوئیں کہ خاموشی سے آ کر بیٹھ گئے تھے اور حقہ پئے جا رہے تھے۔ "ارے تم بھی تو کچھ بولو۔ تمہاری بھی تو آخر کچھ رائے ہو گی۔"

"ہماری بہن بہت اچھی ہے۔ بہت نیک ہے۔" چھوٹے میاں نے مختصراً کہا۔

"ارے نیک نہ ہوتی تو اس طرح اپنی عمر گزار دیتی۔ اور رشتوں کی تو کوئی کمی نہیں تھی۔ کئی رشتے آئے، ایک سے ایک اچھا مگر غریب کا ایسا دل ٹوٹ گیا کہ پھر اس نے کسی رشتے پہ ہاں نہیں کی۔"

"بہت شریف ہے۔ ہمارے جو بیٹی کی کمی تھی اس نے پورا کر دیا۔ اب وہ ہماری بہن بھی ہے اور بیٹی بھی۔ دو کمیاں پوری کی ہیں۔"

"پھر کیا خیال ہے تمہارا۔" بڑی بھابی نے سیدھا سوال کیا۔ میں چپ رہا۔ جھجکا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"اے بھیا جانے بھی دو، ایسی کونسی دیر ہو گئی ہے۔ ابھی کل کی تو بات ہے کہ تم یاں سے ہنستے کھیلتے گئے تھے۔ پتہ نہیں واں جا کے تم پہ کیا آفت پڑی کہ بال کھچڑی کر لئے۔ اور ہم نے تو لوگوں کو بڑھاپے میں بیاہ رچاتے دیکھا ہے۔" پھر چھوٹے میاں سے مخاطب ہوئیں۔ "اجی تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اس عمر میں شادیاں ہوتی نہیں ہیں۔ اور

میمونہ تو اب بھی ماشاء اللہ ویسی ہی ہے جیسی تب تھی۔ بس ذرا غموں سے جھنک گئی ہے۔"

چھوٹے میاں نے حقے کا لمبا کش لیا پھر بولے "ٹھیک ہے۔ جواد اپنے حالات کو دیکھ لیں، سوچ سمجھ لیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ابھی جواب دیں۔"

"ہاں ہاں بھیا سوچ لو۔ کل کلاں کو یہ مت کہنا کہ چھوٹے میاں اور بڑی بھابی نے پھنسوا دیا۔"

دل ہی دل میں چھوٹے میاں کا میں کتنا شکر گزار ہوا۔ بڑی بھابی تو گلے پہ چھری رکھ کے ہاں کرانے پہ تلی تھیں۔

وہ رات کس خرابی سے گزری۔ کبھی اس کروٹ کبھی اس کروٹ۔ جیسے میرے دو ہو گئے ہوں۔ ایک کہتا تھا ہاں۔ دوسرا کہتا تھا نہیں۔ کس کی مانوں، کس کی نہ مانوں۔ کتنے زمانے پہلے کی خواہش جو کہیں دب دبا گئی تھی ایک دم سے ابھر آئی تھی۔ میرے اندر اس کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر اندر ہی سے مخالفت کی آواز بھی اٹھ رہی تھی۔ فیصلہ کن کردار یادوں نے ادا کیا۔ کہ جو بھی یاد آتی ابھر آنے والی خواہش کو تقویت پہنچاتی اور مخالفت میں اٹھنے والی آواز کا زور کم ہوتا محسوس ہوتا۔

صبح ہوتے ہوتے مجھے محسوس ہوا کہ جیسے مجھے چین آگیا ہو۔ شاید میری اطلاع کے بغیر اندر کوئی فیصلہ ہو گیا تھا۔ مگر مجھے اس فیصلہ کو قبول کرتے ہوئے یا شاید اس کا اعلان کرتے ہوئے ایک ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ سوچا کہ آج کی بات کل پر ٹل جائے تو اچھا ہو۔ مگر کسی طرح۔ بڑی بھابی نے ایک رات کی مہلت تو دے دی تھی۔ مزید مہلت ملتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر اچانک مجھے یاد آیا کہ مجھے آخر خیرل بھائی سے بھی تو ملنا ہے۔ بس میں نے ناشتے کی میز پر پہنچنے سے پہلے ہی اعلان کر ڈالا۔ "میں اس وقت میرٹھ جا رہا ہوں۔"

"اچھا؟" بڑی بھابی بولیں۔

"خیرل بھائی سے ملنا ہے۔"

"خیرل بھائی۔" چھوٹے میاں تھوڑا چکرائے "وہ سنکی؟ اس سے ملو گے؟"

"خیرل بھائی کو آپ سنکی کہتے ہیں۔ ہماری پوری پارٹی انہیں جینئس مانتی تھی۔"

"جینئس" چھوٹے میاں نے حقارت بھرے لہجہ میں کہا۔ "جینئس ایسے ہوتے ہیں، نکھد آدمی، زندگی میں کچھ بھی تو کر کے نہیں دیا۔ بہرحال تمہیں روکتا کون ہے، ضرور ملو جا کر۔"

میں حیران کہ یا اللہ یہ اپنی خیرل بھائی ہیں۔ یہ تو وہ ہیں ہی نہیں۔ وہ چہکتے مہکتے اپنی نرالی دھج والے خیرل بھائی کہاں چلے گئے۔ شاید چھوٹے میاں نے انہیں صحیح سنکی کا خطاب دیا تھا مگر وہ کب سے ایسے ہوئے۔ ویسے اس زمانے میں بھی سنک تو ان پر سوار ہو جایا کرتی تھی۔ ہمارے جاتے جاتے ان پر کیا سنک سوار ہوئی تھی کہ بندھا بستر ہی کھول دیا۔ ہماری پارٹی نے تو انہیں کی کمک پر پاکستان کے لئے بستر باندھا تھا۔ خیال تھا کہ وہ تو تحریک میں بہت پیش پیش رہے ہیں۔ سب قائدین تک ان کی رسائی ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے راوی ہمارے لئے چین رکھتا ہے۔ اور واقعی وہ ساتھ ہوتے تو میں جگی نشین کیوں بنتا۔ مگر تنت وقت پہ انہوں نے ہمیں نوٹس دیا "یار، تم لوگ جاؤ۔ میں نہیں جاتا۔"

ہم بہت سٹپٹائے "آخر کیوں؟"

"بس میں یہیں رہوں گا۔"

"مگر---------ہم-----------"

"تم لوگ جاؤ۔ کہہ دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ آخر کسی کو یہاں بھی تو رہنا چاہئے۔"

بس جو دماغ میں سما گئی مجال ہے کہ اس سے ادھر ادھر ہو جائیں۔ اور اب زمانے بعد میں آیا تھا تو حیران و ششدر کہ خیرل بھائی بدل کر کیا سے کیا بن گئے ہیں۔ مگر ارد گرد بھی تو بالکل بدل گیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ کوٹلہ محلّہ کی اس گلی کو چھوڑ کر جہاں خیرل بھائی کا گھر تھا۔ چہک مہک تو اس گلی کی بھی چلی گئی تھی اور اس گھر کی بھی جو پہلے

بہت بھرا پرا نظر آتا تھا اور اب اتنا ویران کہ خیرل بھائی کو چھوڑ کر بس ایک بلی نظر آ رہی تھی۔ گلی بھی ویران ہی تھی۔ مگر نقشہ وہی تھا ذرا جو تبدیلی آئی ہو۔ مطلب یہ کہ نقشہ وہی مگر اس طرح آباد نہیں۔ گلی سے باہر مجھے سارے شہر کا نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سارے وہ نشانات جن سے میں اس شہر کو پہچانتا تھا جیسے مٹ گئے ہوں۔ ان کی جگہ نئے نشانات نے لے لی تھی۔ عمارتیں، دکانیں، نکڑ جیسے سب بدل گئے ہوں۔ اور بھیڑ الٰہی توبہ۔ کتنی مرتبہ چلتے چلتے احساس ہوا کہ یہ وہ شہر نہیں ہے۔ میں بھول کر کسی اور شہر میں نکل آیا ہوں۔ شاید سب شہروں کے ساتھ یہی مصیبت ہے کہ اس طرح سے بدلتے ہیں کہ کوئی کوئی سخت جان نشان ہی باقی رہ جاتا ہے، باقی سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اچھا ہوا کہ ہمارا ویاس پور کوئی بڑا شہر نہ ہوا کہ پہلی نظر میں تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ وہ تو یہ کہئے کہ دلکشا کے ملبہ نے میری آنکھیں کھول دیں ورنہ مجھے تو سب کچھ ویسا ہی نظر آ رہا تھا۔

"خیرل بھائی، آپ کا میرٹھ تو بہت بدل گیا ہے۔" یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ خیرل بھائی آپ بہت بدل گئے ہیں۔

میرے منہ سے میرٹھ کے بدلنے کی خبر خیرل بھائی نے تعجب سے سنی۔ پھر جب میں نے اپنے مشاہدے کے حساب سے ان تبدیلیوں کا بیان کرنا شروع کیا تو ان کا تعجب بڑھتا چلا گیا۔ میرا پورا بیان انہوں نے کتنی حیرت سے سنا۔

"اچھا؟ واقعی؟"

جب بار بار انہوں نے یہ کلمہ کہا تو میں نے بالآخر کہا "مگر خیرل بھائی، آپ کی حیرانی مجھے حیران کر رہی ہے۔ آپ تو اس شہر میں رہتے ہیں۔ آپ کو احساس نہیں ہوا کہ تب سے اب تک یہاں کتنا کچھ بدل گیا ہے۔"

خیرل بھائی بولے "میاں جب تک ہم میرٹھ کالج میں رہے تب تک تو روز انہیں بازاروں سے گزرتے تھے ہمیں تو کسی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔"

"خیرل بھائی، یہ تو آپ شروع کے سالوں کی بات کر رہے ہیں۔ اس کے بعد تو آپ نے اس کالج کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ جب میں نے وہاں سنا تھا تو مجھے تعجب ہوا کہ اچھی بھلی لیکچراری پہ آپ نے کیوں لات مار دی"۔

خیرل بھائی چپ رہے۔ پھر بولے "میاں جواد، بات یہ ہے کہ جب ہم میرٹھ کالج میں پڑھتے تھے تب یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ مگر لیکچرار بننے کے بعد عجب سا احساس ہونے لگا کہ ارے یہاں تو ہندو بہت ہیں۔ بس ہم اکھڑ گئے۔"

"مگر اس کے بعد علی گڑھ میں تو آپ کا دل لگنا چاہئے تھا۔"

"ہاں چاہئے تو یہی تھا۔" خیرل بھائی سوچتے ہوئے بولے "ویسے بھی علی گڑھ میں بھی تو آخر ہم پڑھے ہیں۔ لیکن عجب بات ہے کہ ان دنوں بالکل پتہ نہیں چلا۔ اب ہم وہاں گئے تو احساس ہوا کہ یہاں تو مسلمان بہت ہیں۔ جدھر نظر اٹھاؤ ادھر مسلمان۔ میاں جواد سچ جاننا، ہمیں خفقان ہونے لگا۔ بس ہم وہاں سے اکھڑ لئے۔"

"اور پھر میرٹھ میں آکر بیٹھ گئے۔" میرے منہ سے یونہی نکل گیا۔

"ہاں میرٹھ میں اپنے ٹھئے پر۔ مگر اب تم کہہ رہے ہو کہ میرٹھ بدل گیا ہے۔ تو پھر تو اچھا ہی ہوا کہ اپنے ٹھئے پر بیٹھ کر پھر ہم گھر سے نکلے ہی نہیں۔" یہ کہتے کہتے انہوں نے رحیم الدین بابا کو آتے دیکھا "اے لو رحیم الدین بابا کو تمہارے آنے کا پتہ چل گیا۔ کس پھرتی سے چائے بنا کر لائے ہیں۔"

رحیم الدین بابا کو میں نے مشکل سے پہچانا۔ پہلے بھی کونسے جوان تھے۔ اب تو بالکل ہی کمر جھک گئی تھی۔ "رحیم الدین بابا، اچھے تو ہو۔"

"اللہ کا شکر ہے۔"

چائے رکھ کر جانے لگے تو خیرل بھائی نے انہیں ٹوکا "رحیم الدین بابا، تم نے شاید انہیں پہچانا نہیں۔ یہ جواد میاں ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔"

رحیم الدین ٹھٹھکے۔ مجھے غور سے دیکھا۔ خوش ہوئے، دعائیں دیں۔ واپس جانے لگے۔ پھر پلٹے، قریب آکر بولے۔ "میاں، میرا کرمو بھی پاکستان میں ہے۔ کبھی وہ بھی ملا تمہیں۔"

"نہیں۔ کس شہر میں ہے وہ۔"

"ارے اس کمبخت نے کبھی خط لکھا ہوتا تو مجھے پتہ چلتا کہ کس شہر میں ہے۔ بس وہیں کہیں پاکستان میں ہے۔ میاں، میرے بڑھاپے پہ رحم کرکے ذریوں اسے ڈھونڈھیو۔ مل جاوے تو چار جوتے میری طرف سے ماریو اور کہیو کہ ارے بدبخت

ایک دفعہ تو بوڑھے باپ کو صورت دکھائیا۔ اور نہیں تو خیریت کی چٹھی ہی لکھ دے۔"

"اچھا بابا، مل گیا تو کہوں گا۔"

جب وہ چلا گیا تو خیرل بھائی ہنسے اور کہنے لگے "رحیم الدین بابا مجھ سے کہتا ہے کہ پاکستان کے اخباروں میں ایک اشتہار نکلوا دو کہ کرمو جہاں ہے اسے معلوم ہو کہ اس کا باپ پریشان ہے اور اسکی خیریت کا طالب ہے۔ میں نے کہا کہ رحیم الدین بابا، اگر یہ اشتہار نکلوایا تو پھر تو اس مضمون کے اور بھی بہت سے اشتہار نکلوانے پڑیں گے۔ اس پر کہنے لگا کہ ویزا دلوا دو تو میں ہی پاکستان کا ایک پھیرا لگا آؤں۔ بیٹے کی صورت بھی دیکھ لوں گا اور پاکستان کو بھی دیکھ لوں گا۔" رکے۔ پھر کہنے لگے "عجیب بات ہے۔ یہاں جو بھی ہے ایک دفعہ ضرور اس کے دماغ میں یہ کیڑا بلبلاتا ہے کہ پاکستان کا ایک پھیرا لگایا جائے۔"

"مگر خیرل بھائی۔" میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر پوچھ ہی لیا "آپ کا کبھی جی نہیں چاہا کہ پاکستان کا ایک پھیرا لگایا جائے۔"

"میرا؟" انہوں نے مجھ گھور کے دیکھا "نہیں۔"

"آخر، خیرل بھائی، آپ پاکستان سے بے تعلق تو نہیں تھے۔ تحریک میں تو آپ بہت پیش پیش تھے۔"

خیرل بھائی چپ رہے۔ پھر بولے "ہاں ٹھیک ہے۔ مگر اس وقت وہ کوئی ملک نہیں تھا، ایک خواب تھا۔" پھر آہستہ سے بولے "خواب جب تک خواب رہے اس میں بہت سحر ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ مگر" عین اسی وقت ان کی، بلی جسے انہوں نے میری خاطر رخصت کر دیا تھا آن کودی۔ خیرل بھائی نے اسے پچکارا۔ پھر وہ اسے پچکارنے میں ایسے محو ہوئے کہ اپنی ادھوری بات کو پورا کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

خیرل بھائی سے ملاقات تشنہ رہی۔ پھر بھی اس نے مجھ پر عجب اثر کیا۔ اندر جو ایک تذبذب تھا وہ رفع ہو چکا تھا۔ جب میں واپس پھرا ہوں تو کتنا مطمئن تھا۔ اور اندر سے کتنا خوش۔ رات دیر سے پہنچا تھا۔ بڑی بھابی سے مڈھ بھیڑ نہیں ہوئی۔ مگر اب میں اس مڈھ بھیڑ کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا۔ صبح کتنا خوش خوش میں ناشتہ کی میز پر جا کر بیٹھا تھا۔ مگر مجھے جلدی ہی محسوس ہوا کہ میمونہ چپ چپ ہے۔ میں نے قیاس کیا کہ میرے

پیچھے کوئی بات ہوئی ہے۔ میں نے کئی دفعہ اڑتی سی نظر اس پر ڈالی۔ ایک دو دفعہ بات کرنے کی کوشش بھی کی۔ مگر وہ ہوں ہاں کر کے چپ ہو گئی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ بیکل ہے، جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

"میمونہ کیا بات ہے۔ آج تم چپ چپ ہو۔"

"کچھ نہیں۔"

"پھر بے چین کیوں ہو؟" اب میں کس اعتماد سے بول رہا تھا۔ "میرا خیال ہے، تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔"

رک کر بولی "ہاں۔ کہنا نہیں، پوچھنا ہے۔"

"کیا؟"

"بس اتنا پوچھنا تھا۔" اور اچانک اس کے لہجہ میں تیزی آ گئی۔ "تم جا کب رہے ہو۔"

میں سٹپٹا گیا۔ کتنا غیر متوقع سوال تھا۔ میں کیا توقع کر رہا تھا اور اس نے پوچھا کیا۔

"تمہیں میرا یہاں رہنا شاید ----------" اس سے پہلے کہ میرا فقرہ مکمل ہو، اس نے آواز دی۔ "بڑی بھابی، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اب آ جائیے نا۔"

"آ رہی ہوں۔" بڑی بھابی کی آواز برآمدے سے آئی۔ اور ساتھ ہی ان کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فقرہ جہاں ٹوٹا تھا وہیں میں نے چھوڑ دیا۔ مگر میں بڑی بھابی کے آنے سے پہلے کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔

"جلدی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

بڑی بھابی نے میری بات سن لی تھی۔ "اے ہے، کس بات کی جلدی ہے۔ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔" پھر انہوں نے متجسس نظروں سے پہلے مجھے اور پھر میمونہ کو دیکھا۔ پھر چپ سی ہو گئیں۔ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگیں۔

میمونہ نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "سکول کو دیر ہو رہی ہے۔"

"دیر؟ دیر کہاں سے ہو گئی"۔ بڑی بھابی بولیں۔

"ہاں آج جلدی پہنچنا ہے۔" اور یہ جا وہ جا۔

بس اسی آن چھوٹے میاں بھی آن وارد ہوئے۔ مگر اس عرصے میں، میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

"سوچتا ہوں کہ لگے ہاتھوں اورنگ آباد کا بھی ایک پھیرا لگا آؤں۔"

"ہاں وہاں تو ضرور جانا۔ چھوٹی پھوپھو تمہیں دیکھنے کے لئے بہت بے چین ہیں۔"

"ہاں وہاں جانا تو چاہئے۔" بڑی بھابی بولیں "مگر اتنی جلدی کیا ہے۔ چلے جانا۔"

"بڑی بھابی، اسی میں دن گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ آخر مجھے واپس بھی تو جانا ہے۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ تم ادھر سے جلدی نبٹ ہی لو تو اچھا ہے۔" چھوٹے میاں نے قصے کو مختصر کیا۔

"ہاں ٹھیک ہی ہے۔" بڑی بھابی نے بھی بالآخر مان لیا۔ "چھوٹی پھوپھو تمہیں دیکھ کے خوش ہو جاویں گی۔ بیچاری چھوٹی پھوپھو۔ مجھ سے تو ان کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔"

"کیوں، کیا ہوا۔"

"ارے بھیا ہونا کیا تھا۔ اب وہ حیدر آباد والی بات تو نہیں رہی۔"

"وہ تو اب کسی کی بھی نہیں رہی۔" چھوٹے میاں نے کہا۔

"پھوپھا جان بھی اب بہت بدل گئے ہیں۔"

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ سنک گئے ہیں۔"

"اجی تمہارا حال تو یہ ہے کہ جو اللہ رسول کا زیادہ نام لیوے اسے کہہ دیتے ہو کہ سنک گیا ہے۔"

"خیر جواد میاں خود ہی دیکھ لیں گے۔"

(11)

اکہ کتنے پھیر کھا کر اورنگ آباد کی انگلی ایسی پتلی گلی میں داخل ہوا جہاں دونوں طرف کھلی موری میں گدلا پانی بہہ رہا تھا۔ خستہ حال کچے پکے مکان، دروازوں پر پڑے ہوئے ٹاٹ کے پردے۔ ایک گلی سے مڑ کر دوسری گلی میں۔ دوسری گلی سے مڑ کر تیسری گلی میں۔ اور میں حیران کہ اچھا یہ اورنگ آباد ہے۔ مگر ان گلیوں میں داخل ہونے سے پہلے تو نقشہ کچھ اور تھا، فضا کچھ اور تھی۔ کتنا خوبصورت شہر نظر آ رہا تھا۔ ان گلیوں میں آ کر اورنگ آباد کو کیا ہو گیا۔

اکہ ڈولتا ڈولتا ایک ایسے ہی ٹاٹ پڑے دروازے پہ جا کر رک گیا۔

"لو جی، یہ ہے وہ گھر۔"

"یہ گھر؟" میں نے پریشان ہو کر اس خستہ حال دروازے کو دیکھا "نہیں، تم غلط لے آئے ہو۔ یہ تو وہ گھر نظر نہیں آتا۔"

"آپ نے جو پتہ بتایا تھا اسی حساب سے لایا ہوں۔"

میں ڈانوا ڈول تھا۔ مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہمارے خالو جان، یعنی وہ ترکی ٹوپی، حیدر آبادی اچکن اور بو نگے پمپ والے خالو جان اس گلی کے اس مکان میں رہتے ہوں گے۔ مگر اکے والے نے پھرتی دکھائی۔ اکے سے کود کر دروازے پہ پہنچا چابک سے اسے کھٹکھٹایا۔ پھر پکار کر کہا "سید صاحب، تمہارے مہمان آئے ہیں۔ پاکستان سے۔" جلد ہی دروازہ کھلا اور سفید لمبی ریش والے ایک بزرگ برآمد ہوئے۔ میں

حیران کہ یہ کون بزرگ ہیں مگر پھر میں نے سوچا کہ وہ شاید خالو جان کو جانتے ہوں گے۔ پتہ تو بتا ہی دیں گے۔ میں کچھ کہنے لگا تھا کہ انہوں نے مجھے غور سے دیکھتے دیکھتے پہچانا۔ "ارے تم جواد ہو، آؤ آؤ۔" اور کھینچ کر اندر لے گئے "شکور کی ماں، کہاں ہو، دیکھو کون آیا ہے؟"

چھوٹی پھوپھو سوکھی چمرخ، کمر دہری جیسے کمان ہو، سر سارا سفید، میں حیران کہ اچھا چھوٹی پھوپھو اب ایسی ہو گئیں۔ مجھے غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ "اے ہے یہ تو اپنا منّن ہے۔" یہ کہتے کہتے بے ساختہ مجھے لپٹا لیا اور رونا شروع کر دیا۔ "بیٹے پاکستان میں جا کے ایسے بیٹھے کہ سب ہی کو بھلا دیا۔" بس اسی رو میں بولتی چلی گئیں "ارے یہ پتہ تھوڑا ہی تھا کہ ہمارے جگر کے ٹکڑے ایسے الگ ہوں گے کہ ہم ان کی صورتوں کو ترس جاویں گے۔ اے بیٹا میں یہ پوچھوں ہوں کہ پاکستان کے پانی میں کیا ملا ہوا ہے کہ واں جا کے خون سفید ہو جاوے ہیں۔ مگر ہم اپنے دلوں کو کیا کریں۔ پاکستان میں چودھویں صدی آ گئی۔ ہم بخت مارے وہیں کے وہیں ہیں۔"

جب چھٹے ہوؤں کو رو چکیں تو پھر چھوٹی پھوپھو نے اپنا حال سنانا شروع کیا "بیٹے حیدر آباد کی تباہی نے ہمیں تباہ کر دیا۔ اور تمہارے خالو کا تو دماغ ہی چل بچل ہو گیا۔ دنیا کے قصوں سے بے نیاز ہو گئے۔ ہر وقت اللہ رسول کی باتیں۔ پھر گھر کیسے چلے۔ اور یہ تمہارا شکور۔ وہ پڑھ لکھ جاوے تو شاید ہمارے دلدر دور ہو جاویں۔ مگر اس کے تو لچھن ہی اور ہیں۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔" خالو جان نے بھی بالآخر زبان کھولی۔ "کہ اسے کالج میں داخل مت کراؤ۔ وہاں تو ہندو گردی مچی ہوئی ہے۔ یہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔ سو وہی ہوا۔ پتہ ہے پچھلے ہفتے کیا ہوا۔ پاکستانی ٹیم جیتی تو ہمارے پڑوسی ہیں مرزا عزت بیگ۔ گلی کے لونڈے ان کے پیچھے پڑ گئے۔ انہوں نے ان کے کہے پہ لڈو خرید کے ایک ایک لڈو سے ان کا منہ بند کیا۔ صاحبزادے کو دیا تو کیا فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب یہ لڈو پاکستان میں جا کے باٹیے۔ ہمیں کیوں دے رہے ہیں۔ مرزا صاحب نے مجھ سے شکایت کی تو جواد میاں سچ جاننا میرا سر شرم سے جھک گیا۔"

"بھائی جان، آپ بتایئے میں نے کچھ غلط کیا۔ غیر قوم کی ٹیم جیتی ہے۔ میں کیوں

لڈو کھاؤں۔"

"ارے کمبخت۔" چھوٹی پھوپھو بولیں "یہ تیرا بھیا یاں آیا بیٹھا ہے۔ یہ آج غیر قوم ہو گیا۔ تم ایک خاندان کے پوت ہو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے، قومیں تو دو ہیں۔"

"سن رہے ہو جواد میاں۔" خالو جان نے زچ ہو کر مجھ سے اپیل کی۔ "اب تم اس سر پھرے کی منطق کا جواب دو۔"

میں کیا جواب دیتا۔ شکور نے تو خود مجھے چکرا دیا تھا۔ اس پہلو سے تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"جواد میاں، کیا پوچھتے ہو یہاں کے حالات، زمانہ ایسا بدلا ہے کہ ہماری اولادیں بھی ہم سے فرنٹ ہو گئیں۔ بیٹے سمجھتے ہیں کہ جوان کے باپوں نے سوچا اور کیا وہ غلط تھا۔ وہ جو سوچتے ہیں اور کرتے ہیں وہ صحیح ہے۔" پھر چھوٹی پھوپھو سے مخاطب ہوئے "شکور کی ماں، اپنے بیٹے کو اب صبر کر لو۔ مذہب سے کیا لا تعلق ہوا کہ ہمارے ہاتھ سے ہی نکل گیا۔ کافر ہو گیا کافر۔"

"ہاں۔" چھوٹی پھوپھو نے اداسی سے کہا "ہم نے تو پوت اور شوہر دونوں ہی کو صبر کر لیا۔ ایک بے دین ہو گیا۔ دوسرا دین میں جا کے گم ہو گیا۔"

چھوٹی پھوپھو یہ کہہ کر چپ ہو گئیں۔ پھر جب دوبارہ زبان کھولی تو مضمون بدلا ہوا تھا۔ اب وہ میرا حال احوال پوچھ رہی تھیں۔ پھر کہنے لگیں کہ "دلہن کا خط آیا تھا۔ تمہارا سارا حال اس نے مجھے لکھا تھا۔ اپنی تجویز کا بھی ذکر کیا۔ بیٹے، اس نے تمہیں جو سمجھایا ہے صحیح سمجھایا ہے۔ کب تک اجڑے رہو گے۔ یہ سمجھ لو کہ بڑھاپا آیا کھڑا ہے، ادھر بھی اور ادھر بھی۔ یہ وقت بھی نکل گیا تو پھر پچھتاوا ہی پچھتاوا ہے۔ تو گھر آباد کر لو۔ عمر گزرتے دیر نہیں لگتی ہے۔"

چھوٹی پھوپھو کہتی رہیں۔ میں سنتا رہا۔ یہ ان کا مضمون تھا۔ باقی پھوپھا جان کا تو مضمون جو شروع میں تھا وہی آخر وقت تک چلتا رہا۔ "جواد میاں، سلطنت تو جانی ہی تھی۔ فقیر نے حضرت آصف جاہ اول کو جو دعا دی تھی وہ بس اسی پشت تک کے لئے تھی۔ تو حضور نظام پر آ کر وہ دعا ختم ہو گئی۔ لیکن اگر ہم دین سے منحرف نہ ہوتے تو یہ

حال تو نہ ہوتا۔ میاں، میں تمہیں ایک پمفلٹ دوں گا۔ سب پاکستان والوں کو پڑھوا دینا۔ میں نے اس میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ مسلمانوں نے جب دین سے انحراف کیا تو ان پر کیسا زوال آیا۔"

میں نے پھوپھا جان کی ساری باتیں جو ایک قسط وار وعظ کی حیثیت رکھتی تھیں سعادت مندی سے سنیں۔ بیٹے کی طرف سے مایوس ہو کر اب انہوں نے مجھے مرکز توجہ بنایا تھا۔ اور ان چند دنوں میں انہیں مجھ پر کتنا اعتبار ہو گیا تھا۔ آخری دن اچانک وہ اعتبار اٹھ گیا۔ شکور سے پہلے ہی پروگرام طے ہو گیا تھا۔ پھوپھا جان کو میں نے صبح کو بتایا۔ وہ وہاں میرے قیام کا آخری دن تھا۔

"آج میں ذرا ایلورا کا ایک پھیرا لگا آؤں۔"

"ایلورا۔" پھوپھا جان تو سکتہ میں آ گئے "تم اپنی پھوپھی سے ملنے آئے تھے یا بتوں کے درشن کرنے آئے تھے۔"

"سوچا کہ یہاں آیا ہوں تو ایلورا کو بھی دیکھتا چلوں۔"

پھوپھا جان چپ ہو گئے۔ پھر بولے "بت خانہ تو ماشاء اللہ تمہارے پاکستان میں بھی موجود ہے۔ سنا ہے کہ اسلام آباد ہی کی بغل میں کفرستان بھی ہے۔ کوئی ٹیکسلا نام کی بستی ہے جہاں کہتے ہیں کہ کوئی قدیمی بت خانہ ہے۔ اور بت وہاں جس طرح پاکستان سے پہلے آراستہ تھے ویسے آج بھی آراستہ ہیں۔" پھوپھا جان نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس بھرا "فاعتبروا یا اولی الابصار۔ پاکستان والوں کے یہی اعمال تو ہیں جن کی اب انہیں سزا مل رہی ہے۔"

پھوپھا جان یہ دیکھ کر بہت مایوس ہوئے کہ ان کے اس وعظ کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شکور کو میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار دیکھا تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ "اچھا صاحبزادے نے تمہیں گمراہ کیا ہے۔ کمبخت خود دین سے بے بہرہ ہے۔ دوسروں کو بھی ورغلاتا ہے۔"

جب میں چلنے لگا تو بولے "تم مہمان ہو۔ اتنے دن بعد آئے ہو۔ ہم تمہیں کیا کہیں۔ بتوں کو دیکھنے پر مصر ہو تو جاؤ اللہ تمہارے اس گناہ کبیرہ کو معاف کرے۔ خیر جا ہی رہے ہو تو ایک بات کا دھیان رکھنا۔ راستہ میں حضرت عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کا مزار پر انوار آئے گا۔ خدا توفیق دے تو وہاں قدرے توقف کر کے فاتحہ پڑھ لینا۔"

(12)

واپس آنے کے بعد کچھ دنوں تک میں اسی سحر میں رہا۔ لگتا تھا کہ ابھی وہیں ہوں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ خواب دیکھتے دیکھتے اچانک آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ تو کھل گئی، مگر ذہن ابھی تک اسی خواب کی فضا میں بھٹک رہا ہے۔ تو آپ آنکھیں موندے پڑے ہیں۔ اور سمجھ رہے ہیں کہ ہنوز خواب میں ہیں۔ بس کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ اب تک میں اسی رو میں چل رہا تھا۔ اسی رو میں مجو بھائی کے سامنے بہت کچھ بکار بیٹھا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ تنگ ظرفی تھی۔ لیکن میں کرتا بھی کیا۔ اس خوشبو کو کتنے دن اندر سنبھال کر رکھ سکتا تھا۔ ایسی صورتوں میں ظرف بالعموم چھوٹا رہ جاتا ہے۔ کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی کے سامنے آدمی ضرور کھلتا ہے۔ اور مجھے مجو بھائی ہی کے سامنے کھلنا تھا۔ انہوں نے بھی شاید کچھ بھانپ لیا تھا۔ آخر دیکھ نہیں رہے تھے کہ میں اپنی کیفیت میں مگن ہوں اور ارد گرد کو خاطر میں نہیں لا رہا۔ انہوں نے ٹوہا اور میں کھلتا چلا گیا۔ پتہ نہیں کیا کیا کہہ ڈالا۔ ہوش اس وقت آیا جب انہوں نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "اچھا۔ اور پھر تم بھاگ کھڑے ہوئے۔"

کچھ اس طریقہ سے کچھ ملامتی کچھ طنزیہ لہجہ میں یہ فقرہ کہا کہ میں بغلیں جھانکنے لگا۔ "ہاں بس پھر میں اکھڑ گیا۔"

"گویا جب جمنے کا وقت آیا تو تم اکھڑ لئے۔"

اس فقرے پر میں اور سٹپٹایا۔ "پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا۔ ویسے صورت

ہی ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ مجھے اب اس گھر میں ٹکے رہنا دشوار نظر آ رہا تھا۔ سمجھ تو یہ رہا تھا کہ دنوں میں یہاں کیسا رچ بس گیا ہوں۔ اچانک یہ صورت پیدا ہو گئی۔ اورنگ آباد مجھے ویسے ہی جانا تھا۔ بس اس بہانے فوراً ہی نکل کھڑا ہوا۔"

"بندۂ خدا، واپسی میں چند دن ٹھہر کے دیکھا ہوتا۔"

"ہمت نہیں پڑی۔"

مجو بھائی چپ رہے۔ پھر سوچتے ہوئے بولے "یار یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"کیا اچھا نہیں کیا؟"

"تمہیں وہاں رکنا چاہئے تھا۔ اس وقت چلے گئے اچھا کیا۔ واپسی میں رکنا چاہئے تھا۔"

"مجو بھائی، آپ میری پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ رک کر کیا کرتا۔ اس نے تو بات ہی ختم کر دی تھی۔"

"خدا کے بندے، بات تو یہاں سے شروع ہوئی تھی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ مجو بھائی۔"

"اس وقت تمہیں احساس نہیں ہے۔ لیکن آگے چل کر تمہیں احساس ہو گا کہ تم نے کیا کیا ہے، اپنے ساتھ بھی اور اس کے ساتھ بھی۔ پھر یہ احساس تمہیں بہت ستائے گا۔"

مجو بھائی کی ملامت نے مجھے بے اطمینان کر دیا۔ ظاہر میں تو میں انہیں جھٹلا رہا تھا، ان کی ہر بات کو رد کر رہا تھا۔ لیکن اندر یہ خیال شدت پکڑتا جا رہا تھا کہ مجو بھائی صحیح کہہ رہے ہیں۔ بس اس خیال نے مجھے بے اطمینان کر دیا۔ میں اس ذکر کو اب زیادہ دیر جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔

"اچھا چھوڑیں اس ذکر کو۔" میں نے زچ ہو کر کہا "کوئی اور بات کریں۔"

"مثلاً اندلس کی۔" مجو بھائی نے طنزاً کہا اور پھر رک کر بولے "ایک تو میں یہ بات دیکھ رہا ہوں کہ وہاں سے آ کر تم تاریخ پر بہت رواں ہو گئے ہو۔ کیا وہاں کوئی تاریخ کی کتاب تمہارے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اب صورت یہ ہے کہ میں تم سے پوچھتا ہوں معاملہ کی بات تم جواب میں ایران توران کی ہانکنے لگتے ہو۔ کبھی غرناطہ کی، کبھی

قرطبہ کی۔ اچھا طریقہ نکالا ہے بات کو گول کرنے کا۔"

"مجو بھائی، خدا کا خوف کرو۔ کیسی تاریخ میں تو اپنے وہاں کے درختوں کی بات کر رہا تھا۔ بیچ میں جانے کیسے کھجور کا پیڑ آگیا۔ اور وہاں سے پتہ نہیں کیسے---------"

"کیسے کیا۔ زقند لگانے کے تو تم بادشاہ ہو۔"

یہاں بھی مجو بھائی شاید سچے تھے۔ کتنی باتیں میں بے خیالی میں کر رہا تھا۔ مجو بھائی تہہ میں جا کر کوئی نکتہ نکالتے اور اس طرح اس میں سے بات نکالتے کہ میں ان کا منہ دیکھتا رہ جاتا۔ پتہ نہیں وہاں سے واپسی کے بعد میں کس رو میں کن کن سمتوں میں بہنے لگا تھا۔ مجھے اپنی طرف سے تشویش پیدا ہو چلی تھی۔ یہ تو اچھے آثار نہیں ہیں۔ مجھے اپنی نگرانی کرنی چاہئے۔ ورنہ اچھا خاصہ مراقی بن کر رہ جاؤں گا۔ سوچا کہ اس مراق سے نکلنے کا ایک راستہ تو وہی ہے جو مجو بھائی نے دکھایا تھا۔ اسی مخلوق میں جس سے انہوں نے متعارف کرا دیا ہے۔ پھر ملنا جلنا شروع کریں۔ واپسی کے بعد ابھی تک ان میں سے کسی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی نہ اس طرف طبیعت آئی تھی۔ مگر اب گویا یہ ملاقاتیں میری ضرورت بن گئی تھیں۔

"مجو بھائی، اس مجرم پر کب تک جرح کرو گے۔ کہیں چلنے کا ارادہ نہیں ہے۔"

"بولو کہاں چلیں۔"

"اپنے کربلائی صاحب کا کیا حال ہے۔ ادھر نہ چلیں۔"

"کربلائی صاحب" مجو بھائی زور سے ہنسے "تمہارے کربلائی صاحب تو کوچ کر گئے۔"

"کوچ کر گئے۔" میں گھبرا گیا۔

"نہیں نہیں ویسے تو بقید حیات ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ پاکستان سے ان کا دانہ پانی اٹھ گیا۔"

"لو مجھے تو آپ نے ڈرا ہی دیا تھا۔ اچھا تو کہاں گئے۔ کربلا یا شکارپور۔"

"کربلا نہ شکارپور۔ سیدھے امریکہ۔"

"امریکہ۔" میں حق دق رہ گیا۔

یہاں سے مجھے احساس ہوا کہ میرے پیچھے کیا کچھ ہو چکا ہے۔ پھر جو میں نے اردگرد نظر ڈالی تو میری حیرانی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اچھا تو میرے پیچھے یہ کچھ ہو چکا ہے۔ ویسے تو وہی نقشہ تھا۔ مگر اس میں ابتری اب زیادہ آ گئی تھی۔ شہروں کا حال اکثر خراب ہوتے دیکھا گیا ہے۔ مگر خرابی بھی آتے آتے آتی ہے۔ ایک مدت کے بعد احساس ہوتا ہے کہ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ یہاں اس کی تیز رفتاری نے مجھے خوفزدہ کیا۔ میں بھلا کونسا لمبی مدت کے لئے شہر سے نکلا تھا۔ چند دنوں میں اتنا کچھ ہو گیا۔ خیر ہاں وہ کربلائی صاحب والی بات۔

"مجو بھائی، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کربلا یا شکارپور؟------- ان کا مسئلہ تو یہ تھا۔"

"ان کا جو بھی مسئلہ ہو، فیصلہ تو سیدانی چچی اور ان کے بیٹے کو کرنا تھا۔ ماں بیٹے کے متحدہ محاذ کے سامنے کربلائی چچا کی کیا چلتی۔ بیٹا آیا۔ جھٹ پٹ ماں باپ اور بہن کے ویزے بنوائے، تینوں کو ہانک کر لے گیا۔

"بیچارے کربلائی صاحب۔" میں اداس ہو گیا۔

"پیارے یہ ہوتی ہیں زندگی کی بوالعجبیاں۔"

"ہم خواب کیا دیکھتے ہیں اور تعبیر کیا نکلتی ہے۔"

"اللہ میاں کی شان ہے، امریکہ کے خواب دیکھنے والوں کو شکارپور پہنچا دیتا ہے۔ شکارپوریوں کو امریکہ کی ہوا کھلاتا ہے۔" مجو بھائی ہنسے پھر بات بدلتے ہوئے بولے "خیر یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ یاد آیا۔ آغا حسن کا فون بھی آیا تھا۔ سوچیں گے کہ منہ چھپا رہا ہے۔ چلو ادھر چلتے ہیں۔"

"ہاں کہاں تک پہنچی مہم۔ میرٹھ اور لکھنؤ کا ٹانکا ملا۔"

"اماں کہاں ملا۔ اس میں تو کھنڈت پڑ گئی۔"

"وہ کیسے؟"

"ہوا یوں کہ توصیف نے دلّی میں سی ایس پی کا امتحان دے ڈالا تھا۔ اماں وہ تو سچ مچ کامیاب ہو گیا۔"

"چلو اچھا ہوا۔"

"ویسے تو اچھا ہوا۔ مگر یہ کمبخت کامیابی اچھے بھلے ہوتے رشتہ کو لے بیٹھی۔ پوچھو کیسے۔ آقا حسن اور ان کی بیگم صاحب کہاں تو ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جا رہے تھے۔ کہاں یہ خبر سنتے ہی موم ہو گئے۔ سید کا سوال بالائے طاق۔ رشتہ منظور، تقاضا کہ فوراً نکاح ہو جانا چاہئے۔ ادھر تمہارے میرٹھی لوگ ایک دم سے عرش میں جھولنے لگے۔ اب سادات لکھنؤ بھی انہیں اپنے سے کم مرتبہ نظر آتے ہیں۔ سو اب وہ اس رشتے سے رسہ تڑا رہے ہیں۔ اب جواد میاں ہماری پوزیشن پہ غور کرو۔ میرٹھ اور لکھنؤ کے بیچ ولے جا رہے ہیں۔"

"مجو بھائی، آپ کے ساتھ یہی ہونا تھا۔ منگنی بیاہ کے قضیوں میں پڑنے کی قیمت کبھی تو ادا کرنی ہی تھی۔"

"آقا حسن کی بیگم صاحبہ نے تو مجھے گردن سے پکڑا ہوا ہے۔ بس پوچھو مت، بہت مشکل میں ہوں۔"

مجو بھائی واقعی مشکل میں تھے۔ بھابی بھابی کہتے ان کی زبان سوکھ رہی تھی۔ مگر وہ لکھنؤ والی یوں کہاں انہیں بخشنے والی تھیں۔

"اے بھین مجو بھائی، ہم یہ پوچھیں ہیں کہ ان میرٹھ والوں نے ہمیں کیا ردوا کھدوا سمجھا ہے۔ پہلے تو ہماری بٹیا کا نام لیا اور ایسا لیا کہ ہماری دلیز کی دھول لے گئے اور جب ہم نے مروت میں ہاں کر لی تو گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھ گئے۔ ارے مروت ہی میں ہاں کیا تھا۔ ویسے ان کے بیٹے میں کونسے لعل ٹنکے ہیں۔ غیر سید کو تو ہم اپنی چھنگل بھی نہ دکھائیں۔ اور پھر یہ تو ویسے بھی گنوارو لوگ تھے۔ مگر ہم نے سوچا کہ چلو نہ سہی سید۔ ہم مذہب تو ہیں۔ اور اپنے ادھر کے ہیں۔ اور اب ہم لکھنؤ میں تو ہیں نہیں کہ عالی نسب سید زادے قطار باندھے نظر آئیں۔ کراچی میں تو یہی کچھ ہے۔ یہ ساری باتیں سوچ کر ہم نے ہاں کر دی تھی۔"

"بھابی مجید الحسینی" آقا حسن نے ٹکڑا لگایا "تمہاری بھاوج سچ کہہ رہی ہیں۔ ہم اس رشتے سے ایسے بہت مطمئن نہیں تھے۔ مگر سوچا کہ زمانہ کونسا جا رہا ہے۔ لکھنؤ کے ٹسے کو بالائے طاق رکھو اور زمانے سے نباہ کرنا سیکھو۔ سو ہم نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا۔ مگر اب ان لوگوں کے تیور ہمیں کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے۔ کچھ کنی کاٹ رہے ہیں۔"

"مگر بھین مجو بھائی، انہوں نے زبان دی ہوئی ہے۔ اور خیر سے تم بیچ میں پڑے ہو۔ ارے سچ پوچھو تو ہم نے تمہارے منہ سے یہ رشتہ قبول کیا تھا۔"

"بھابی، آپ نے جہاں اتنا انتظار کیا اور کرایا ہے وہاں تھوڑا اور۔ میں آج ہی جاکر ان سے پوچھوں گا کہ آخر نیت کیا ہے۔"

"اے مجو بھیا، یہ تم نے کیا بات کہی۔ ہم نے کونسا لمبا انتظار کرایا انتظار تو ہم لکھنؤ میں ہوتے تو کراتے۔ یہ تمہارے دوست بیٹھے ہیں۔ ان سے پوچھو جب خیر سے، ہمارے گھر ان کے پیام آئے تھے تو اماں حضرت نے دو برس تک تو ہنکارا ہی نہیں بھرا۔ نہ ہاں نہ ناں۔ کہیں تیسرے برس میں جاکر جب کنبہ والوں نے بھی انہیں اونچ نیچ سمجھائی اور لڑکے والوں کی طرف سے اطمینان دلایا تو وہ موم ہوئی تھیں۔"

"خیر وہ زمانہ ان لوگوں کے ساتھ گیا۔" آقا حسن نے پھر ٹکڑا لگایا "اب وہ زمانہ ہے کہ لوگ ہتھیلی پہ سرسوں جماتے ہیں۔ آج پیام دیئے کل جواب مانگتے ہیں۔ جواب دینے میں کچھ وقت تو بہرحال ہمیں لینا تھا۔ مگر پھر بھی جلدی ہی جواب دیا۔ اب انہیں کیوں تامل ہے۔"

"بھین ان سے کہہ دو کہ تم نے شریفوں کی بٹیا کا نام لیا ہے اور زبان دی ہے۔ ہم تمہیں مکرنے نہیں دیں گے۔" بشو بھابی نے نوٹس دیا۔

مگر ادھر وہ مکرنے کے لئے بس بہانہ تلاش کر رہے تھے۔ بلکہ شاید کر بھی لیا تھا۔ توصیف کی باجی اب اونچی ہواؤں میں تھیں۔ ایسی کہ زمین پہ پاؤں نہیں رکھ رہی تھیں۔

"مجو بھائی خدا لگتی کہنا۔ ان نکھلئو والوں نے ہمیں کتنے پھیرے لگوائے۔ ہاں سوچیں گے، ابھی تو ہماری بٹیا پڑھ رہی ہے۔ اس کے امتحان ہو جائیں تو پھر سوچیں گے۔ پڑھنا نہ ہوا شیطان کی آنت ہو گئی۔ پڑھاتے رہیں بٹیا کو۔ ہمیں افلاطون بہو نہیں چاہئے۔ میرے بھیئے کو اپنا گھر بسانا ہے، لائبریری تھوڑا ہی کھولنی ہے۔ اور ان نکھلئو والوں کا ٹھسا الہٰی توبہ۔ ہم عالی نسب ہیں۔ ارے کم ذات تو ہم بھی نہیں ہیں۔ رکھیں اپنی عالی نسبی کو اپنے پاس۔"

"وہ تو خیر آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" مجو بھائی نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش

کی۔ "یہ لکھنؤ والے اپنی روایات کے مارے ہوئے ہیں۔ ہمیشہ تامل کر کے جواب دیتے ہیں۔ بہرحال رشتہ تو انہوں نے منظور کر لیا تھا۔"

"مجو بھائی۔ انصاف کی بات کرو۔ آخر ہم بھی تمہارے کچھ لگتے ہیں۔ رشتہ انہوں نے کب منظور کیا۔ پہلے تو انہوں نے ہمیں منہ ہی نہیں لگایا۔ اور نکھٹو والی نے تو ہمارے متعلق یہاں تک کہا کہ یہ تو میرٹھ کے قینچیوں والے ہیں۔ مگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ لڑکے نے تو مقابلہ کا امتحان پاس کر لیا ہے اور خیر سے بڑا افسر بنے گا۔ پھر ان کے کان میں یہ بھی بھنک پڑ گئی کہ پیلی بھیت والے ہمارے گھر بت آ جا رہے ہیں تو انہوں نے جھٹ ہاں کر دی۔"

"بہرحال ہاں کر تو دی۔"

"اب ہاں کرتے رہیں۔ رات گئی بات گئی۔ ہم ان کی ہاں کے انتظار میں کب تک سوکھتے رہتے۔ ہمارے بھیئے کے لئے لڑکیوں کی کمی تھوڑا ہی ہے۔ اور کمی تو اس وقت ہو جب اس میں کوئی کمی ہو۔ خیر سے اب ضلع کا حاکم بنے گا۔ تھانے چوکی میں اس کا حکم چلے گا۔ اور عادت خصلت جو اس کی ہے وہ تو تم جانو ہی ہو۔ میرا بھیا ہیرا ہے۔ ایسے لڑکے اس زمانے میں ملتے کہاں ہیں۔ ایسے لڑکے کو بھی اگر کوئی ٹھکرا دے تو پھر اس کی بٹی کے لئے عرش کا تارا ہی اترے تو اترے۔ اب بیچارے پیلی بھیت والے بھی تو ہیں۔ کیسی عاجزی سے بات کرتے ہیں۔ اور ایسے ویسے تھوڑا ہی ہیں۔ پیچھے سے رئیس چلے آ رہے ہیں۔ اور بٹی کیسی سلیقہ مند اٹھائی ہے۔ ماں تو باورچی خانے میں قدم بھی نہیں رکھتی۔ سارا پکانا ریندھنا وہی کرتی ہے۔ ماشاء اللہ پورے گھر کو سنبھال رکھا ہے۔ ایک ان کی بٹیا ہے۔ روٹی تک تو پکا نہیں سکتی۔ ایک دن انہوں نے مجھے کھانے پہ روک لیا تھا۔ میں تو اس کے ہاتھ کی پکائی ہوئی روٹی دیکھ کے حیران رہ گئی۔ کچے لوندے پکا کے رکھ دیئے تھے۔"

"اچھا تو باجی آپ نے گویا پیلی بھیت والوں کے ساتھ رشتہ طے کر لیا۔"

"نا بھیا، ابھی طے وے کچھ نہیں ہوا۔ ابھی تو میں انہیں نوہ رہی ہوں۔ خوب چھان بین کروں گی۔ ابھی ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ نہ اچھی لڑکیاں بھاگی جا رہی ہیں۔ نہ ہمارے لڑکے کی عمر جا رہی ہے۔ ہمارے توصیف کی عمر ابھی ہے ہی کیا۔ اے لو پچھلے

سے پچھلے برس ہی تو میں نے اس کی مونچھوں کا کونڈا کیا تھا۔ تو میں تو خوب دیکھ بھال کے دلہن لاؤں گی اور دیکھتے رہنا ایسی لاؤں گی کہ میرے بھتیجے کے گھر میں اجالا ہو جائے گا۔ اور پھر ایسی کہ میاں کے کہنے میں رہے اور میری خدمت کرے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ اب تو میں یہ چاہوں ہوں کہ کوئی ایسی آوے کہ میں پلنگ پہ بیٹھی رہوں۔ بس میں ہوں اور میرا پاندان ہو۔ وہ میرا سر دبائے، آگے کھانا لگائے۔"

"ہاں بہت جائز خواہش ہے۔" مجو بھائی بولے "میں تو صرف اس نقطہ نظر سے کہہ رہا تھا کہ لڑکی سمجھدار ہے، پڑھی لکھی ہے۔"

ہائے مجو بھائی، ان پڑھی لکھیوں سے تو اللہ بچائے۔ انہوں نے تو گھروں کے بٹوارے کرا دیئے۔ کالج سے یہی تو سیکھ کے نکلتی ہیں۔ ڈولی سے اترتے ہی چھچھوندر چھوڑ دیتی ہیں کہ ہم تو الگ رہیں گے۔ ساس نندیں تو انہیں زہروں بری لگتی ہیں۔ ہمارے بڑے ابا، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہا کریں تھے کہ جس بہو نے ساس کے ستم نہیں سے سمجھ لو کہ وہ آوارہ ہے۔"

مجو بھائی مسکرائے "اچھا کلیہ ہے۔"

"اے مجو بھائی، وہ غلط تھوڑا ہی کہویں تھے۔ ویسے ہمارے بڑے ابا ایسے ویسے سسر نہیں تھے۔ ہماری بڑی اماں جتنی نرم تھیں اتنے ہی وہ سخت تھے۔ بڑی اماں کی کیا پوچھو ہو۔ وہ تو اللہ میاں کی گائے تھیں۔ ہماری اماں کو تو وہ بیٹی کی طرح چاہتی تھیں۔ جب وہ بیاہ کے آئی ہیں تو بڑی اماں نے گھر کی چابیاں اور باورچی خانہ ان کے سپرد کر دیا تھا۔ مگر بڑے ابا، ارے انہوں نے تو کبھی ہماری اماں کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا۔ کہا کریں تھے کہ بہوؤں کا کیا اعتبار۔ کسی بھی دن ساس سسر کو زہر دے دیں۔ ویسے تو معمولی سی بات تھی۔ ابا جی نے کہیں بھولے سے اماں سے یہ کہہ دیا کہ کتنے دن ہو گئے ہم نے پراٹھا نہیں کھایا۔ اماں بیچاری نے اپنی سادگی میں اگلے دن ناشتے پر ابا جی کے لئے پراٹھے پکا دیئے۔ کہیں بڑے ابا کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی۔ اچھا تو شوہر کے لئے پراٹھے اور سسر کے لئے خالی چپڑی روٹی۔ پھر تو انہوں نے اماں کے ہاتھ کا پکا کھانا ہی اپنے اوپر حرام کر لیا۔ ابا جی نے کہا، اچھا جیسی آپ کی مرضی۔ اور ان کے لئے الگ ایک باورچن رکھ دی۔ مگر بھیا یہ تو بھلے وقتوں کی باتیں ہیں۔ نئی بہوؤں کے ساتھ ایسا کوئی کر کے دیکھے۔

اگلے دن اخباروں میں خبر چھپ جاوے گی۔ مجو بھائی، بہت برا زمانہ آگیا ہے۔"

"ہاں" مجو بھائی نیم دلی سے تائید کرتے ہوئے بولے۔ "اب وہ پہلا سا زمانہ تو نہیں رہا۔ یہ نیا زمانہ ہے۔ اس کے نئے طریقے ہیں۔"

"نیا زمانہ۔ ارے چودھویں صدی کو چودھویں صدی۔ کمبختیں ایسی حرافہ ہووے ہیں کہ آسمان میں تھگلی لگاویں ہیں۔ اور لڑکے ایسے بدھو کہ انہوں نے جدھر ہانک دیا ادھر ہنک گئے۔ اور یہ توصیف یہ تو جورو کے اشاروں پہ ناچے گا۔"

"باجی، مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے۔" آخر توصیف نے زبان کھولی۔

"ہاں ہاں کہہ جو دل میں ہے وہ کہہ دے۔ مجھے پتہ ہے تو اس پہ لٹو ہے۔"

"میں اس پہ لٹو توبہ توبہ۔"

"ارے باتیں مت بنا۔ مجھے تو نے کیا سمجھا ہے۔ ارے میں تو اڑتی چڑیا کے پر گن لوں۔ اور تیرے تو میں نے پوتڑے دھوئے ہیں۔ تیری تو میں ایک ایک رگ سے واقف ہوں۔ مجو بھائی، سچ جانیو۔ اماں نے تو اسے بس جنا تھا۔ باقی تو اس کا سارا گو موت میں نے کیا تھا۔ گودوں میں اسے کھلا کھلا کے ہلکان ہوگئی۔ بڑا ہونے پہ اس کے لئے پیروں فقیروں کے دروں پہ حاضریاں دیں۔ تعویذ گنڈے کرائے، وظیفے پڑھے، آنچل پھیلا پھیلا کے دعائیں کیں کہ محمدؐ و آل محمدؐ کے صدقے میں امتحان میں اول نمبر آوے، ضلع کا حاکم بنے، سو بن گیا۔ مگر اب بہن سے اسے کیا لینا۔ اب تو وہ اس مردار کا کلمہ پڑھے گا۔"

"باجی، کس مردار کا۔"

"ارے جا جا میرا منہ مت کھلوا۔ مگر کان کھول کر سن لے۔ اگر تو نے میری مرضی کے خلاف کرلی تو وہ پٹک پیا ڈالوں گی کہ شہر تراہ تراہ کرے گا۔ ویسے میں آنے والی کا برا نہیں چاہتی۔ اللہ اسے موتیوں میں سفید اور سونے میں پیلا کرے، مگر ایسی ہو کہ ہم برادری میں منہ دکھانے والے بنیں۔ ویسے اچھی لڑکیوں کا اوڑا تھوڑا ہی پڑ گیا ہے۔ میرے اختیار میں ہوا تو انشاء اللہ تعالیٰ بلی کا منہ کالا ایسی لاؤں گی کہ گھر میں اجالا ہو جاوے گا۔ مگر ایک بات کہے دیتی ہوں کہ میں کوے ہنکنی بن کے نہیں رہوں گی۔ آنے والی کو بیشک راج رجانا۔ جتنا اس کا حق ہے اسے ملے، جتنا بہن کا حق ہے اتنا بہن

کو ملے۔"

وہ بی بی رواں تھی۔ اور مجو بھائی پریشان کہ اب کیا کیا جائے۔ ان کی تو ساری محنت اکارت گئی۔ لکھنؤ اور میرٹھ کے درمیان جو معتبر بننے کا شرف حاصل کیا تھا وہ شرف ہاتھ سے جاتا نظر آ رہا تھا۔ پہلی مرتبہ میں نے ان کے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھے ورنہ ایسے قصے قضیوں میں پڑ کر تو وہ ہمیشہ خوش ہوئے اور سرخرو بن کر نکلے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عین اس گھڑی جب باجی اختری گرمی کھاتے کھاتے نقطہ عروج پہ پہنچ چکی تھیں۔ غازی صاحب آن نازل ہوئے۔ اسی طرح سر پہ سبز عمامہ، بر میں گھٹنوں سے نیچا کرتا، ٹخنوں سے اونچی شلوار، ہاتھ میں گردش کرتی ہوئی تسبیح۔ میں نے پہلی بار انہیں اسی گھر میں کباب پراٹھوں والی دعوت میں دیکھا تھا۔ شاید انہوں نے بھی پہلی ہی بار اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ باجی اختری اس وقت ان کی ہیئت دیکھ کر صرف مرعوب ہوئی تھیں۔ عقیدت منداس وقت ہوئیں جب توصیف کے سی ایس پی کے امتحان میں کامیابی کی خبر آئی۔ تب انہیں احساس ہوا کہ اصل میں یہ اس گھر میں غازی صاحب کے قدموں کی برکت سے ہوا کہ توصیف کو ازغیبی افسری مل گئی۔ وہ خود تو ان کی عقیدت مند بنی ہی تھیں مگر اس کوشش میں رہتی تھیں کہ دوسرے بھی ان کے عقیدت مند بن جائیں۔ پتہ نہیں مجھ میں ایک عقیدتمند بننے کے آثار انہیں کیسے نظر آئے ایک روز کہنے لگیں "اے بھیا جواد، تم غازی صاحب سے رجوع کیوں نہیں کرتے۔"

میں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "کس سلسلہ میں؟"

"مجھے تم بہت پریشان نظر آتے ہو۔ غازی صاحب تعویذ گنڈے کے تو قائل نہیں ہیں، مگر دعا کے قائل ہیں۔ پانی پہ ایسی دعا پڑھتے ہیں کہ اسے پینے سے ساری پریشانیاں دور ہو جاوے ہیں۔ سچی بات ہے ہمارے دلدر تو غازی صاحب کی دعا ہی سے دور ہوئے ہیں۔ توصیف کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ کسے امید تھی کہ وہ مقابلہ کے امتحان میں پاس ہو گا۔ اصل میں غازی صاحب نے اس کے لئے دعا کی تھی۔ تم بھی غازی صاحب سے اپنے لئے دعا کراؤ۔"

"مگر مجھے تو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے۔"

"اے ہے اس میں چھپانے کی کیا بات ہے۔ پریشانیاں تو آدمی کے ساتھ ہیں۔

اور تمہاری تو صورت بتا رہی ہے کہ تم آج کل بہت پریشان ہو۔"

"یہ آپ کا خیال ہے۔"

"اچھا بھیا، تم سچے میں جھوٹی۔ بھیا شک مت کرنا۔ میں کسی کے برے میں نہیں ہوں۔ سب کے ساتھ اب تک نیکی ہی کی ہے۔ کوئی نہ مانے یہ اور بات ہے۔ اب بھی کوئی مانے یا نہ مانے میں ہر ایک کو بتا دیتی ہوں کہ غازی صاحب کی دعا میں بہت اثر ہے۔ اور کتنوں کو میں نے ان سے پانی پڑھوا کے دیا ہے۔ جسے بھی دیا وہ غازی صاحب کا کلمہ پڑھنے لگا۔ تو بھیا میں نے تمہارے بھلے ہی کی کہی تھی۔"

خیر یہ ذکر تو بیچ میں نکل آیا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس وقت غازی صاحب سچ مچ فرشتہ رحمت بن کر نازل ہوئے۔ باجی اختری جو دریا کی مثال رواں تھیں تھم گئیں۔ مجو بھائی کو بھی سانس لینے کا موقعہ ملا۔ وہ فوراً ہی غازی صاحب سے مخاطب ہو گئے۔ "قبلہ غازی صاحب آپ کی تحریک اب کس مرحلہ میں ہے۔"

غازی صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا "عزیز کیا پوچھتے ہو۔ مسلمانوں کا جذبہ جہاد سرد پڑ چکا ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ پاکستان کی آبادی کتنی ہے۔ چھوٹا ملک تو نہیں ہے۔ مسلمانوں کی آبادی یہاں کروڑوں میں ہے۔ مگر مجھے ابھی تک تین سو تیرہ مسلمان دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ خدا کی شان خلقت اتنی۔ اور سب کلمہ گو، مگر مسلمان ندارد۔ میری دیوانگی تین سو تیرہ مسلمانوں کو پکار رہی ہے۔ مگر تین سو تیرہ مسلمان اس کرۂ ارض پر اب ہیں کہاں۔"

"ہاں ہے تو یہ افسوس کی بات۔" مجو بھائی کہنے لگے "مگر قبلہ آخر اتنی خلقت جو پاکستان میں بسی ہوئی ہے اور کراچی میں امنڈی پڑ رہی ہے وہ مسلمانوں ہی کی ہے۔ آپ کی تحریک کی طرف وہ مائل نہ ہوں یہ اور بات ہے۔"

"میرے عزیز، آپ انہیں مسلمان کہتے ہیں۔ مجھے تو ان میں کوئی مسلمان نظر نہیں آتا۔ سیرت تو جانے دیجئے وہ تو صورت سے بھی مسلمان نظر نہیں آتے۔ ڈاڑھی مونچھیں صاف، شرعی لباس ندارد، وہی عیسائیوں والا لباس، ٹائی کوٹ، پتلون، میں تو سوچتا ہوں اور ساتھ میں افسوس کرتا ہوں کہ اس بد انجام خلقت کی روز محشر شناخت کیسے ہوگی۔ بالفرض محال شناخت ہو گئی۔ مگر اس سے بھی بڑا سوال نماز کا ہے۔

روز محشر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسش نماز بود

ذرا سوچو کہ ان میں کتنے لوگ ہوں گے جو باقاعدگی سے پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہوں۔

تجھے نماز کی فرصت نہیں تعجب ہے

اور نماز پڑھنے والوں میں کتنے ایسے ہیں جن کی نماز واقعی نماز ہوتی ہے۔ عزیز انصاف کرو اور ہمیں بتاؤ۔"

"آپ صحیح فرماتے ہیں قبلہ۔"

"میں تو ایک سیدھی سی بات جانتا ہوں کہ اگر یہ لوگ واقعی مسلمان ہوتے تو پھر ایٹم بم ان کے پاس ہوتا، اغیار کے پاس نہ ہوتا۔" رکے۔ پھر بولے "غضب خدا کا نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر کلمہ گو ہی کلمہ گو۔ مگر سینے سوز دروں سے خالی، دل گداز سے عاری، روحیں ویران، کیا انجام ہو گا ان لوگوں کا۔ میرے عزیز، میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

"آپ بجا فرما رہے ہیں۔" مجو بھائی نے پھر تائید میں سر ہلایا۔

"خیر جتنے بھی مسلمان نوجوان میری تحریک میں شامل ہوئے ہیں۔

وہ ماشاء اللہ سب صاحب ایمان ہیں، دلوں میں جذبے کی حرارت ہے۔ میں نے انہیں ایک ہی درس دیا ہے کہ اے نونہالان اسلام اور اے فرزندان توحید، بس یہ سمجھ لو کہ یہ جو زندگی تمہیں ملی ہے وہ تمہاری نہیں ہے۔ یہ تمہارے پاس بطور امانت ہے۔ امانت میں خیانت جائز نہیں ہے۔ جس کی امانت ہے اس کو جلد سے جلد یہ امانت لوٹا دینی ہے۔ سو شہادت کے لئے تیار رہو۔ اور میرے عزیز مجو بھائی، یقین جاننا وہ تیار ہیں۔ سر بکف پھرتے ہیں۔ جوش جہاد سے ابلے پڑتے ہیں۔ مگر غافل مسلمانوں پر حیف ہے۔ میں چلا رہا ہوں وہ سرسوں کا تیل کانوں میں ڈالے بیٹھے ہیں۔ مگر میں نے غلط کہا۔ یہ مسلمان ہیں کہاں۔ اگر کسی کو مسلمان ہونے کا دعویٰ ہے تو میرے سامنے آئے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں۔ میرے عزیز مجو بھائی، میرے رضاکار بیتاب ہو کر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ کافر ہیں تو انہیں ہماری صفوں میں گھسے

رہنے کی اجازت کس نے دی ہے۔ اور انہیں زندہ رہنے کا کیا حق ہے۔ میں انہیں سمجھاتا ہوں کہ اے جوانان اسلام، تحمل سے کام لو۔ وقت آئے گا کہ ہم ان سے باز پرس کریں گے۔ وہ کسمسا کر رہ جاتے ہیں۔ مگر میرے عزیز مجو بھائی، میں کب تک ان کی اس گزارش سے اغماض برت سکتا ہوں۔ آخر مجھے بھی حشر میں جواب دینا ہے۔ جب اس عاصی پر معاصی سے پوچھا جائے گا کہ اے عطاء اللہ، تو نے نام نہاد مسلمانوں کو راہ حق سے منحرف ہوتے دیکھا اور خاموش رہا۔ اب تو جہنم کی آگ میں جل۔ جب میں جہنم کی آگ کا تصور کرتا ہوں تو میرے بدن میں رعشہ آجاتا ہے، مجھ پہ رقت طاری ہو جاتی ہے۔" اور سچ مچ غازی صاحب پہ رقت طاری ہو گئی۔

غازی صاحب کو گریہ کرتے دیکھ کر باجی اختری پہ بھی رقت طاری ہو گئی۔ انہوں نے دوپٹے کا آنچل منہ پہ رکھ لیا۔ توصیف ہڑبڑا کر اٹھا اور پانی کا گلاس لے کر آیا "قبلہ پانی پیجئے۔"

میں نے مجو بھائی کی طرف ہراساں نظروں سے دیکھا۔ وہ جیسے اشارے کے منتظر ہی ہوں۔ فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی معذرت کو باجی اختری اور توصیف نے بے توجہی سے سنا۔ ٹھہرنے پر ذرا جو اصرار کیا ہو۔

ہم باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دروازے پر پجارو کھڑی ہے۔ اندر کلاشنکوف بردار رضاکار بیٹھے ہیں جنہوں نے ہمیں شک بھری غصیلی نظروں سے دیکھا۔

"مجو بھائی۔" میں نے آہستہ سے کہا "یہ کیا چکر ہے؟"

"خاموش۔" مجو بھائی نے آہستہ سے کہا۔ "یہ غازی صاحب کا محافظ دستہ ہے۔"

محافظ دستہ؟ میں چکرایا۔ غازی صاحب کو محافظ دستے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ مگر مجو بھائی میری کسی بات کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔

گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ رفیق صاحب آن وارد ہوئے۔ "ارے جواد صاحب، آپ آ گئے۔" وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ آپ لمبا وقت گزار کر آئیں گے۔"

"سن رہے ہو جواد میاں، رفیق صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ وہی جو میں کہہ رہا

تھا۔" اور پھر مجو بھائی رفیق صاحب سے مخاطب ہوئے۔ "رفیق صاحب اگر آپ کہتے ہیں تو ہم مانے لیتے ہیں۔ ویسے مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جواد میاں ابھی واپس نہیں آئے ہیں۔"

رفیق صاحب نے ایک قہقہہ لگایا۔ "مگر مجو بھائی، اس میں جواد صاحب کی کیا تخصیص ہے۔ ہم نے تو اپنے کراچی کے ہر دوست کا معاملہ یہی دیکھا ہے۔ واپس آجاتے ہیں مگر پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابھی واپس نہیں آئے۔"

میں بات کو ٹال گیا تھا مگر پھر اچانک مجھے جھرجھری آئی۔ میں نے کہا "آپ دونوں حضرات ممکن ہے ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں کہ میں ابھی واپس نہیں آیا ہوں۔ مگر میرا احساس دوسرا ہے۔ میں واپس تو آگیا ہوں۔ مگر لگتا یہ ہے کہ جس شہر سے گیا تھا یہ وہ شہر نہیں ہے۔ کوئی اور ہی شہر ہے۔"

"کاش یہ کوئی اور شہر ہوتا۔" رفیق صاحب نے ٹکڑا لگایا۔

"پتہ نہیں۔" میں نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ میں کسی اور شہر میں آگیا ہوں۔ جیسے کوئی داستانی شہر ہو۔"

"اور جیسے تم حاتم طائی ہو۔" مجو بھائی نے ٹکڑا لگایا جسے رفیق صاحب کے قہقہہ نے مزید دھاردار بنا دیا۔

میں بس سمجھو کہ جل بھن کر کباب ہوگیا۔ فوراً جواب دیا "میں تو خیر حاتم طائی نہیں ہوں۔ کیسے بن سکتا ہوں۔ ایسے کردار اس عہد کے نصیبے میں کہاں ہیں۔ یہ شہر البتہ شہر ندا بن چکا ہے۔"

رفیق صاحب ہنستے ہنستے سنجیدہ ہوگئے۔ "جواد صاحب، یہ بات آپ نے بہت صحیح کہی۔" چپ ہوئے پھر سوچتے ہوئے بولے "ہم سب ہی اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں جانے کب کوہ ندا سے کس کی پکار آجائے۔"

مجو بھائی نے رفیق صاحب کو گھور کے دیکھا۔ "آگئے جواد کے پھندے میں۔ تمہیں داستان کے پالے میں لاکر مارا ہے۔ مجھے تاریخ کی مار مار رہا ہے۔"

"پھر مجو بھائی آپ مارے گئے۔ داستان میں تو بھاگنے کے راستے بہت سے ہوتے ہیں۔ مگر تاریخ آدمی کو بھاگنے نہیں دیتی۔"

"تاریخ برحق۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ اس میں سے نکالتے کیا ہیں۔"

"جواد صاحب نے کیا نکالا۔" رفیق صاحب مسکرائے۔

"ابھی تک تو کھجور کا پیڑ ہی اس میں سے برآمد کیا ہے۔"

رفیق صاحب نے قہقہہ لگایا "مجو بھائی، آپ کی تاریخ میں جو ہے وہ ہی اس میں سے برآمد ہو گا۔ جواد صاحب اپنی گرہ میں سے تو اس میں کچھ نہیں ڈالیں گے۔" رک کر "ویسے مجو بھائی، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ پاکستان کی تاریخ کو کھنگالا گیا تو اس سے کیا برآمد ہو گا۔"

"پاکستان کی تاریخ، یار اسے بننے تو دو۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن، ابھی اس میں سے کیا برآمد ہونا ہے۔"

"ایسی بات تو نہیں ہے مجو بھائی۔ اس مختصر تاریخ سے بھی کام کی دو چیزیں تو آسانی سے برآمد ہو سکتی ہیں۔"

"وہ کیا ہیں؟"

"مشاعرے اور کلاشنکوف۔"

مجو بھائی اور رفیق صاحب دونوں ہی اس پر جی بھر کر ہنسے۔

"اچھا چائے پلواؤ گے یا پھر چلوں۔"

"لو ہم تمہیں جانے دیں گے۔" اور مجو بھائی نے فوراً نعمت خاں کو پکارا "یار نعمت خاں۔"

نعمت خاں لپک جھپک آیا "جی؟"

"یار کچھ چائے وائے بناؤ۔ دیکھ نہیں رہے ہو، رفیق صاحب آئے بیٹھے ہیں۔

(13)

یہ اس دن کا ذکر ہے جب ہماری سوسائٹی والوں نے ٹائر جلانے کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ پورا علاقہ دھوئیں سے اٹ گیا۔ دھوئیں سے اور نعروں کے شور سے۔ ویسے دن تو معمول کے مطابق ہی چڑھا تھا، بالکل معمول کے مطابق۔ سرہانے میز پر رکھی گھڑی کے الارم سے میری آنکھ کھلی۔ فوراً ہی کہیں دور سے مرغے کی بانگ سنائی دی۔ ساتھ میں چڑیوں کا میٹھا میٹھا شور۔ روز کی عادت کے مطابق میں کتنی دیر تک بستر میں پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ جاگ جانے پر بھی کتنی مرتبہ آنکھ لگی اور کھلی۔ آخر ہمت باندھ کر ایک دم سے بستر سے اٹھا اور سیدھا باتھ روم میں۔

پھر وہی روز کا وظیفہ۔ اخبار، شیو، غسل، ناشتہ، اخبار میں کونسی ایسی خبر تھی کہ میں اس میں غرق رہتا۔ وہی معمول کی خبریں، ڈاکے، قتل، اغوا، گینگ ریپ، فلاں علاقہ میں ایک موٹر چھین لی گئی۔ فلاں بینک پر کلاشنکوف برداروں کے ایک ٹولے نے دھاوا بولا، مزاحمت کرنے والے چوکیدار کو گولی ماری اور چالیس لاکھ کی رقم لے کر فرار ہو گئے۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کا حکم۔ فلاں شاہراہ سے فلاں صنعت کار کا اغوا۔ پچاس لاکھ تاوان کا مطالبہ، وغیرہ وغیرہ۔

ناشتہ سیدھا سادھا روز والا۔ وہی دو دم، میں اور مجو بھائی۔ ڈائننگ ٹیبل پر مختصر گفتگو آپس میں کم نعمت خان سے زیادہ کہ گھڑی گھڑی لپک جھپک آتا، کبھی گرم گرم توس لے کر، کبھی چائے کی کیتلی اٹھائے، میز پر رکھ اسی طرح ----------

لپک جھپک واپس ہولیتا۔ ناشتہ کے بعد سگریٹ کا ایک دور اور اس کے ساتھ اخبار کی ورق گردانی۔ ہاں آج سگریٹ اور اخبار کا دور ذرا لمبا کھنچ گیا تھا۔ مجو بھائی نے اس پر مجھے ٹوکا بھی تھا۔

"یار، آج تم بڑے اطمینان سے بیٹھے ہو۔ تمہارے بینک کی گاڑی ابھی تک نہیں آئی ہے۔ کیا آج دفتر جانا نہیں ہے۔"

"جاؤں گا، مگر دیر سے۔"

"کتنی دیر سے۔"

"اوہو مجو بھائی، آپ نے تو میری جواب طلبی شروع کر دی۔ میرے دفتر کی آپ کو بہت فکر رہتی ہے۔"

"مجھے تمہارے دفتر کی نہیں، اپنی فکر ہے۔ سوچا تھا کہ تمہارے ساتھ ہی نکل لوں گا۔"

"بالکل ٹھیک سوچا۔ مگر آپ کو کونسا ڈیوٹی پہ جانا ہوتا ہے۔ ذرا دیر بھی ہو جائے گی تو کیا فرق پڑے گا۔"

"مگر تمہیں تو ڈیوٹی پہ جانا ہوتا ہے۔"

"یہی تو بوریت ہے۔ میں اکتا گیا ہوں اس روز کی ہبڑ دبڑ سے۔ مجو بھائی، آپ مزے میں ہیں۔ نہ کوئی پابندی نہ کوئی چنتا۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ میں آپ پہ رشک کرتا ہوں۔ آئیڈیل زندگی ہے۔"

"پیارے، اس کے لئے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔"

"قیمت تو مجو بھائی یوں بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ مجھے دیکھتے نہیں گھن چکر بنا رہتا ہوں۔ بینک کی نوکری۔ مت پوچھو، آدمی کا پلیتھن نکل جاتا ہے۔"

"یار جانے بھی دیا کرو۔ اچھا کام کی بات کرو۔ گاڑی کتنی دیر میں آ رہی ہے۔"

"اصل میں کل میں بہت پدا ہوں۔ میں نے سوچا کہ آج تھوڑے آرام کے ساتھ نکلیں۔ تو میں نے دفتر میں کہہ دیا تھا کہ صبح گاڑی بھیجنا۔ ساڑھے دس گیارہ کے لگ بھگ۔"

"پیارے تم نوکری نہیں کرتے، بادشاہی کرتے ہو۔"

"مجو بھائی، میں چھوڑنے لگا ہوں اس نوکری کو۔"

"وجہ؟"

"بہت پداتے ہیں۔"

"اگلا نہیں پدائے گا؟"

"کچھ منہ کا مزہ بدلے گا۔ وہی ایک روٹین، حد ہوتی ہے۔ آدمی نہ ہوا کولہو کا بیل ہو گیا۔"

"جواد میاں۔" مجو بھائی نے سگریٹ کا لمبا کش لیا "بیویاں اور ملازمتیں کرنے اور چھوڑنے کی ایک عمر ہوتی ہے۔ تمہاری وہ عمر گزر چکی ہے۔ اس عمر میں شرفا کا طور یہ دیکھا گیا ہے کہ بیوی جس قماش کی بھی ہو اور ملازمت جیسی بھی ہو اس کے ساتھ نباہ کرتے ہیں۔"

"پہلی بات کا تو خیر بندے پر اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ دوسری کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں۔ بیوی سے فراغت ہمیں اللہ نے دلائی۔ باقی رہ گیا ملازمت کے سلسلہ میں آپ کا فلسفہ تو اسے قبول کرنے میں بندے کو تھوڑا تامل ہے۔"

ابھی میں نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ باہر سے ایک شور اور شور کے ساتھ نعروں کی آوازیں سنائی دیں۔ مجو بھائی لپک کر کھڑکی پہ گئے۔ جھانک کر باہر نظر دوڑائی، پھر فوراً ہی پلٹے اور تیزی سے نیچے اتر گئے۔ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ محلہ میں پتہ بھی کھڑکتا تو مجو بھائی کے کان کھڑے ہو جاتے۔ کسی کی نکسیر بھی پھوٹ جاتی تو ان کے لئے ایک واقعہ ہوتی۔ سو میں نے ان کی نقل و حرکت کو اپنی طرف سے یکسر نظرانداز کر دیا، یہ سوچ کر کہ یہ روزمرہ والی نعرہ بازی ہے اور مجو بھائی بیچارے اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ پھر اخبار میں غرق ہو گیا۔ مگر کہاں غرق ہوا۔ مجو بھائی جلدی ہی گھبرائے گھبرائے واپس آ گئے۔

"لو بھئی، بھائی لوگ پھر شروع ہو گئے۔"

"کیسے؟" میں نے مجو بھائی کی گھبراہٹ سے مطلق اثر قبول نہیں کیا تھا مگر جب انہوں نے اتنی سنجیدگی سے اطلاع دی تھی تو پوچھنا تو تھا۔

"محلہ کا ایک جوان نقاب پوشوں کی زد میں آ گیا۔ شریف تھا نہیں۔ تم نے تو

اسے کاہے کو دیکھا ہو گا۔ اچھا جوان تھا۔ پچھلے کرفیو میں اس نے بہت پہرے دیئے تھے۔ غریب کو گولی لگ گئی۔ ہسپتال لے گئے ہیں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

مجو بھائی نے ٹھیک کہا۔ شریف کون تھا' کیسا جوان تھا' مجھے کیا پتہ۔ ہر طرح کی اور ہر آدم کی خبر تو مجو بھائی کو رہتی تھی۔ محلہ کا بچہ بچہ انہیں جانتا تھا۔ بچے بچے کو وہ جانتے تھے۔ میں تو اجنبی کی مثال رہتا تھا۔ محلہ میں ڈھائی تین شریف آدمی پہچانتے بھی تھے تو میری دانست میں مجو بھائی ہی کے واسطے سے پہچانتے تھے۔ آدمی جہاں برس برس سے رہ رہا ہو' وہاں اتنا اجنبی ہو۔ مگر میں تو تھا۔ آدمی اگر ہمسایوں کے قصے قضیوں میں سرے سے دلچسپی ہی نہ لے تو اسے کون پہچانے گا۔ ایسے آدمی کو اجنبی تو ہونا ہی ہوتا ہے۔ اب یوں دیکھیے کہ مجو بھائی نے شور سنا اور فوراً ہی جو بھی ہنگامہ تھا اس میں اپنی ساری جذباتیت کے ساتھ شامل ہو گئے۔ میں تھا کہ مجھ پر کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ مجو بھائی نے کس جذباتی انداز میں جوان کو گولی لگنے کی خبر سنائی تھی۔ مجھ پہ ذرا جو اثر ہوا ہو۔ "اچھا۔" میں نے کسی قدر بے تعلقی سے کہا اور چپ ہو گیا۔

"خلقت عباسی شہید ہسپتال پر امنڈی ہوئی ہے لوگوں کی آنکھوں مین خون اترا ہوا ہے۔ اس وقت بھی قابو سے باہر ہیں۔ اگر وہ مر گیا تو پھر حالات بہت بگڑ جائیں گے۔"

میں نے جواب میں ایک لمبی سی ہوں کی اور پھر اخبار میں غرق ہو گیا۔ جانے کتنی دیر تک اخبار پڑھتا رہا۔ مجو بھائی بھی میری بے حسی دیکھ کر ادھر ادھر ہو گئے۔ اخبار پڑھتے پڑھتے میں اچانک چونکا۔ ہڑبڑا کر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ اور فوراً ہی اخبار رکھ دیا۔ "وقت تو ہو گیا۔ گاڑی کو اب تک آ جانا چاہئے تھا۔ بندۂ خدا کہاں رہ گیا۔" پھر مجھے خیال آیا کہ جمال دین کی تو یہ عادت ہے۔ کبھی وقت پر نہیں پہنچتا۔ پھر کوئی الٹا سیدھا بہانہ بنا دے گا۔

نعمت خاں سودے سے لدا پھندا داخل ہوا۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ "لو جی بازار تو بند ہو گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے سودا خرید اہے۔"

"اچھا؟" مجو بھائی نے تشویش بھرے لہجہ میں کہا "اور شریف کے متعلق کچھ خبر ملی۔"

"وہ تو جی دم توڑ گیا۔"

"اللہ رحم کرے۔" مجو بھائی کی تشویش اور بڑھ گئی۔ وہ کچھ کہنے لگے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے فون اٹھایا "ہیلو۔ جمال دین تم کہاں ہو۔ میں یہاں انتظار کر رہا ہوں---------- اچھا؟---------- ٹائر جل رہے ہیں تو جلنے دو۔ تم بچ بچا کر نکل آؤ---------- اچھا---------- تو کوئی صورت نہیں ہے یہاں پہنچنے کی---------- ہوں---------- ہوں---------- ہوں---------- اچھا تو پھر تم واپس جاؤ۔ میں فون پر کسی وقت بات کروں گا دفتر سے۔"

فون بند کیا۔ "لیجئے اپنی گاڑی تو اب نہیں آئے گی۔ مین روڈ بلاکڈ ہے۔"

"کیا بتاتا ہے جمال دین۔"

"کہتا ہے کہ مین روڈ پر جابجا ٹائر جل رہے ہیں اور آتی جاتی کاروں کے شیشے ٹوٹ رہے ہیں۔ ایک بس کو آگ لگادی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ کام شروع ہوگیا۔" یہ کہتے کہتے مجو بھائی نعمت خاں سے مخاطب ہوئے "اماں نعمت خاں گھر میں دودھ وودھ بھی ہے۔"

"ہاں جی لے آیا ہوں۔ سبزی ترکاری بھی خرید لی ہے۔ گوشت بھی کئی دن کے لئے رکھ لیا ہے۔"

"گوشت اور سبزی ترکاری اپنا مسئلہ نہیں ہیں۔ دال کھا کر بھی وقت گزارا جاسکتا ہے۔ ایسے دنوں میں جب گھر میں مقید ہونا پڑے تو ایک تو چائے کا انتظام معقول ہونا چاہئے اور سگریٹ کی سپلائی پوری ہونی چاہئے۔ پھر بیشک باہر کچھ ہوتا رہے۔" یہ کہتے کہتے مجو بھائی کھڑے ہوگئے۔ "جا کر دیکھتا ہوں کہ حالات کیا ہیں۔"

"آپ کے جانے سے حالات میں کوئی فرق پڑ جائے گا۔"

"فرق تو کوئی نہیں پڑے گا۔ مگر آدمی کو حالات سے باخبر تو رہنا چاہئے۔ کم از کم بے خبری میں تو نہ مارے جائیں۔" مجو بھائی نے کتنے تحمل کے ساتھ جواب دیا۔ میرے طنزیہ لہجہ سے ان کے لہجہ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ رکے، پھر سوچتے ہوئے بولے

"ویسے تو سگریٹ موجود ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی دکان کھلی ہو تو کچھ اور پیکٹ خرید لئے جائیں۔ حالات کا کوئی پتہ نہیں ہے۔" یہ کہا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر باہر نکل گئے۔

نعمت خاں جہاں کا تہاں پریشان کھڑا رہا۔ پھر باورچی خانے میں چلا گیا۔ ادھر باہر ایک شور مچا ہوا تھا۔ لاؤڈ سپیکر پر اونچی غصیلی آوازوں میں پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہا جا رہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ خیال تھا کہ جھانک کر باہر دیکھا جائے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا کیا جا رہا ہے۔ مگر فائدہ؟ بس بیزاری کی ایک لہر آئی۔ اور میں نے باہر جھانکے بغیر کھڑکی بند کی اور واپس کرسی پر آ بیٹھا۔

کھڑکی بند ہو گئی تھی، مگر شور پھر بھی سنائی دے رہا تھا۔ میں اس شور سے جذباتی طور پر بالکل بے تعلق تھا۔ اس کے باوجود بے تعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ کتنی دیر تک کسی قدر پریشان بیٹھا رہا۔ کرنے کو جو کچھ نہیں تھا۔ اخبار جب تک پڑھتا رہا، باہر کے شور کا احساس ہی نہیں ہوا۔ رات جو رسالہ پڑھتے پڑھتے بیچ میں چھوڑ دیا تھا۔ اسے اٹھایا اور باقی کے مضامین پڑھنے کی نیت باندھی۔ مگر جلدی ہی اکھڑ گیا۔ یکسوئی جو حاصل نہیں تھی۔ پھر کیا کیا جائے۔ دفتر تو اب جانا نہیں ہے۔ خیال آیا کہ چلو کمرے کی صفائی کرتے ہیں۔ کتنے دن سے کمرہ نیچے کا اوپر اور اوپر کا نیچے ہو رہا ہے۔ اور کتابیں یا اللہ ان پہ کتنی گرد جم گئی ہے۔ اس گھڑی مجھے عشرت کا سرسری سا خیال آیا۔ گھر میں اس کی وجہ سے ایک قرینہ تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے مجال تھی کہ کوئی چیز اپنی جگہ سے بے جگہ ہو جائے۔ گھر روشن روشن نظر آتا تھا۔ اس کے گزر جانے کے بعد گھر کی صورت سدا خراب ہی رہی۔ سب چیزیں الٹ پلٹ تھیں، گھر اجاڑ اجاڑ سا۔ مجو بھائی کے یہاں ہونے سے تنہائی کے احساس نے تو کبھی نہیں ستایا۔ مگر مجو بھائی کی موجودگی گھر کی صفائی اور سلیقہ کی ضامن تو نہیں بن سکتی تھی۔

"صاحب جی۔"

کتابوں کی گرد صاف کرتے کرتے میں ٹھٹھکا۔ "ہاں، کیا بات ہے۔"

"صاحب جی، ذری پتہ کریاؤں کہ میت کدوں اٹھے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر جلدی آجانا۔"

"بس جی گیا اور آیا۔ پتہ چل جاوے پھر کھانا کھلا کے فرصت سے جاؤں گا۔ میت کو کندھا تو دینا ہی ہے جی۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

نعمت خاں باہر نکل گیا۔ میں پھر کتابوں کی جھاڑ پونچھ میں لگ گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک مصروف رہا۔ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ہوش اس وقت آیا جب مجو بھائی نے آکر شور مچایا۔

"نعمت خاں، او بھائی نعمت خاں عالی۔ کہاں ہے یار۔ یاں آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"

"اچھا تو آپ آگئے۔"

"بہت ہنگامہ ہے۔ حالات کچھ خراب ہوتے ہی نظر آرہے ہیں---------- مگر نعمت خاں کہاں ہے۔"

"وہ بھی آپ کے بعد چلا گیا۔"

"وہ کس خوشی میں گیا۔"

"جس خوشی میں آپ گئے تھے۔ کہتا تھا کہ میت کے اٹھنے کا وقت معلوم کر آؤں۔"

"میت کے اٹھنے کے وقت سے اسے کیا لینا ہے۔"

"میت کو کندھا دے کر یعنی کہ شہید کی میت کو کندھا دے کر ثواب کمائے گا۔"

"پھر ہمیں اس کی میت کو کندھا دینا نہ پڑ جائے۔"

ویسے مجو بھائی کا اندیشہ صحیح نکلا۔ حالات واقعی کچھ زیادہ ہی بگڑ گئے اور دن ڈھلتے ڈھلتے کرفیو لگ گیا۔ اب مجو بھائی نے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا۔ "آج کی رات مشکل ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"خطرہ ہے۔"

"کس بات کا؟"

"حملہ کا۔"

"حملہ کا؟ کس کے حملہ کا۔"

"یار بحث مت کیا کرو۔ تمہیں تو کچھ پتہ ہے نہیں۔ میں نے کچھ سونگھا ہے تب کہہ رہا ہوں۔"

"اچھا پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"رات کو سونا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آج رات پورا علاقہ جاگے گا۔ بہت خطرہ ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے تو جاگ لیں گے۔"

"ہاں یار رتجگا کریں گے۔ چائے ملتی رہے، پھر جاگنا کونسا مشکل کام ہے۔" پھر نعمت خاں کو آواز دی۔ "نعمت خاں۔"

نعمت لپک کر آیا۔ "ہاں جی۔"

"رات پہرہ دینا ہے۔ تمہیں پتہ ہے نا، کرفیو لگ گیا ہے۔ حالات بہت خراب ہیں۔"

"ہاں جی۔"

"چائے کا انتظام ہے نا؟"

"ہاں جی، وہ تو ہے۔"

یہ بھی خوب ہوا کہ مجو بھائی نے خود ہی رتجگے کا شوشہ چھوڑا اور خود ہی سویرے سے چادر تان کر سو گئے۔ تو وہ سنا رہے تھے اور پہریداری کا سارا بوجھ میرے کاندھوں پر آ پڑا تھا۔ مگر خیر مجھے کونسی نیند آ رہی تھی۔ نیند کا تو ان گھڑیوں میں میرے یہاں کوسوں پتہ نہیں تھا۔ کتاب کتنی دیر تک پڑھتا رہتا۔ تھک کر کتاب ایک طرف رکھی۔ انگڑائی لے کر اٹھا اور بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ عجب منظر تھا۔ وہ سڑک جو رات بھر چلتی تھی اور جہاں تہاں پان سگریٹ اور چائے کی دکانیں کھلی رہنے سے جاگ جاگ رہتی تھی یہاں سے وہاں تک خالی تھی اور خاموش۔ اتنے ہنگامے کے بعد اتنی خاموشی۔ میں حیران بھی ہوا اور خوفزدہ بھی۔ ویسے رات کی خاموشی بنفسہ میرے لئے کوئی نیا تجربہ نہیں تھی۔ اس شہر کی زندگی سے بہت پہلے میں اس تجربے سے گزر چکا تھا۔ بلکہ یہ تجربہ تو میرے بچپن کی یادوں کا حصہ ہے۔ میں نے اس زمانے میں آنکھ کھولی تھی جب ابھی بجلی

نہیں آئی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ ہماری اس چھوٹی سی بستی میں بجلی اس وقت تک نہیں پہنچی تھی۔ رات وہاں کتنی جلدی شروع ہو جاتی تھی اور کتنی لمبی اور کالی ہوتی تھی۔ کالی رات کا سناٹا گہرا ہوتا ہے۔ دھرم شالا کے اس پار سے آتی ہوئی گیدڑوں کی آوازیں اس سناٹے کو توڑتی نہیں تھیں، اور گہرائی پیدا کر دیتی تھیں۔

اس کے بعد جو سناٹا میرے تجربے کا حصہ بنا وہ ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے زمانے کا ہے۔ اب میں شہری مخلوق بن چکا تھا۔ تعلیم کی تقریب سے مجھے شہر میں آکر رہنا ہی تھا۔ اور شہروں کا نقشہ ان دنوں عجب تھا۔ اچھی بھلی گہما گہمی ہے۔ دکانیں کھلی ہیں۔ خریداروں کے جمگھٹے، دلّی بازوں کے قہقہے، خوانچہ والوں کی بولیاں، یکایک پراسرار طور پر کوئی خبر، کوئی افواہ بازار کے اس نکڑ سے اس نکڑ تک بجلی کی تیزی سے پھیلتی چلی جاتی۔ اسی تیزی سے دکانیں بند ہوتی چلی جاتیں۔ شٹر دھاڑ دھاڑ گر رہے ہیں۔ دروازے دھڑا دھڑ بند ہو رہے ہیں۔ دکاندار دکانیں بند کر کے، خریدار سودا سمیٹ کے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ دم کے دم میں بازار بند، سڑکیں خالی، فضا سنسان، جیسے وہ افواہ نہیں تھی، کوہ ندا سے آواز سنائی دی تھی۔

ویسا ہی سناٹا مگر ایک نئی دہشت کے ساتھ۔ ہر عہد اپنا سناٹا، اپنی دہشت اور ہاں اپنا تشدد اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اندھیرے کے ساتھ سناٹے کا رنگ اور ہوتا ہے۔ مگر یہاں کھمبے اپنی روشنیوں کے ساتھ سب اپنی اپنی جگہ سلامت تھے۔ سڑک پر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر کسی وجود کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ یا اللہ اس راہ پر امنڈی ہوئی خلقت دم کے دم میں کس کھوہ میں جا چھپی۔ بھگدڑ، دھکم پیل، دھوں دھاں، ہائے وائے، سب غائب، نہ کوئی نعرہ نہ کوئی چیخ، نہ بند ہوتے دروازوں اور گرتے شٹروں کا شور۔ بجلی کی روشنی میں خالی اور خاموش سڑک۔ بس جہاں تہاں پڑے ہوئے ادھ جلے ٹائر، اینٹ، پتھر اور وہ بس جو جل پھنک کر کالی کھڑنک بن گئی تھی۔ آدم کے نام بس وہ سپاہی جو روشن چوراہے کے بیچوں بیچ کلاشنکوف سے مسلح ساکت کھڑا تھا۔ کتنی دیر تک میں اسے دیکھتا کیا۔ حیران کہ وہ جیتا جاگتا آدمی ہے یا آدمی کا پتلا جو یہاں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ تب وہ ورطۂ حیرت میں غرق ہوا۔ دہشت سے پانی پانی ہوا۔ ناگاہ ایک مرد بزرگ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ لپک کر قریب گیا اور بولا، عرض پرداز ہوا کہ یا مرد ...

کچھ بتائیے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ آنکھ کا دھوکا ہے کہ یہ کوئی قریہ بلا ہے۔ جب میں نے اس بستی میں قدم رکھا تھا تو کٹورا بجتا تھا، کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ کوچوں میں چہل پہل تھی، رونق چہار طرف تھی۔ بالاخانے روشن تھے، مہوشوں کے جمگھٹے تھے، طبلے تال کھنکتے تھے۔ نظرباز البیلے کھیلے پھرتے تھے۔ بالانشینوں سے نگاہ بازیاں کرتے تھے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو رونقیں غائب، ہو کا عالم، چارسو دہشت کا ڈیرا ہے۔ ویرانی کا بسیرا ہے۔ کچھ نہیں کھلتا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ وبدا میں ہوں کہ کیا کروں، کدھر جاؤں۔ یہ سن اس بزرگ نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اس رنگ سے کہ ایک آنکھ ہنستی تھی، دوسری آنکھ روتی تھی۔ پھر بصد افسوس یوں کہا کہ اے جوان، مجھے تیری جوانی پہ رحم آتا ہے۔ ارے کمبخت اب یہ شہر قریہ بلا ہے۔ کس ستمگر نے تجھے یہ رستہ دکھایا ہے، مشکل میں تجھے پھنسایا ہے۔ میری مان، شتابی سے یاں سے نکل جا۔ بزرگ کا یہ کلام سن وہ رویا اور بولا کہ تقدیر نے یہ دن دکھایا ہے۔ فلک نے مجھے مشکل میں پھنسایا ہے۔ مگر اب راہ فرار کیسے اختیار کروں کہ یہ بات غیرت سے دور ہے، بندہ اس امر میں مجبور ہے۔

"ابے یار، تیرا دماغ چل گیا ہے، مرنے کی نیت ہے کیا۔ گولی پوچھ کر نہیں آتی۔ اندر آجا۔"

مجو بھائی جاگ پڑے تھے اور لیٹے لیٹے چلا رہے تھے۔ میں بالکونی سے سرک کر واپس کمرے میں آگیا۔ وہاں ٹھہرنے کا اب فائدہ بھی کیا تھا۔ مجو بھائی کی چیخ پکار سے سناٹے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ میں۔

"استاد، وہاں کھڑے کیا کر رہے تھے۔"

"بس دیکھ رہا تھا۔"

"دیکھ رہا تھا؟ دیکھنے کو اس وقت وہاں ہے کیا۔ کرفیو لگ گیا ہے۔ اب تو چڑیا کا بچہ بھی سڑک پر نظر نہیں آسکتا۔"

"سناٹا دیکھ رہا تھا۔"

"خوب۔" مجو بھائی تلخی سے بولے۔ "تم اس سناٹے کو تماشا سمجھ رہے ہو۔ گھر میں بیٹھے ہو نا۔ مجھ سے پوچھو شہر کا کیا حال ہے۔ شکر کرو کہ اپنی جان بچا کر لے آیا ورنہ تم میری لاش کو اس وقت ڈھونڈھ رہے ہوتے۔ یار نعمت خاں، جاگ رہا ہے نا تو۔"

"ہاں جی۔"

"تو پھر چائے کا ایک دوز ہو جائے۔ کرفیو کی رات چائے کے زور ہی پر کاٹی جا سکتی ہے۔"

"اچھا جی۔"

نعمت خاں کے چلے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک ہم دونوں ہی چپ رہے۔ مجو بھائی شاید ابھی نیند کے خمار سے پوری طرح نہیں نکلے تھے۔ پوری طرح تو چائے کی پیالی ہی انہیں اس خمار سے نکال سکتی تھی۔ ادھر میرے اندر جو رو چل رہی تھی اس سے میں پوری طرح نہیں نکلا تھا۔ بولا بھی تو اسی رو میں "مجو بھائی، اس شہر میں یہ کیا ہو رہا ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے۔" مجو بھائی نے لاپرواہی سے کہا۔

"یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔"

مجو بھائی جیسے نیند کے خمار سے نکل آئے ہوں۔ مجھے گھور کے دیکھا اور بولے "جو ہو رہا ہے وہ کچھ نیا تو نہیں ہو رہا۔" رکے پھر بولے "یار میں نے تم سے ایک بات کہی تھی۔ تم نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔"

"وہ کیا بات تھی؟"

"یہی کہ اس شہر میں رہنا ہے تو سوچنا چھوڑ دو، ورنہ شہر چھوڑ دو۔ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے کیا ہم اسے روک سکتے ہیں۔ پھر سوچنے اور کڑھنے کا فائدہ؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ میں اس شہر میں کیا کر رہا ہوں۔"

مجو بھائی ہنسے۔ "میں اس شہر میں کیا کر رہا ہوں۔" میرے بیان کو اپنے طنزیہ لہجہ میں دہرایا۔ پھر کہنے لگے "تم کہیں اور بھی ہوتے تو کیا کرتے۔ جہاں تم گئے تھے اور جہاں تمہیں کچھ کر دکھانے کا موقعہ ملا تھا وہاں تم نے کیا کیا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے مگر-----------" پتہ نہیں میں کیا کہنا چاہتا تھا۔

مجو بھائی نے الجھ کر میرا فقرہ پورا ہونے سے پہلے اسے بیچ میں کاٹ دیا۔ "مگر وگر کچھ نہیں۔ ہماری اگر مگر بے اثر ہے۔ سو مت بولو۔ دیکھتے رہو۔ اسی میں خیریت ہے۔"

"اچھا، یہاں خیریت کی کوئی صورت ہے۔ آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے ہم

کسی محفوظ گوشے میں بیٹھے ہیں۔ جیسے جو کچھ ہو رہا ہے ہم سے دور ہوتا رہے گا۔ ہم اپنے گھونسلے میں بچے بیٹھے رہیں گے۔"

"بچنے کا معاملہ تو جواد میاں یہ ہے کہ قسمت والا ہی بچے گا۔ اور اپنی کوشش اور احتیاط سے نہیں بچے گا۔ جو مر رہے ہیں الل ٹپ مر رہے ہیں۔ جو بچے گا اللہ توکلی بچے گا۔ اور یار مرنے جینے کی ویسے بھی کونسی منطق ہوتی ہے۔ اور ہم لوگ تو یونہی ایک مہمل زندگی گزار رہے ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو آپ مجھے کس خوشی میں احتیاط برتنے کی تلقین فرمارہے تھے۔"

"اماں اپنی طرف سے تو احتیاط برتنی چاہئے۔ آگے جو ہو سو ہو۔ ہونی کو تو نہ تم روک سکتے ہو اور نہ میں روک سکتا ہوں۔"

اتنے میں نعمت خان نے چائے لاکر سامنے رکھ دی۔ اب مجو بھائی کی جان میں جان آئی۔ پہلے ہی گھونٹ کے ساتھ پھریری لی اور بولے "تم سے بھی زیادہ متفکر اپنے آقا حسن رہتے ہیں۔ جب دیکھو فکر مند۔ شہر کے اندیشے میں دبلے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے، بھائی مجید الحسینی تمہیں آگے کیا نظر آتا ہے۔ میں نے کہا، سمندر، میرا منہ تکنے لگے۔ سمجھے کہ مخول کر رہا ہوں۔ کہنے لگے، بھائی مجید الحسینی، میں نے سنجیدگی سے تم سے یہ سوال کیا ہے۔ میں نے کہا، قبلہ اقن صاحب میں نے بھی سنجیدگی ہی سے کہا ہے۔ چپ ہی تو ہو گئے۔"

اور اب میں بھی چپ تھا۔ کیا کہتا، مجو بھائی نے میری بات اس طرح کاٹی کہ اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔

"مجو بھائی۔" آخر میں نے زبان کھولی "مجھے اپنی بڑی بھابی کی ایک بات رہ رہ کر یاد آتی ہے۔"

"وہ کیا بات ہے۔"

"ہمارے ایک کزن ہیں پیارے میاں۔ جب ہمارے میاں جان کی آنکھ بند ہو گئی تو انہوں نے ایک ہماری جدی حویلی کو چھوڑ کر ساری جائیداد اونے پونے بکوادی اور اپنے حصے کی بلکہ اپنے حصے سے زیادہ ایک موٹی رقم لے کر پاکستان آگئے۔ مگر ساری

رقم کھا پی کر اڑا دی۔ پاکستان میں وہ جم نہیں پائے۔ اس کے بعد ہندوستان گئے تو اپنا احوال بیان کرتے ہوئے کہنے لگے، بڑی بھابی، آپ کی بد دعا مجھے لے بیٹھی۔ بڑی بھابی بولیں، بھیا ہم نے تو تمہیں کوئی بد دعا نہیں دی۔ مگر ہمارے بد دعا نہ دینے سے کیا ہوتا ہے۔ زمین کو اجاڑو گے تو زمین تو کوسے گی۔ زمین کے کوسے آباد نہیں ہوا کرتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ہاں، یہ سوچنے والی بات ہے۔" مجو بھائی اب واقعی سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

"مجو بھائی، مجھے لگتا ہے کہ اس کا اطلاق خالی پیارے میاں پر نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔اور کسی پر ہو یا نہ ہو مجھ پر ہوتا ہے۔"

"میں نے تم سے کیا کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا۔"

"تمہیں یاد ہونا چاہئے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ آدمی یا تو سفر نہ کرے۔ اور کرے تو سفر کو بیچ میں نہ چھوڑے۔ تم نے سفر کا کشٹ بھی اٹھایا اور اسے پایہ تکمیل تک بھی نہیں پہنچایا۔ تم سفر کو ادھورا چھوڑ آئے ہو۔ یہ آدھ چھوٹا سفر تمہیں ستائے گا۔ اور پیارے میرا خیال ہے کہ اس نے تمہیں ستانا شروع کر دیا ہے۔"

"شاید۔"

"شاید نہیں۔ یقیناً، پیارے ابھی تو تمہیں اپنی بڑی بھابی کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی ہے۔ ابھی کسی اور کی کہی ہوئی باتیں بھی یاد آئیں گی۔" یہ کہتے کہتے مجو بھائی نے جماہی لی "یار نیند آ رہی ہے۔"

"چائے کے بعد بھی نیند آ رہی ہے۔"

"ہاں واقعی تعجب ہے۔ چائے کے زور پر تو میں پوری رات آنکھوں میں کاٹ سکتا ہوں۔ پتہ نہیں آج کیا بات ہے۔ مگر تم تو جاگ رہے ہو نا۔"

"میری تو نیند ہی جیسے غائب ہو گئی ہو۔"

"بس پھر جاگو۔ میں سوتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے مجو بھائی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر بیٹھے تھے پھر دراز ہو گئے۔ اور کمال ہے، فوراً ہی خراٹے بھی لینے لگے۔

میری آنکھوں میں نیند دور دور نہیں تھی۔ ذہن میں ایک دھاچوکڑی مچی ہوئی

تھی۔ حیرانی اور پریشانی کہ اچھا یہ وہی شہر ہے۔ اتنا بدل گیا۔ شہر اس طرح بھی بدلتے ہیں جیسے کایا کلپ ہو گئی ہو۔ شاد آباد، گہما گہمی، چہل پہل اور پھر جیسے پورا شہر منقلب ہو گیا ہو۔ یہ تو واقعی وہی بات ہو گئی جو میں اس روز بجو بھائی کے جواب میں کہہ رہا تھا۔ اور اچانک ایک وسوسہ میرے اندر پیدا ہوا۔ جیسے آس پاس کہیں کوہ ندا ہے۔ اب تک کہاں چھپا ہوا تھا۔ اب کیسے نمودار ہو گیا۔ سو یوں ہوا کہ جب مہینہ گزرا اور وہ تاریخ آئی تو پھر اسی ساعت وہی کچھ ہوا۔ وہ حیران کہ آواز کیسی ہے اور کہاں سے آتی ہی۔ لوگ کیوں سراسمہ ہیں۔ کیوں سب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا ہے، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں اور کیوں جو ہے وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ سب کچھ بھول بھال اپنے گھر کی طرف دوڑا جاتا ہے۔ وہ ایسا سوچتا تھا کہ ناگاہ ایک سمت سے ایک جوان آتا دکھائی دیا اس رنگ سے کہ پٹخیاں کھاتا ہے مگر دوڑا چلا جاتا ہے۔ پیچھے اس کے ایک پیرزن گریہ کرتی دوڑ رہی ہے اور چلا رہی ہے، میرے بیٹے، میرے بیٹے، اس نے چاہا کہ بڑھ کر اس جوان کو دبوچے اور اسے ملامت کرے کہ کیوں اپنی ضعیف ماں کو پریشان کرتا ہے۔ پر وہ جوان اس کی گرفت سے نکلا، مچھلی کی مثال تڑپا اور سمت اس کوہ کے دوڑتا چلا گیا۔ وہ بھی اس کے تعاقب میں اس کے پیچھے چلا۔ مگر دم کے دم میں وہ کوہ کے بیچ جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب وہ افسردہ و پژمردہ پلٹا۔ سوچا کہ اس ضعیفہ کو دلاسا دے۔ پر اس نے دیکھا کہ وہ پیرزن اب وہاں نہیں ہے۔ اثر آثار اس دہشت کے مٹ چکے تھے۔ پھر وہی اژدحام، مجمع خاص و عام، بزاری بزاری، زوروں پر دکانداری، جوہری، صراف، بزاز، گل فروش، عطر فروش سب چاق و چوبند بیٹھے ہوئے، خریداروں سے منہ مانگی قیمتیں وصول کرتے ہوئے۔ کٹورا بجتا ہے۔ کوچہ طبلہ عطار بنا ہے۔ یہ دیکھ وہ مزید حیران ہوا اور دہشت مزید اس پہ طاری ہوئی۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ کیا تھا، یہ کیا ہے۔ جوان آنکھوں نے دیکھا اور دیکھ رہی ہیں وہ حقیقت ہے یا توہم کا کارخانہ۔

(14)

"---------- آدمی یا تو سفر نہ کرے۔ کرے تو بیچ میں نہ چھوڑے---------- یہ آدھ چھوٹا سفر تمہیں ستائے گا---------- اور پیارے میرا خیال ہے کہ----------" اور ایک مرتبہ میں پھر بیکل ہو گیا۔ مگر مجھے کل کہاں آئی تھی۔ مجو بھائی نے بات ہی کچھ اس طرح کی تھی۔ یوں تو یہی بات وہ مختلف لفظوں میں بار بار پہلے بھی کہہ چکے تھے۔ مگر وہی ایک بات ہوتی ہے کہ یوں آپ پر اثر نہیں کرتی۔ مگر کوئی کوئی گھڑی ایسی ہوتی ہے اور کچھ اس طرح کہی جاتی ہے کہ وہ بات اندر اتر کر نہ جانے کونسے تار کو چھو لیتی ہے کہ اندر کھلبلی مچ جاتی ہے۔ اس سناہٹی رات کی جانے وہ کونسی گھڑی تھی، شاید رات کا بیچوں بیچ یا شاید پچھلا پہر ہو جب مجو بھائی نے وہ فقرے کچھ اس طرح کہے کہ پھر میں نہ صرف اس رات نہ سو سکا، اس کے بعد بھی ان فقروں کو اس ساری بات کو اپنے ذہن سے دفع نہیں کر سکا۔ ایک بے کلی نے مجھے آلیا۔ اور واقعی اس سفر نے مجھے ستانا شروع کر دیا۔ باتیں یاد آنی شروع ہو گئیں، کوئی یہاں سے کوئی وہاں سے۔ کوئی آدھ چھوٹا فقرہ، کوئی محض اشارہ۔ اور میری بے کلی بڑھتی چلی گئی۔ ٹھیک کہا تھا مجو بھائی نے کہ پیارے ابھی تو تمہیں بڑی بھابی کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی ہے۔ آگے دیکھنا کہ کس کس کی کہی ہوئی بات----------

وہ وقت آگیا تھا اور میں نرغے میں تھا۔

ایسے تو اپنے آپ کو بہنے نہیں دینا چاہیے۔ چل بچل ہو جاؤ گے۔ تو میں نے اپنے

آپ کو سنبھالا، نرغے سے نکالا۔ بظاہر بڑے معروضی انداز میں اس سفر کا ایسے جائزہ لینا شروع کیا جیسے میں نے سفر نہ کیا ہو، کوئی نظم لکھی ہو اور اب میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہوں کہ اس میں کیا سقم رہ گیا کہ ایک کامیاب نظم نہ بن سکی یا بنتے بنتے رہ گئی۔ ویسے اس سفر کا خیال تو مجھے کچھ اسی طرح آندھی دھاندی آیا تھا۔ جیسے کسی شاعر کو اچانک کوئی نیا مضمون سوجھ جائے اور اسے بیتاب کر دے۔ پھر جب تک اسے وہ کسی شعری پیکر میں نہ ڈھال لے اسے قرار نہیں آتا۔ بس بیٹھے بیٹھے سفر کا سودا اچھلا۔ اٹھتے بیٹھتے وہی ایک خیال کہ مجھے ایک بار وہاں جانا چاہئے۔ پھر اس سفر سے مجھے مفر نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ میں نے یہ سفر نہ کیا تو خفقان ہو جائے گا۔ اس وقت واقعی مجو بھائی نے مجھ پہ بڑا احسان کیا کہ ہمت بندھائی، ویزا دلوایا، اور سفر کا سارا انتظام کیا۔ بس جیسے بچے کو انگلی پکڑ کے رستے پہ ڈال دیا جائے کہ جاؤ اس راہ پہ سیدھے چلے جاؤ۔ اور اب انہیں کی تلخ و تند تنقید مجھے یہ جائزہ لینے پہ مجبور کر رہی تھی کہ سقم کہاں رہ گیا۔ اور مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ وہی ہوا ہے جو اس ناپختہ عامل کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو جلالی وظیفہ پڑھنے تو بیٹھ جاتا ہے مگر آخری مرحلہ میں جب وظیفہ پورا ہونے کو ہوتا ہے گڑبڑا جاتا ہے۔ استاد، جہاں سے تم بھاگ کھڑے ہوئے وہیں سے تو اس سفر کو معنی ملنے شروع ہوئے تھے۔ شعر میں، افسانے میں، سفر میں کوئی موڑ ایسا آتا ہے کہ مسافر کے لئے مطلب یہ کہ جو بھی تجربہ ہے اس تجربے سے گزرنے والے کے لئے وہ موڑ ایک چیلنج بن جاتا ہے۔ چیلنج کو قبول کر لیا، اس سے نبٹنے کی ٹھان لی تو تجربے کی کوئی نہ کوئی شکل نکل آتی ہے۔ گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے تو دم کے دم میں ساری ریاضت پہ پانی پھر جاتا ہے۔ مجو بھائی نے ٹھیک کہا تھا کہ جہاں تم سمجھ رہے تھے کہ بات ختم ہو گئی اور تم اکھڑ گئے وہ تو بات کا آغاز تھا۔ اب سانپ تو نکل چکا تھا۔ میں بیٹھا لکیر پیٹ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھ سے کوتاہی کیا ہوئی اور اس سفر کا جو میں نے اتنے شوق سے کیا تھا مطلب کیا نکلا۔ اب تو اس سفر میں مجھے کھانچے ہی کھانچے نظر آ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ تو سارا سفر ہی میری عجلت اور بے صبرے پن کا، بلکہ یوں کہئے کہ میرے انگھڑپن کا شکار ہو گیا۔ فوری رد عمل کو قطعی اور آخری بات سمجھ لینا یہ کہاں کی عقلمندی تھی۔ اور پھر ترنت بھاگ کھڑے ہونا، وہاں ٹھہر کے کیا کرتا۔ اے واہ سبحان اللہ یہاں آ کے کیا کر

رہے ہو، صحیح کہا مجو بھائی نے واقعی یہاں آ کے میں نے کیا کیا۔ اور یہاں میرے کرنے کے لئے تھا کیا۔ کلاشنکوف مجھ سے چلانی آتی نہ تھی۔

تو اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ تو سارا سفر ہی اکارت گیا۔ میری عجلت نے کئے دھرے پہ پانی پھیر دیا۔ اتنے زمانے بعد اس دیار کے درشن ہوئے تھے۔ اتنی جلدی وہ زمین اپنا آپا کیسے دکھا دیتی۔ درمیان میں اجنبیت کا پردہ حائل ہو چکا تھا۔ آخر پہچانتے پہچانتے ہی پہچانتی۔ پھر زمین روٹھ بھی تو جاتی ہے اور زمین اگر روٹھ جائے تو اسے منانے میں وقت لگتا ہے۔ کمبخت پتھر بن جاتی ہے۔ پھر آسانی سے موم نہیں ہوتی۔ تو ابھی تو وہ مجھے پہچان رہی تھی۔ کچھ کچھ پہچانا تھا کہ بیچ میں کھنڈت پڑ گئی۔ اور اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ سب سے پہلے مجھے کس نے پہچانا۔ درختوں نے، ویسے سب سے پہلے تو درخت ہی پہچانتے ہیں۔ پھر پرندے، پھر در و دیوار، آدمی لوگ تو کہیں بعد میں پہچانتے ہیں۔ شاید سب سے بعد میں۔ درختوں میں برگد کی بات نہیں کر رہا۔ اس کی بات الگ ہے۔ وہ تو سب سے الگ تھلگ، دنیا زمانے سے بے نیاز کھڑا رہتا ہے۔ کوئی آئے کوئی جائے دھیان ہی نہیں دیتا۔ اس سے رشتہ پیدا کرنے کے لئے آدمی کو بہت ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ پھل دینے والے درخت شاید آدمی کو جلدی پہچانتے ہیں۔ وہی جلدی ناخوش بھی ہوتے ہیں، وہی جلدی خوش بھی ہو جاتے ہیں۔ پھلوں کے لین دین میں اچھے برے بہت سے معاملات ہوتے ہیں۔ کبھی اچھا سلوک، کبھی بدسلوکی۔ بس اسی میں ایک رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں نے یہاں ایک عمر گزاری تھی، وہ عمر جب پیڑوں کے ساتھ سو طرح کے معاملات ہوتے ہیں۔ کچے ادھ کچرے پھل توڑ توڑ کر تو خیر انہیں ستایا ہی جاتا ہے۔ کسی چڑیا کا گھونسلہ کسی شاخ پر ہو تو اس تک پہنچنے کے لئے بھی انہیں بے آرام کیا جاتا ہے۔ ہاتھ میں غلیل ہو اور اس کی شاخوں میں بیٹھے پرندے پھل کتر رہے ہوں تو ان پرندوں کے ساتھ اس درخت کی بھی شامت آتی ہے۔ یہ سارے ہی کوتک میں ان کے ساتھ کر چکا تھا۔ سو اس بھلے وقت میں ان کے ساتھ جو ایک رشتہ قائم ہوا تھا وہ کوئی کچا رشتہ نہیں تھا۔ وقت اس رشتے کا کچھ نہیں بگاڑ پایا۔ انہوں نے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا۔ ابھی تو میں گاڑی ہی میں تھا۔ چلتی گاڑی میں انہوں نے میری ایک جھلک دیکھی اور پہچان لیا۔ بس ہبڑ دبڑ گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔

تو درختوں کا معاملہ تو الگ ہے۔ مگر دوسرے لوگ بھی مجھے رفتہ رفتہ پہچان ہی رہے تھے۔ میمونہ کی آنکھوں میں شروع میں کتنی اجنبیت تھی۔ پھر ہولے ہولے وہ کتنی اپنائیت برتنے لگی تھی۔ اس صبح جب ساون کا جھکا لگا تھا تو اس نے کتنے چاؤ کے ساتھ کڑھائی چڑھائی تھی۔ دیکھا کہ گھٹائیں امنڈ رہی ہیں، بارش تلی کھڑی ہے۔ سکول سے چھٹی کرکے لپک جھپک آئی، بیسن گھولا اور چولہے پہ بیٹھ گئی۔ کڑھائی میں تیل کڑکڑایا اور پھلکیاں تلنی شروع کر دیں۔ یہ کس کی خاطر ہو رہی تھی۔ تو دھیرے دھیرے غیریت کے پردے اٹھتے جا رہے تھے۔ وقت ہی ابھی کتنا گزرا تھا۔ اس زمین پہ قدم رکھ کر بس ابھی سانس ہی تو لیا تھا۔ ہنوز حیرت و مسرت کا عالم تھا۔ کسی کو پہچانا کسی کو نہ پہچانا۔ کسی کے بتائے بغیر کسی کو پہچان لیتا تو حیرت ہوتی کہ اچھا میں نے اسے پہچان لیا اور پھر خوشی ہوتی۔ کتنی چیزیں ابھی آدھ پہچانی تھیں۔ کچھ مانوس کچھ نامانوس۔ تو میں ابھی پہچان رہا تھا۔ بچھڑے ہوؤں کو، ان کے بیچ اپنے آپ کو۔ بڑی بھابی بہت جلد باز نکلیں۔

اصل میں عجلت میں بڑی بھابی تھیں، میں نہیں۔ بہر حال سفر ادھورا رہ گیا۔ ابھی کتنی چیزیں دیکھی تھیں اور کتنے اپنے پرایوں سے ملا تھا۔ جن چیزوں کو دیکھا تھا انہیں بھی کتنا دیکھا تھا۔ ابھی تو آنکھیں کھلنی شروع ہوئی تھیں۔ اور جن سے ملا تھا ان سے بھی ابھی کتنا مل پایا تھا۔ سب سے زیادہ افسوس خیرل بھائی کے سلسلہ میں تھا۔ ان سے ملاقات کتنی ادھوری رہی۔ سب ملاقاتیں ادھوری رہ گئیں۔ سفر تھا بھی تو بہت مختصر۔ خیر مختصر تو اسے میں نے کیا۔ مگر کمال ہے اب پھیلتا جا رہا تھا۔ جتنا یاد کرتا تھا اتنا ہی لمبا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اصل میں ابھی تک میں اس کی تفصیل میں گیا ہی نہیں تھا۔ تفصیلات تو اب یاد آ رہی تھیں۔ جس تفصیل کو ہاتھ لگایا دیکھتے دیکھتے قطرے سے دریا بن گئی، بالکل منو جی کی مچھلی کی طرح کہ شروع میں بھنگیا کے برابر تھی۔ پھر اتنی لمبی ہوئی اتنی پھیلی کہ گنگا ندی میں بھی نہیں سما پائی۔ یاد کا بھی کوئی انت نہیں ہوتا۔ ایک یاد کے اندر سے ایک اور یاد بر آمد ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر سے پھر کوئی یاد نکل آتی ہے۔ یادوں کی ایک لڑی سی بن جاتی ہے اور لڑی لمبی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور یوں دیکھو تو ہم زندگی میں یاد ہی کتنا رکھتے ہیں۔ کتنا کچھ ہم بھول جاتے ہیں۔ حافظہ کی بھی تو اپنی کوتاہیاں ہیں۔

اسی کے اندر ایک طاق نسیاں بھی ہوتا ہے۔ بہت کچھ تو اس طاق کی نذر ہو جاتا ہے۔ بچتا کیا ہے، بس جیسے سمندر میں سے چند قطرے یا موسلادھار بارش میں سے پتوں پر ٹکی رہ جانے والی چند بوندیں۔ ویسے آدمی کی روح کو شرابور کرنے کے لئے تو چند بوندیں بھی بہت ہوتی ہیں۔ مگر میرے ساتھ ایک عجب مصیبت پیدا ہو گئی تھی بس بوند برابر بات یاد رہ گئی۔ پھر بوند پھیل کر ندی بنتی چلی گئی۔ اس چھوٹی سی یاد کے پیچھے کوئی اور یاد چھپی ہوئی نکلی۔ اور اس چھپی ہوئی یاد کے پیچھے پھر کوئی یاد جیسے گز مڑی مارے پڑی ہو۔ اس طرح یادوں کے دل بادل بن جاتے اور امنڈ گھمنڈ تصور میں چھا جاتے۔ ہاں ایک اور مشکل تھی۔ یادوں کے اندر سے پگڈنڈیاں نکلتیں کوئی بھی پگڈنڈی پھیل کر لمبا پیچ در پیچ رستہ بن جاتی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کن کن جنگلوں کی طرف جا رہی ہے۔ زمانے زمینیں اس میں لپٹتے چلے جاتے۔ اور اس کے باوجود یہ احساس ستاتا رہتا کہ بیچ میں سے کچھ بھول گیا ہوں۔ جب میں نے دلکشا، کے خرابے میں قدم رکھا تھا اس وقت بھی اسی طرح ہوا تھا۔ وہاں قدم رکھتے ہی مجھے کتنا کچھ یاد آ گیا تھا۔ میں اس وقت یہی سمجھا تھا کہ مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ مگر بعد میں احساس ہوا اور مستقل یہ احساس ستاتا رہا کہ بیچ میں سے کچھ بھول گیا ہوں۔ اور اب جب میں اس سفر کو یاد کر رہا تھا تو پھر وہی صورت درپیش تھی۔ کتنی تفصیلات اب یاد آ رہی تھیں۔ اس کے باوجود یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ بیچ میں سے کچھ رہ گیا، کوئی بات تھی کہ ذہن سے اتر گئی ہے۔ یا شاید مجو بھائی جس طرح مجھے کرید رہے تھے اس نے مجھے اس وہم میں ڈال دیا۔

"استاد، تم ہم سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

"نہیں مجو بھائی، جو بھی اور جتنی بھی بات تھی وہ میں نے آپ کو بتا دی۔"

"پیارے، ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ اور پھر جتنا تم نے بیان کیا ہے خود اس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ بیچ میں کوئی اور بات بھی ہوئی ہے۔ وہ تم گول کر گئے۔"

"اپنی طرف سے تو میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ اب نادانستہ بیچ میں سے کوئی بات رہ گئی ہو تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"نادانستہ ہی سہی، مگر بیان بتا رہا ہے کہ درمیان میں کچھ اور بھی ہوا ہے۔ میری ساری دلچسپی اسی میں ہے۔"

"یہ تو بڑی مشکل ہے۔ اگر واقعی بیچ میں سے کوئی بات رہ گئی ہے تو وہ اب مجھے یاد نہیں۔"

"کوشش کرو، یاد آجائے گی۔ پوری بات کا پتہ چلنا چاہئے۔"

اور میری سادگی دیکھو یا مجو بھائی پر اعتبار کہ انہوں نے اگر ایسا محسوس کیا ہے تو ایسا ہی ہو گا اور میں نے سچ مچ کوشش شروع کر دی۔ کوشش کہ جو بات بیچ میں رہ گئی ہے وہ یاد آجائے۔ اسی کوشش میں اس پورے سفر کو میں نے اپنے اندر دہرا ڈالا۔ مگر ہوا کیا۔ بس کچھ اسی قسم کا قصہ ہوا کہ آپ کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈنے کے لئے کمرے میں بھرے سارے سامان کو ٹٹول ڈالیں۔ وہ چیز نہ ملے مگر اس چکر میں اور کتنی چیزیں جن کے بارے میں گمان بھی نہ ہو کہ وہ اپنے پاس ہوں گی برآمد ہو جائیں۔ اور اب مجھے احساس ہوا کہ یہ سفر تو اور ہی طرح کا تھا۔ جتنا اور جیسا میں سمجھ رہا تھا اس سے بہت بڑھ کر۔ عجیب بات تھی، اب تک مجھے اس کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ اپنے سرسری حساب سے سمجھ رہا تھا کہ سفر ادھورا رہ گیا۔ کچھ دنوں اور قیام کرنا چاہئے تھا کہ اب جو تشنگی کا احساس ہو رہا ہے وہ نہ ہوتا اور جن سے ملاقات ادھوری رہ گئی وہ بھرپور ہوتی اور میمونہ ------- خیر میمونہ کا معاملہ ہاں اسے بھی دوبارہ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ تو خیر اب جو میں نے اپنے تصور میں اس سفر کو دہرایا تو وہ کچھ سے کچھ بن چکا تھا۔ سفر کے اندر سفر، جیسے یہ کوئی ایک سفر نہ ہو۔ اور ہر سفر ایسا جیسے اس کا کوئی انت ہی نہ ہو۔ بس جیسے میں سفر پر نکلا ہوں اور تھوڑی منزلیں طے کر کے کبھی تھک کر، کبھی ڈر کر، کبھی جھجک کر واپس۔ تو اب مجھے زیادہ افسوس نے ستایا کہ سفر یہ ادھورا کیوں رہا۔ اگر یہ سفر پورا ہو جاتا۔ اور پھر مجھے اس ناپختہ عامل کا خیال آگیا جو جلالی وظیفہ پڑھنے کا حوصلہ تو کر بیٹھا مگر کہیں بیچ میں پہنچ کر جھجک گیا۔

"یار جواد، تم بالکل چوتکمٹ ہو۔ پہلے ہی مرحلہ میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ تھوڑا انتظار تو کیا ہوتا، جہاں اتنے دن رکے تھے چند دن اور رکتے، دیکھتے کہ پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ اماں، تم تو ہتھیلی پہ سرسوں جما رہے تھے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے۔ بہت انتظار کھینچنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر----------"

"مجو بھائی۔" میں نے بے چین ہو کر ان کی بات کو کاٹا "آپ کیسی باتیں کر

رہے ہیں۔ اب انتظار کھینچنے کی تو اپنی عمر نہیں ہے۔"

"پھر وہی چونکھوں والی بات، یہاں عمر بیچ میں کہاں سے آگئی۔"

"مجو بھائی، عمر بہت ظالم ہوتی ہے۔ اس سے بچ کر آدمی کہاں جاسکتا ہے۔ اسے تو بیچ میں آنا ہی آتا۔"

"ہوں، اب تم کوئی نہ کوئی عذر تو تراشو گے۔"

ہاں شاید یہ عذر تراشنے ہی کی کوشش ہو۔ آدمی جب رہ جاتا ہے تو عذر تو تراشتا ہے۔ مگر ایسی کوشش کا فائدہ کیا ہوتا ہے۔ خیر فائدہ تو اب مجو بھائی کی طنزو تعریض کا بھی کوئی نہیں تھا۔ لکیر پیٹنے والی بات تھی۔ اصل میں مجھے تو افسوس اس کا تھا کہ اتنے شوق سے یہ سفر کیا تھا کہ اسے سفر شوق کہنا چاہئے اور وہ کھوٹا ہو گیا۔ اتنے زمانے بعد اس دیار میں گیا، اس دیار میں جس کے در و دیوار، جس کے شجر و حجر، جس کی ہوا، جس کی چڑیاں کب سے مجھے پکار رہی تھیں، نہیں، میرے اندر سے مجھے اکسا رہی تھیں، اس طرف دھکیل رہی تھیں، مگر وہاں جا کر مت ماری گئی۔ ہر ملاقات ادھوری ہر سیر تشنہ، اور تو اور شنکر جس کے یہاں جا کر میں ٹھہرا تھا۔ کیا کہتا ہو گا وہ بھلا آدمی کہ اتنے ذوق و شوق سے مجھے اپنے آنے کی اطلاع دی، وعدہ کیا کہ تمہارا مہمان بنوں گا۔ اور تھوڑا ٹھہر کر رفو چکر ہو گیا، مڑ کر پھر دیکھا ہی نہیں۔ خیر دوست ہی تو ہے، خط لکھ کر معذرت کروں گا، منا لوں گا۔ اور میمونہ، خیر اس کی بات تو جانے دو۔ اسی نے تو مجھے اکھاڑا تھا۔ تو وہ ملاقات ادھوری رہی تو اس کی وجہ ---------- خیر، ہاں اپنے خیرل بھائی، ان سے ملاقات تو بہت ہی تشنہ رہی۔ کھلے ہی نہیں، ایک دو ملاقاتیں ہوتیں تو پھر شاید کھلتے۔ ویسے بھی خیرل بھائی تو رتجگے کے آدمی ہیں۔ ان سے ملاقات راتیں مانگتی تھی۔ یہاں ایک رات بھی میسر نہیں آئی کہ ان سے رتجگا ہوتا کہ اپنی کہتا ان کی سنتا۔ خیرل بھائی ہمیشہ رتجگے میں کھلا کرتے تھے۔ رات بھیگتی جا رہی ہے، چائے چل رہی ہے۔ ایک پیالی، دوسری پیالی، تیسری پیالی، خیرل بھائی چائے کتنی پیتے تھے۔ پہلے ہی نوٹس دے دیتے کہ دوستو، یہ پہلی کیتلی تو ساجھے کی کیتلی ہے۔ اس سے ہم سب مل کر پئیں گے۔ مگر ایک کیتلی میرے لئے ڈھانک کر الگ رکھ دو۔ اور اصل گفتگو اس دوسری کیتلی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوتی۔ رات جب ڈھلنے لگتی اور اس کیتلی کی تلچھٹ سے

چائے کی آخری پیالی تیار ہو کر حلق میں اتر رہی ہوتی تو خیرل بھائی اپنے عروج پر ہوتے، جیسے اب اپنے اصلی رنگ پہ آئے ہوں۔

خیرل بھائی اپنی زمانے میں یعنی ابھی جب وہ ایک سینئر طالب علم کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے تو ہم سب نوجوانوں کے قبلہ و کعبہ بنے ہوئے تھے۔ میرے تو آئیڈیل تھے۔ اکیلے میرے تھوڑا ہی۔ کتنے طالب علموں نے، پڑھے لکھے نوجوانوں نے انہیں اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ کھدر پوش مگر دھج میں منفرد، یار اکٹھے ہیں اور خیرل بھائی رواں ہیں اور اب جیسے ٹھنٹھ پہ الو۔ صندلی نہ ہوتی تو اکیلے تھے۔ بھائی بہن، بھانجے بھتیجے سب پاکستان میں۔ اچھے عہدوں پہ فائز، آل اولاد کے ساتھ خوش و خرم، ادھر میرٹھ کی اس پتلی گلی میں بھائیں بھائیں کرتا جہان ایسا مکان، زنان خانے میں بیوہ بہن کا اکیلا دم، مردانے میں خیرل بھائی، ہمدم و دم ساز ایک بلی، زندگی بھی خوب رنگ دکھاتی ہے۔ ایک وقت میں کیسا میلہ لگتا ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ میلہ سدا جما رہے گا۔ مگر دیکھتے دیکھتے زمانہ کس طرح رنگ بدلتا ہے۔ میلہ برہم یاروں چہیتوں کی ٹکڑی تتر بتر۔ گہما گہمی ختم۔ چاروں طرف ہو حق۔ کوئی ایک دم ٹروں ٹوں ٹھنٹے پہ ٹکا رہ جاتا ہے۔ کہیں بعد میں پتہ چلتا ہے کہ بس وہی سچا تھا۔ میں اٹھنے لگا تو صندلی جو نہ جانے کس وقت پھر آ کر خیرل بھائی کے برابر آ کر بیٹھ گئی تھی جھرجھری لے کر کھڑی ہو گئی۔ ادھر میرے اندر اچانک ایک جھرجھری دوڑ گئی۔ بس یوں لگا کہ وہ ابھی اپنے پچھلے دو پنجوں پہ کھڑی ہوگی اور اتنی لمبی ہو جائے گی کہ مجھ سے --------- اور اب اس گھڑی کا تصور کرتے ہوئے اچانک میرے اندر ایک بجلی سی کوندی، اچھا یہ تو وہ بلی تھی۔ مگر یہاں کہاں سے آ گئی۔ وہ تو اشبیلیہ میں تھی۔ ابو الحجاج شیخ یوسف شبربولی بھی خوب بزرگ تھے۔ دنیا جہان سے بے تعلق، مراقبہ میں بیٹھے ہوئے۔ ان در و دیوار کے بیچ ایک عمر گزار دی حتیٰ کہ پلکیں تک سفید ہو گئیں۔ آنکھ اٹھا کر یہ نہ دیکھا کہ صحن میں کنوئیں کے متصل کھجور کا ایک درخت کھڑا ہے۔ مگر اپنی کالی بلی سے یہ الفت، ---------

ارے ہاں وہ تو کالی تھی، --------- ہاں تو اس سے یہ الفت کہ گود میں بٹھائے رکھتے۔ اور ابو الحجاج کی وہ بلی بھی خوب تھی کہ کوئی دوسرا مجال ہے کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ لے۔ شیخ کی گود میں پڑی غرغر کرتی رہتی یا پھر سوتی رہتی۔ اولیاء صوفیاء

کو پہچانتی تھی۔ کوئی دنیادار آتا تو اسے دیکھ کر غراتی، کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ کوئی پہنچا ہوا بزرگ وارد ہوتا تو دونوں پنجوں پہ کھڑے ہو کر بغل گیر ہوتی۔ شیخ ابو جعفر عریانی جس گھڑی اس آستانے پر پہنچے بلی شیخ کی گود سے اٹھ کر برابر والی کوٹھری میں گئی ہوئی تھی۔ اس نے فضا میں کچھ سونگھا۔ لپک کر واپس آئی۔ شیخ عریانی کے چہرۂ مبارک کو غور سے دیکھا۔ پھر دونوں پنجوں پہ کھڑے ہو کر آغوش وا کی اور شیخ سے بغل گیر ہوئی۔ ابو المحاج فرمایا کرتے تھے کہ نوواردوں کو میں کیا جانوں۔ میری بلی مجھے بتاتی ہے کہ کون نیک ہے کون بد ہے۔ تو اب میں سمجھا۔ ساتھ میں حیران بھی ہوا۔ اور ہاں افسوس بھی ہو رہا تھا۔ اس وقت تو مجھے اس خیال ہی سے جھرجھری آگئی تھی۔ اور جب وہ دوڑ کر اندر چلی گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اب محرومی کا احساس ہو رہا تھا کہ جیسے شیخ شبرولی کی بلی سے بغل گیری کا شرف حاصل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ پھر خیرل بھائی کو میں بھول گیا۔ ان کی بلی میرے تصور میں گھر کرتی چلی گئی۔ اس بلی نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ خود بھی پہنچی ہوئی لگتی تھی۔ بات یہ ہے کہ سب بلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ اور ہر بلی خالی بلی نہیں ہوتی۔ ان دنوں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بس بلی کو دیکھا اور میرے ہاتھ میں کھجلی ہونی شروع ہوئی۔ فوراً اینٹ اٹھاتا اور نشانہ تاک کر مارتا۔ مگر فوراً ہی پھوپھی اماں کی ڈانٹ پڑتی۔ "بیٹے، میں نے کتنی مرتبہ تجھ سے کہا ہے کہ بلی کو مت مارا کر۔ مجھے شک آوے ہے۔ مگر تیرے کان پہ تو جوں ہی نہیں رینگتی۔"

"پھوپھی اماں، کس بات کا شک۔"

"ارے بیٹے، ان بلیوں کا پتہ نہیں ہوتا کہ کون بلی کیا ہے۔ اور خاص طور پہ کالی بلی۔ اس پہ تو کبھی ہاتھ اٹھانا ہی نہیں چاہئے۔"

"پھوپھی اماں، کالی بلی کو کیا ہوتا ہے۔"

"اب یہ تو پتہ نہیں کہ کالی بلی کے ساتھ کیا بھید لگا ہوا ہے۔ ہم تو بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں۔ مجھے تو بس اتنا پتہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک مٹی کالی بلی نے دودھ میں منہ ڈال دیا۔ میں نے غصے میں آکے اسے ڈنڈا مار دیا۔ اے بھیا، وہ تو پھر ایسی غائب ہوئی کہ دکھائی نہیں دی۔ پر تین دن وہ میرے خواب میں آتی رہی۔ پھر میں نے یہ کیا کہ تین مرتبہ قل پڑھ کر اور ارد گرد پھونک مار کے سوئی۔ پھر اس نے میرا پیچھا

چھوڑا۔"

مگر خیرل بھائی کی بلی تو صندلی رنگ کی تھی۔ پھر بھی میں اسے دیکھتے ہی شک میں پڑ گیا۔ خیرل بھائی تو خیر ہمارے جانے بوجھے تھے۔ مگر ان کی بلی جیسے اس کے گرد کوئی بھید منڈلا رہا ہو۔ مگر ان کے لئے تو وہ جیسے سب عزیزوں دوستوں کا اگلی پچھلی صحبتوں کا نعم البدل تھی۔ سب کو رخصت کرکے کس اطمینان اور کس وقار کے ساتھ اس بلی کے سنگ اپنی ٹھیک پہ بیٹھے تھے۔ اس وقت تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ بس چکرا کر رہ گیا تھا۔ اب اچانک کتنا کچھ سمجھ میں آگیا تھا۔ میرٹھ کی وہ اجڑی پجڑی اندھی گلی اب میرے لئے اندھی گلی نہیں تھی۔ جاتے جاتے وہ کس دیار میں جانکلی۔ اور اس پہنچی ہوئی بلی نے بھی مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا------------ اور جب ابن حبیب تندور سے نکلا گرم گرم نان تناول کر چکا تو عبداللہ نان فروش سے کٹورا لے کر کچے گھڑے سے انڈیل کر ٹھنڈا پانی پیا۔ یہ کچھ کرکے رب کریم کا شکر ادا کیا اور پھر کچھ سوچ کر رویا۔ کتنے دنوں سے وہ ہجوم درد غریبی میں گھرا اس اجنبی دیار میں آوارہ و پریشان پھرتا تھا۔ جہاں جیسی روکھی پھیکی کھانے کو مل جاتی کھالیتا اور پڑا رہتا۔ آج دنوں بعد اس نے اپنے تئیں ایسے گوشے میں پایا جہاں اس کے سر پہ چھت کا سایہ تھا اور برابر میں تندور روشن تھا۔ جس کی حرارت نے اسے گرمی پہنچائی اور اس کے اندر سکتے نانوں کی سوندھی مہک نے اس کی مشام جاں کو معطر کیا۔ پھر عبداللہ نان فروش نے جس نے صورت اس کی دیکھ کر اس کی پریشاں حالی کا اندازہ لگایا تھا۔ ایک گرم گرم تندوری نان اور ایک پیالہ سالن کا اس کے روبرو رکھا اور کمال محبت سے اسے دعوت طعام دی۔ جب وہ سیر ہو کر کھا چکا تو بچھڑے ہوؤں کو جنہیں وہ اب تک اپنی پریشانی میں یاد نہیں کرسکا تھا۔ شدت سے یاد کیا اور پھر گریہ کیا۔

اس کی یہ کیفیت دیکھ کر عبداللہ نان فروش اس کی دل جوئی کرتے ہوئے یہ بولا کہ "اے مرد اجنبی کہ تیری پریشان حالی اور درماندگی پہلے ہی تیرے بشرے سے عیاں تھی۔ پر میں چپ تھا۔ اب تو رویا تو میرا جگر کٹ گیا۔ اب مجھ پر لازم آتا ہے کہ تجھ سے تیرا احوال پوچھوں۔ میرے عزیز، دل حال کہنے سے ہلکا ہوتا ہے اور سننے والے کو اگر وہ صاحب دل ہے غم بٹانے کا موقعہ میسر آتا ہے۔ سو بیان کر کہ تو کس دیس کی مٹی ہے

تب ابن حبیب نے اپنے تئیں سنبھالا اور بعد تامل کے یوں گویا ہوا کہ "اے میرے غمگسار، کہنے کو تو یہ خانہ برباد مالقہ سے اجڑ کر آیا ہے اور اس تیرے دیار میں بے گھر بے در پھرتا ہے۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ خانہ بربادی کچھ اس سیاہ بخت کے لئے نیا واقعہ نہیں۔ نسلوں سے یہ ہمارے قبیلہ کا مقدر چلی آتی ہے۔ جاننا چاہئے کہ یہ خانہ خراب اصل میں اس اجڑے دیار کی مٹی ہے جسے خلقت اشبیلیہ کے نام سے جانتی ہے۔ ایسا نگر چشم فلک نے کبھی کاہے کو دیکھا ہوگا۔ دھوم اس کی روم سے تاشام تھی۔ علماء و حکماء کہ اس دیار میں مسند نشین تھے ارسطاطالیس اور جالینوس سے بڑھ کر تھے کہ بغداد تک میں علم و حکمت کا ان کے لوہا مانا جاتا تھا۔ اس شاد آباد دیار میں ہمارے جد اکبر ابو الحجاج شیخ یوسف شبربولی یوں اپنی مسند ولایت پہ بیٹھے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ، شہرہ ان کی کرامتوں کا دیار و امصار میں تھا۔ عمر اس بزرگ نے لمبی پائی کہ سو برس اس عالم فانی میں گزارے۔ مگر ان سے زیادہ عمر ان کی بلی نے پائی کہ جب اشبیلیہ خالی ہو رہا تھا وہ اس دار فنا میں موجود تھی۔ بعد میں اس پر کیا گزری اور کب اور کیسے اس نے داعی اجل کو لبیک کہا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

بارے اس بلی کا کچھ بیاں ہو جائے۔ جاننا چاہئے کہ وہ گربہ سیاہ تھی، پر روشن ضمیروں سے الفت رکھتی تھی۔ دنیاداروں پر غراتی تھی، اہل اللہ سے بصد محبت بغل گیر ہوتی تھی، ہمارے جد اعلیٰ کی چہیتی تھی۔ گود میں ان کے لیٹی رہتی تھی۔ جب شیخ کا دم واپسیں آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ ہمارے بعد جو ہماری بلی کہے وہ کرنا۔ یہ کلمہ کہہ کر وہ تو اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ یہاں وہ نیک پاک بلی لاش کے قریب دھنی دے کر بیٹھ گئی۔ جو قریب آتا اس پر غراتی۔ کسی کو قریب پھٹکنے نہ دیتی۔ یہ خبر شیخ عریانی تک گئی۔ وہ بزرگ کلمہ کا ورد کرتے وارد ہوئے۔ انہیں دیکھ کر وہ روشن قلب گربہ سیاہ کہ اب الم کی تصویر بنی ہوئی تھی مودب اپنے دونوں پنجوں پر کھڑی ہوئی۔ شیخ سے گلے مل کر روئی اور مودبانہ پیچھے ہٹ گئی۔ شیخ نے ہمارے جد امجد کو اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور اشبیلیہ کے بڑے مدفن میں جا کر انہیں قبر میں اتارا۔ گربہ سیاہ نے پھر اسی مزار مبارک کو اپنا مسکن جانا کہ شب و روز اس کے وہیں بسر

ہوتے تھے۔

سنا میں نے اپنے جد سے اور اس جد نے سنا اپنے جد سے۔ جو فرزند دلبند تھے ابو الحجاج شیخ یوسف کے کہ ایک وقت ایسا آیا کہ وہ مضطرب ہو کر مزار سے اٹھتی اور اس کا شانے پر آ کر گریہ کرتی جو پہلے شیخ کا مسکن تھا اور جہاں اب ان کا فرزند پورے خاندان سمیت رہائش پذیر تھا۔ رات بھر گریہ کرتی اور گھر کی پاسبانی کرتی۔ صبح ہوئے پر واپس مزار پر چلی جاتی کچھ نہ کھلا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ عقدہ اس وقت کھلا جب نصرانیوں نے اس شہر پر دھاوا بولا۔ یہ حملہ اشبیلیہ پر بھاری پڑا۔ المعتمد اپنی شاعری اور شمشیر کے ساتھ پہلے ہی اس دیار سے بصد حسرت دیاس رخصت ہو چکا تھا اور رنج اسیری کھینچ کر اس کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔ اب اشبیلیہ کے باقی فرزندوں کی باری تھی جن کی تلواروں کو زنگ لگ چکا تھا۔ قیامت کی گھڑی تھی۔ اشبیلیہ اپنے آخری سانس لے رہا تھا۔ تلوار کے دھنی ایک ایک کر کے سب ہی کھیت ہو گئے۔ میرے جد کا پدر بھی اس معرکہ میں کام آیا۔ تب سراسیمہ خلقت گھروں سے نکلی اور جس کے جدھر سینگ سمائے ادھر نکل گیا۔ اے عزیز باتمیز، میں نے سنا اپنے جد سے اور اس نے سنا اپنے جد سے کہ اس ہنگام ہماری بزرگ گربہ سیاہ جدامجد کے مزار پر انوار سے اٹھ کر آئی اور بصد گریہ میرے جد کے جد سے بغل گیر ہوئی۔ اس سے اس بزرگ نے یہ اشارہ لیا کہ یہ شیخ کی روح پر فتوح کی طرف سے رخصتی کی ہدایت ہے۔ سو اس نے بادل نخواستہ پورے قبیلہ کو سمیٹا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ گربہ سیاہ سواد شہر تک ساتھ ساتھ آئی۔ پھر ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ میرے جد کے جد سے ایک مرتبہ پھر بغل گیر ہوئی۔ اور گریہ کرتی ہوئی واپس مزار پر انوار کی طرف چلی گئی۔ راویوں سے روایت ہے کہ اس کے بعد اشبیلیہ خلقت سے بالکل خالی ہو گیا۔ تین دن تک یہ صورت رہی کہ خالی ؤ حنڈ حار شہر میں بس ایک کالی بلی روتی پھرتی تھی۔

نکلنے والے صرف اشبیلیہ سے نہیں نکلے تھے۔ وہ اندلس سے بھی نکل جانا چاہتے تھے۔ مگر میرے جد کے جد کی نیت یہ تھی کہ اندلس ہی کے اندر کہیں پناہ تلاش کرو۔ شہر کے ایک صاحب فہم بزرگ نے اس کے یہ تیور دیکھے تو اسے فہمائش کی کہ اے صاحب بصیرت باپ کے بے بصیرت بیٹے، تیرے دماغ میں یہ کیا سمائی ہے، کیا تو

نہیں دیکھتا کہ قرطبہ تو پہلے ہی جا چکا۔ اب اشبیلیہ بھی گیا، اس کے بعد اندلس کے کس شہر میں تاب مزاحمت ہے، باقی ماندہ قریئے پانی کے بلبلے ہیں کہ ان کی بنا پر آب ہے، اب اندلس میں ہمارے لئے کہیں پناہ نہیں، عقل سے کام لے اور ہمارے ساتھ چل کہ ہم نے یہاں سے نکل کر فیض میں پناہ لینے کی نیت باندھی ہے۔

یہ کلام سن کر میرے جد کا جد رویا اور یوں گویا ہوا کہ صبر کی سل سینے پر رکھ کر اشبیلیہ سے تو میں نے کنارہ کر لیا کہ پدر بزرگوار کی طرف سے یہی اشارہ مجھے ملا تھا، مگر کیا میں اندلس ہی سے منہ موڑ کر نکل جاؤں قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اندلس سے یہ بے وفائی مجھ سے نہ ہو گی۔ سوائے بزرگ یہاں سے میری اور اہل اشبیلیہ کی راہیں جدا ہوتی ہیں۔

یہ کہہ کر میرے جد کے جد نے اپنی الگ رہ لی اور ہرج مرج کھینچتا، رنج سفر سہتا، مالقہ کی بستی میں پہنچا، بس اس زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے، پھر وہ وہیں کا ہو رہا، جلد ہی اس نے اپنا کچا پکا گھر بنا لیا۔ پھر اس نے اس کے صحن میں ایک کھجور کا پیڑ لگایا اور اس کے سائے تلے ایک تخت بچھایا جس پر بیٹھ کر وہ صبح و شام گریہ کیا کرتا تھا۔ میں نے سنا اپنے جد سے کہ روز صبح و شام وہ اشبیلیہ کے در و دیوار کا تذکرہ کرتا اور اس گمشدہ صحن میں لگی کھجور کو یاد کرتا جو اس کی دانست میں کھجوروں کی شہزادی تھی، اور پھر گریہ کرتا۔ اپنی آخری صبح اس نے اس طور کی کہ میرے جد کو قریب بلایا اور دیکھ کر مسکرایا اور میرے جد نے بیان کیا کہ اشبیلیہ سے نکلنے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اپنے باپ کے چہرے پر مسرت کی لہر دیکھی، مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے میرے بیٹے یہ وصال کی صبح ہے، میں نے صبح صادق کے طلوع کے ساتھ خواب دیکھا کہ جیسے میں اشبیلیہ گیا ہوں اور اپنے گھر کے صحن میں اپنی کھجور کے سائے میں بیٹھا ہوں اور گریہ سیاہ مجھ سے آکر گلے ملی ہے یہ کہہ کر میرا باپ مسکرایا اور بولا کہ صبح صادق کا خواب سچا ہوا کرتا ہے۔ یہ کہتے کہتے اس نے ہچکی لی اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

ابن حبیب چپ ہوا۔ پھر تامل کر کے افسردگی کے ساتھ بولا "اے میرے عزیز اب میں اپنے اجداد کی سنت میں اپنے قریئے سے اجڑ کر نکلا ہوں اور تیرے شہر میں وارد ہوا ہوں اور میں اپنے اجداد سے بڑھ کر سیہ بخت ہوں۔ ان کے لئے ایک غم تھا،

مرے جد کا جد اشبیلیہ کی جدائی کا داغ سینے پر لے کر مالقہ میں وارد ہوا تھا' میرے سینے پر دو داغ ہیں' اشبیلیہ کا غم میرا جدی غم ہے' مالقہ کا غم میرا اپنا غم ہے' اشبیلیہ میں میرے اجداد کی قبریں ہیں' مالقہ میں میری نال گڑی ہے۔ سوائے میرے غمگسار میرے مشفق' میں سینے پر دو داغ لئے تیرے شہر میں بھٹکتا پھرتا ہوں اور یہ جو میری چشم پُر آب ہیں' یہ دونوں میرے لئے عذاب ہیں۔ ایک اشبیلیہ کے لئے اشک بار ہے۔ دوسری مالقہ کے لئے روتی رہتی ہے۔"

یہ کہہ کر ابن حبیب رویا۔ عبداللہ نان فروش کی بھی آنکھ بھیگ گئی۔ اس نے آنسو پونچھے اور یوں کلام کیا کہ "اے اشبیلیہ کے مبارک شہر کی مٹی اور اے مالقہ سے آنے والے' تو نے میرے اس غم کو جو میں نے مدت سے فراموش کر رکھا تھا تازہ کر دیا۔ جان لے کہ ویسے تو میں غرناطہ ہی کا فرزند ہوں کہ میری نال یہاں گڑی ہے مگر میں مٹی ہوں قرطبہ کی۔ میرے اجداد کا جد قرطبہ سے اجڑ کر نکلا تو ہرج مرج کھینچ کر یہاں پہنچا حق یہ ہے کہ غرناطہ نے اس کی بہت دلجوئی کی۔ جس طور ایک ماں پردیس سے واپس آنے والے اپنے جگر کے ٹکڑے کے لئے آغوش وا کرتی ہے اسی طور غرناطہ نے قرطبہ سے آنے والے اس خانہ برباد کے لئے آغوش وا کی۔ مگر اس شہر کی یہ شفقت میرے جد اکبر کے غم کا مداوا نہ کر سکی۔ قرطبہ سے جدائی کا غم اسے گھن کی مثال کھاتا رہا۔ سنا میں نے اپنے جد کے جد سے کہ اس جد بزرگ کو ہر پھر کر ایک ہی خواب دکھائی دیتا تھا کہ جیسے وہ قرطبہ گیا ہے اور قرطبہ کی بڑی مسجد اسے دور سے دکھائی دے رہی ہے۔ وہ بیتابی سے اس مسجد کی طرف بڑھتا ہے مگر ابھی رستے میں ہوتا ہے کہ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور ہر بار صبح کو بیٹوں کو جمع کر کے وہ یہ خواب سناتا اور گریہ کرتا اور کہتا کہ اے میرے بیٹو اپنے کم نصیب باپ کے حق میں دعا کرو کہ ایک مرتبہ اسے خواب ایسا نظر آئے کہ وہ مسجد الاعظم کی سیڑھیوں تک پہنچ جائے۔"

یہ بیان کرتے کرتے عبداللہ نان فروش کی آنکھ بھر آئی اور آواز بھرا گئی۔ وہ چپ ہو گیا۔ دیر تک وہ دونوں چپ بیٹھے رہے۔

دیر بعد عبداللہ نان فروش نے زبان کھولی اور یوں بولا کہ "اے جگر پہ دو داغ رکھنے والے' میرا اور تیرا درد مشترک ہے۔ سو جان لے کہ اب تو اس شہر میں اکیلا

نہیں ہے۔ سو جس چھت کے نیچے تو بیٹھا ہے اسے اپنی چھت جان۔ اب اس تندور کے پاس بیٹھ کر اپنے قریئے کی یادوں کو تازہ کیا کر۔ شاید اس واسطے سے میں بھی اس خوشبو شہر کی یاد تازہ کر سکوں جہاں کی میں مٹی ہوں"

یہ کلام سن کر ابن حبیب فرط جذبات سے رو پڑا اور بولا "غرناطہ کی مہمان نوازی کے جو قصے میں سنا کرتا تھا ان کی آج تصدیق ہو گئی"

تسپر عبداللہ نان فروش یہ بولا "میرے یار، غرناطہ شہر عجب ہے اور یہ ایام بھی عجب ہیں کہ اجڑ کر آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اندلس کے دور دور کے اجڑتے برباد ہوتے شہروں سے خانہ خراب قافلہ در قافلہ آ رہے ہیں اور غرناطہ میں ڈیرے ڈال رہے ہیں اور اب عالم یہ ہے کہ غرناطہ میں غرناطہ کے فرزند کم نظر آتے ہیں باہر سے آئے خانہ برباد زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔"

ابن حبیب نے زہر خند کیا اور بولا "منجملہ ان کے ایک میں بھی ہوں"

"یار جواد مجھے لگتا ہے کہ تم بھی انہیں میں سے ہو" میں چونک پڑا یہ آواز بیچ میں سے کہاں سے آ گئی۔ انمل بے جوڑ۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔ وہ ساری لڑی ہی بکھر گئی۔ بلکہ غائب غلہ ہو گئی۔ اب مجو بھائی کی بات یاد آ رہی تھی۔

"یار مجھے لگتا ہے کہ تم بھی وہیں سے انہیں کے ساتھ نکلے تھے۔ پہلا پڑاؤ تم نے بھی غرناطہ ہی میں کیا تھا۔ یا شاید اب بھی وہیں ڈیرے ڈالے پڑے ہو۔ یار بہت ہو گئی۔ نکل آؤ وہاں سے۔" مجو بھائی ہنسے۔

میں واقعی سوچ میں پڑ گیا۔ کیا واقعی؟ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے یہی وہ بات ہو جو میں بھول گیا تھا۔ سوچتا رہا، یاد کرتا رہا، یہ دھیان دیئے بغیر کہ مجو بھائی نے یہ بات کس لہجہ میں کہی تھی۔ خیر بہت یاد کیا۔ کچھ یاد نہیں آیا۔ پھر اپنی حماقت پہ ہنسا۔ مجو بھائی تو اپنی ہانکتے رہتے ہیں۔ تم عجب ہو کہ ان کی بات پہ سنجیدہ ہو گئے۔ اس احساس کے باوجود سنجیدگی اپنی جگہ برقرار رہی۔ جب کچھ یاد نہ آیا تو اور افسوس ہوا، کہ میں ان میں سے نہیں ہوں "نہیں، مجو بھائی، نہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں تمہارے والے انبوہ میں سے ہوں۔ اسی انبوہ کے ساتھ آیا اور اس شہر بے فیض میں آ کر ڈیرے ڈالے۔"

"پیارے ایسامت کہو۔ یہ شہر بے فیض اب ہوا ہے۔ اس وقت بے فیض ہوتا تو تم جھگی ہی میں پڑے گلتے سڑتے رہتے۔"

مجو بھائی نے کیا بات یاد دلائی۔ نشانہ تاک کر مارا تھا۔ مجھے اپنی جھگی والا زمانہ یاد آگیا۔ وہ قیامت خیز بارش جس نے ان ساری جھگیوں کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ تھوڑا بعد میں آئی۔ میں اس وقت تک مجو بھائی کے کوارٹر میں منتقل ہو چکا تھا، نہیں تو میری بھی چارپائی مع ایک عدد کھیس اور دری کے ریلے میں بہتی نظر آتی۔ اس زمانے میں تو جھگیوں کو دیکھ کر عبرت ہوتی تھی کہ کیسے کیسے مکانوں کے مکین دم کے دم میں جھگی نشین بن گئے۔ مگر اب مجھے یوں لگتا تھا کہ پاکستان کا یا کم از کم کراچی کا سنہری زمانہ وہی جھگیوں کا زمانہ تھا۔ ویسے تو یوں بھی اس دور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں یہاں نہ نقاب پوش دکھائی دیتے تھے نہ کلاشنکوف والے، نہ دن دہاڑے کاریں چھیننے والے، خیر اس زمانے میں کاریں یاروں کے پاس تھیں بھی کہاں۔ پاس نہ مال و اسباب تھا، نہ طبل و علم، نہ سواری باد بہاری۔ زمانہ خلاف ہو کے کیا لیتا اور چھیننے والا کیا چھینتا۔ سرمایہ لے دے کے یادوں کا تھا۔ اصل میں میں اس وقت اسی زاویئے سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یادیں ان دنوں یاروں کے پاس بہت تھیں۔ دامن بھرے ہوئے تھے۔ پڑے ہیں جھگیوں میں، خیالوں میں بسے ہوئے ہیں اونچے بام و در۔ باتیں لال قلعہ کی، پسرے ہوئے ہیں لالو کھیت میں۔ مگر یہ دور جلدی گزر گیا۔ جلدی جھگی نشین بالا نشین بن گئے۔ پھر وہ اہل سرمایہ میں شمار ہوئے۔ یادوں کا سرمایہ میرے نام لکھا گیا۔ اسی نسبت سے طعنے بھی حصے میں آئے۔ طعنے، طنز، تعریض، تمسخر۔

"جواد بھائی، معاف کیجئے آپ میرٹھ کیا لینے گئے تھے؟"

"جی؟" میں نے حیران ہو کر توصیف کو دیکھا۔ مجھے احساس ہوا کہ بیوروکریسی کا پرزہ یا اختری باجی کے لفظوں میں ضلع کا حاکم بننے کے بعد توصیف کا لہجہ کچھ بدل گیا ہے، اور شاید انداز نظر بھی۔

"دیکھئے جواد بھائی، اس روز ہم نے آپ کو نوچندی کے پراٹھے بھی کھلوا دیئے اور خیر نگر کے سیخ کباب بھی۔ اور ہم جیسے خاکسار بھی یہیں ہیں۔ ادھر رہ کیا گیا۔"

"بس تمہارے خیرل بھائی اور ان کی بلی۔" مجو بھائی نے ٹکڑا لگایا۔

توصیف نے ایک پر تکلف قہقہہ لگایا۔ پھر بولا "میں ایک دفعہ گیا تھا میرٹھ۔ کوٹلہ کا باجی کسی زمانے میں بہت ذکر کیا کرتی تھیں۔ وہاں الّو بول رہا تھا۔ کچھ بڈھے ٹھڈے دکھائی دیئے۔ لگتا تھا کہ پچھلی صدی کے لوگ ہیں۔ خیرل بھائی اپنی بیٹھک میں ٹونڈو نوں بیٹھے تھے۔ بہت پتلا حال تھا موصوف کا۔ مجھے ان پہ بہت رحم آیا۔ پاکستان آجاتے تو ان کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جاتا۔"

"کیسے آجاتا۔" اختری باجی بولیں "عقل پہ جو پتھر پڑے ہوئے تھے۔ رشتہ داری تو خیر ہماری دور کی تھی۔ مگر محلہ داری کا رشتہ تو تھا۔ اماں نے بہت سمجھایا تھا کہ بیٹا خیرل یاں اب کیا رکھا ہے۔ یاں رہ کے کیا جو تیئں گانٹھو گے۔ پاکستان چلے چلو۔ مگر اس کے تو دماغ میں فتور تھا۔ نہیں مانا۔ اپنی تقدیر پھوڑ لی، ماں باپ نے کن مصیبتوں سے پڑھایا لکھایا تھا۔ سب اکارت گیا۔"

"مجو بھائی، میں تو دو دن میں وہاں بور ہو گیا۔ ایک تو میں اپنے ان بزرگوں کے باتھ روم سے بہت تنگ تھا۔ کمال ہے، وہاں کھڈیاں اب تک چل رہی ہیں۔"

"رحم آتا ہے ان لوگوں پہ۔" اختری باجی نے توصیف کے بیان میں اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ "اب واں رکھا کیا ہے۔ رونق تو یچی بات ہے ہمارے دم سے تھی۔ اب واں کون ہے۔ ایرا غیرا ہی رہ گئے ہیں۔ تیلی تنبولی، بھٹیارے گھسیارے یا خیرل جیسے نکھٹو، میں تو یچی بات ہے خالو کے مرنے پہ خالہ اماں کے منہ سے چلی گئی تھی۔ چار دن میں بولا گئی۔ چالیسواں کرتے ہی واں سے نکل کھڑی ہوئی۔"

اور مجو بھائی کس مزے سے ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

"مجو بھائی۔" بشو بھابی کہنے لگیں "ہم بڑا بول نہیں بولتے۔ مگر یچی بات تو کہنی ہی پڑتی ہے۔ نگوڑے لکھنؤ کی ناک تو ہمارا خاندان تھا۔ ہمارے آنے کے بعد تو واں خاک اڑتی ہے۔"

"عالی جاہ۔" سید آقا حسن کہنے لگے "اب تو اس دیار کو یاد کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ ہمارا غریب خانہ، میاں یقین جاننا، پورا محل تھا۔ اب اس کے نام ایک کھنڈر کھڑا ہے۔ تو قبلہ آپ منصفی کریں، کس واسطے سے اب ہم اس اجڑے دیار کو یاد کریں۔"

مجھے دلکشا کی یاد آگئی۔ وہاں دلکشا کی جگہ اب ملبہ پڑا تھا۔ عمارت کے نام ایک زینہ رہ گیا تھا۔ وہ بھی خستہ و شکستہ، عجب بات ہے۔ زلزلہ بیشک پوری عمارت کو ہلا ڈالے، زینے کو کچھ نہیں کہتا۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ زلزلہ آئے تو زینے کے نیچے پناہ لو۔ محفوظ رہو گے۔ تو بس دلکشا کے نام ایک خستہ و شکستہ زینہ رہ گیا تھا۔ اس خستہ و شکستہ زینے نے "دلکشا" کے گزرے دنوں کو میرے اندر زندہ کر دیا۔ اب میں اس زینے کو اپنے اندر لئے پھر رہا تھا۔ اور ہاں وہ حویلی کی خستہ حال کائی آلود دیوار۔ پتہ نہیں کائی لگی دیوار میں کیا کچھ چھپا ہوتا ہے۔ جو دیوار کائی لگ لگ کر بالکل کالی توا ہو جاتی ہے۔ اس میں تو سچ مچ کوئی جادو ہوتا ہے۔ آدمی کو باندھ لیتی ہے۔ لگتا ہے کہ دیوار نہیں ایک پورا زمانہ آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ برسات کی اس شام اپنی حویلی کی دیوار نے مجھ پر کچھ اسی قسم کا اثر کیا تھا۔ بس جیسے دیوار نے مجھ پہ جادو کر دیا ہو۔ کتنی دیر تک اس بارش میں بھیگی اونچی کالی دیوار کو تکتا رہا۔ میں نے اپنی حیرت میں میمونہ کو بھی شریک کرنا چاہا۔ "میمونہ دیکھ رہی ہو، حویلی کی یہ دیوار کتنی کالی ہو گئی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے کتنی برساتیں دیکھی ہیں۔"

میمونہ بھی میری حیرت میں شامل ہو گئی "واقعی۔" جیسے پہلی بار اس نے اس دیوار کو دیکھا ہو۔

مگر اس دیوار کے واسطے سے اپنی برتی ہوئی برساتوں کا ذکر کرتے کرتے کہیں یہ فقرہ میرے منہ سے نکل گیا۔ "اب اگلی برساتیں آنے والے دیکھیں گے۔"

اس فقرے پر میمونہ نے کس قہر سے جس میں دکھ بھی شامل تھا مجھے دیکھا تھا "کون آنے والے؟ یاں اب کسے رہنا ہے۔"

میں ایسا چپ ہوا کہ دیر تک نہ منہ سے کوئی بات نکلی نہ اس سے نظر ملانے کی ہمت ہوئی۔ وہ بھی ایک فقرہ کہہ کے گم سم ہو گئی۔ کتنی دیر تک ہم دونوں چپ اور ساکت بیٹھے رہے۔ خاموشی کے دو جزیرے، ایک دوسرے سے کوسوں دور۔

وہ حویلی میرے لئے اب ایک خواب تھی۔ وہ سارا زمانہ ہی خواب و خیال ہو گیا۔ مگر وہ کالی دیوار اس روز سے میرے پیچھے لگ گئی۔ اور "دلکشا" کی باقیات وہ زینہ جیسے میں اس زینہ اور دیوار کے بیچ آگیا ہوں۔ ان دو طلسمی طاقتوں نے مجھے اپنے

گھیرے میں لے لیا- وقت اور برساتیں مل کر دیوار کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں سیدھی سادھی دیوار دیوار حیرت بن جاتی ہے- پوری عمارت ڈھے جائے اور ایک زینہ باقی رہ جائے تو پھر سیڑھیوں کے اندر سیڑھیاں بن جاتی ہیں- یہ سیڑھیاں اب میرے اندر تھیں، بلند ہوتی چلی جا رہی تھیں- اور میں-------- خیر تو اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ دھرم شالا اپنی کاہی کھائی دیوار اور اونچے پیپل کے ساتھ کیوں ان دنوں ہمیں ایک بھید معلوم پڑتی تھی- دیوار اور پیپل جیسے دھرم شالا انہیں دو چیزوں سے عبارت ہو اور انہیں کے سبب بھید بنی ہو- دیوار اور پیپل- ارے------ اچانک مجھے اپنا نیم یاد آگیا- اے لو، اسے تو میں بھولا ہی جا رہا تھا- زینہ اور دیوار برحق مگر سب سے بڑی طلسمی طاقت تو حویلی کے صحن میں کھڑا اپنا وہ بزرگ نیم تھا جس کی گھنی ٹہنیوں نے جھک کر اس کالی دیوار کی منڈیر کو ڈھانک لیا تھا- اونچا گھنا نیم کا پیڑ ہو اور کاہی لگی دیوار اور اتنی ہی کاہی لگی اس کی منڈیر ہو اور گھنی ٹہنیاں جھک کر اس منڈیر پہ چھا گئی ہوں تو جادو کا ایک پہاڑ کھڑا ہو جاتا ہے- عجب ہوا کہ میں اتنے زمانے بعد وہاں گیا تھا- حویلی کے ایک ایک کونے کو ایک ایک شئے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا مگر اس نیم کی طرف دھیان ہی نہیں تھا- جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو- بس برکھا سے دھلی اس گھڑی میں اچانک میں پکڑا گیا- بس جیسے نیم نے باندھ لیا ہو- جیسے میں پہلی بار اسے دیکھ رہا ہوں- حالانکہ اس کی چھاؤں میں تو میں نے اپنی زندگی کی بہترین گھڑیاں گزاری تھیں- میمونہ کے ساتھ مل کر- اس کی ٹہنیوں میں چھپ کر- جیسے ہم دو پرندے ہوں، شاخوں میں چھپ کر چہک رہے ہوں- مگر ان دنوں تو وہ نیم ہمارے لئے کوئی بھید نہیں تھا- کیسا بھید، وہ تو ہمیں میں سے تھا- یا ہم اس میں سے تھے- اس کی ہری بھری ٹہنیوں کے بیچ دو بکی بکی ٹہنیاں، بھید تو اب بنا- تنے کی وہ کھکھل ایک دم سے کیا سے کیا بن گئی- جیسے وہ کھلتی چلی جا رہی ہے اور کہیں اس کے بیچ سے بہت گہرائی سے آواز آ رہی ہے- دھیرے دھیرے، دھیرے دھیرے، اور جیسے وہ میرے برابر بیٹھی ہوئی نہیں ہے- اس کے بیچ سے برآمد ہوگی- یاالٰہی چیزیں بھید کیسے بن جاتی ہیں- یا ہوتی ہیں، بس ہم پہ وہ کسی خاص ساعت میں منکشف ہوتی ہیں- آخر یہ سب کیا ہے- ابر کیا چیز ہے- ہوا کیا ہے، ہوا جب وہ ٹہنیوں کو ہلکورے دے رہی ہوتی ہے- اور نیم کیا چیز ہے- ٹہنیاں نمکولیاں کہاں

سے آئی ہیں۔ اور کائی لگی دیوار اور منڈیر۔ اگر صوفی والی ذرا سی بھی رمق مجھ میں ہوتی تو اس روز اس گھڑی میں واقعی عالم تحیر میں چلا جاتا۔ پھر ساری عمر اس طور گزرتی کہ بیٹھا ہوں اور نیم کو تک رہا ہوں۔ اور اس کائی لگی دیوار کو۔ دیواریں تو اپنی اس دھرم شالا کی بھی بارشوں کے اثر سے کائی کھا کھا کے بالکل کالی پڑ گئی تھیں۔ اس کی منڈیر پہ جب کوئی بندر دکھائی دیتا تو میمونہ کتنا چونکتی تھی۔ یوں بندر ہمارے آس پاس عام طور پر گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ مگر اس منڈیر پر بیٹھا ہوا بندر خالی بندر نہیں ہوتا تھا۔ پتہ نہیں کیا بن جاتا تھا۔ ویسے بندر اور بلی دو ایسے جانور ہیں کہ اچانک کچھ سے کچھ بن جاتے ہیں، یعنی بلی خالی بلی نہیں رہتی اور بندر محض بندر نہیں رہتا۔ قدرت کے بھیدوں میں سے دو بھید بلی اور بندر ہیں۔ شنکر چلتے چلتے رکا "جواد، یہ بہت پرانا مندر ہے۔ اور اس کے بارے میں ایک کہانی بھی لوگوں میں مشہور ہے۔ وہ بعد میں، پہلے مندر دیکھ لیں۔"

واقعی اس کی کائی کھائی دیواریں اور منڈیریں پتہ دے رہی تھیں کہ بہت پرانا مندر ہے۔ میں شوق سے آگے بڑھا۔ مگر داخل ہوتے ہوتے ٹھٹھک گیا۔ "نہیں یار، بس دیکھ لیا۔"

"یار اندر چل کے دیکھو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ تم ایسے کونسے مسلمان نظر آتے ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔"

کسی نہ کسی طرح میں نے بات کو ٹالا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ پتہ ہے بات کیا تھی۔ مندر کی منڈیر پہ ایک بندر بیٹھا تھا۔ پرانے مندر کی کائی لگی کالی منڈیر پہ خاموش بیٹھا ہوا اکیلا بندر، بس میرے اندر ڈر سا گیا۔ مجھے لگا کہ ابھی وہ منڈیر سے اترے گا اور پچھلے دونوں پیروں پہ کھڑے ہو کر مجھ سے بغل گیر ہو جائے گا۔ یا ممکن ہے، میں نے سوچا، مجھ سے آ کر بغل گیر نہ ہو، وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی دم لمبی ہوتی چلی جائے اور میرے رستے میں آ کر اس طور پھیل جائے کہ میں نہ آگے بڑھ سکوں نہ پیچھے ہٹ سکوں۔ اور کیا خبر ہے کہ وہ بندر ہی نہ رہے، بندر کے سوا میرا مطلب ہے کہ بندر سے بڑھ کر کچھ بن جائے۔ بندر اور بلی، ان دونوں کا کوئی اعتبار نہیں کہ کون کس گھڑی کیا

بن جائے۔ مگر ہماری پھوپھی اماں کچھ اور کہتی تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ بندر شروع میں بندر نہیں تھے۔

"اچھا؟" میں مجسم حیرت بن گیا اور میمونہ بھی "پھوپھی اماں، پھر وہ کیا تھے۔"

"بس وہ بھی ہماری تمہاری طرح اللہ کے بندے تھے۔ مگر کم نصیبوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی۔ ان پہ ایسا عذاب پڑا کہ وہ بندر بن گئے۔"

میں ڈر گیا اور میمونہ بھی۔ ہم دونوں نے پنجوقتہ نماز شروع کر دی۔ مگر پھر مجھے ایک اور ہی وسوسہ ستانے لگا۔ "پھوپھی اماں، یہ بندر جو ہوتے ہیں تو کیا وہ بندر ہی ہوتے ہیں۔"

پھوپھی اماں نے تامل کیا۔ پھر بولیں "ویسے تو وہ بندر ہی ہووے ہیں۔ مگر کوئی کوئی بندر بخت مارا بندر نہیں بھی ہوتا۔"

"بندر نہیں ہوتا۔" میں سکتے میں آگیا "پھر کیا ہوتا ہے؟"

"بیٹے۔" پھوپھی اماں نے سمجھایا "بہت سوال نہیں کیا کرتے۔ یہ دنیا ایک ماجرا ہے۔ اور بہت سے بھید اللہ میاں نے اپنے پاس رکھے ہیں۔ اس کے بھید وہ ہی جانے۔"

"اماں۔" میمونہ بیچ میں بول اٹھی۔ "جان عالم بندر کیوں بن گیا تھا۔" جان عالم کی کہانی پہلے تو پھوپھی اماں ہی نے ہمیں سنائی تھی۔ کتاب میں بعد میں پڑھی۔ ہاں یاد آیا۔ ایک بندر جہاز میں سوار ہو گیا تھا۔ یہ کہانی بھی پھوپھی اماں ہی نے سنائی تھی۔ یا شاید الف لیلہ میں پڑھی ہو۔ بہرحال بندر بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز میں سوار ہو گیا۔ مگر جہاز کہ چلنے کے لئے تیار تھا رک کر کھڑا ہو گیا۔ خرابی کوئی نہیں مگر چلتا نہیں۔ جہاز کے ناخدا کو کچھ شک گزرا۔ اعلان کیا کہ صاحبو، کچھ ماجرا ہے کہ جہاز چل نہیں رہا۔ سو کاغذ قلم آپ کے روبرو ہے۔ یہاں سب اپنا اپنا نام رقم کریں کہ پتہ چلے کہ کون آخر کون ہے۔ سب نے اپنے اپنے نام اس کاغذ پر رقم کئے۔ جب اس بندر کی باری آئی تو اس نے بھی قلم ہاتھ میں پکڑ اپنا نام کاغذ پہ رقم کر دیا۔ جہاز میں شور پڑ گیا کہ بندر خوش رقم ہے۔ کیا حرف لکھے ہیں کہ گویا موتی جڑ دیئے ہیں۔ ایک بزرگ نے معنی خیز نظروں سے بندر کو دیکھا۔ پھر مسفروں کو خبردار کیا۔ "اے عزیزان باتمیز، ہوش کے

ناخن لو اور عقل پکڑو۔ اس بندر کا بندر ہونا کیا ضرور ہے۔ نہ سمجھیں تو یہ ہماری عقل کا فتور ہے۔"

"شنکر، وہ بندر والا تمہیں یاد ہے؟"

"کونسا بندر والا۔"

"ارے بھول گئے۔ ایک ہی تو بندر والا تھا جو پابندی سے روز چوک میں آکر ڈگڈگی بجاتا تھا اور بچے اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے تھے۔"

"ہاں یاد آگیا۔ بندر کے ساتھ رہتے رہتے وہ بھی بندر بن گیا تھا۔ یاد ہے اس کی شکل۔ بالکل منوں لگتا تھا۔"

"اور وہ بندر۔" میں نے کہا "جیسے بندر نہ ہو، بندر والا ہو۔"

بلی کے معاملہ میں کم از کم یہ خرخشہ نہیں ہوتا۔ بلی الگ مٹی سے بنی ہے۔ سو آدمی بلی سے کتنا ہی مانوس ہو جائے اور بلی کسی آدمی سے کتنی بھی ہل جائے، دونوں اپنی اپنی صورت پہ قائم رہتے ہیں۔ باقی بلیوں کی بھی اپنی اپنی لٹک ہوتی ہے۔ شیخ ابو یوسف کی بلی صوفیا کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی اور پچھلے پنجوں پر کھڑے ہو کر ان سے گلے ملتی تھی۔ خیرل بھائی کی صندلی مردم بیزار تھی۔ مہمان کے آنے پر بور ہو جاتی۔ الکساہٹ سے اٹھتی، انگڑائی لیتی اور اندر چلی جاتی۔ ہاں ایک اور بلی یاد آئی۔ کہیں اس کا تذکرہ پڑھا تھا۔ نئے زمانے کی بلی، منہ میں اٹھنی دبائے بس سٹاپ پہ کھڑی تھی۔ بس آئی تو دوسری سواریوں کے ساتھ وہ بھی بس میں چڑھ گئی۔ کنڈیکٹر ٹکٹ کاٹتے کاٹتے اس کے قریب آیا تو اس نے دونوں پنجوں پہ کھڑے ہو کر اٹھنی اس کی ہتھیلی پر رکھی اور ٹکٹ لے کر دانتوں میں دبا لیا۔ اگلے سٹاپ پر جب بس رکی تو وہ وہاں اتر گئی۔ اس کے جانے کے بعد کنڈیکٹر کو خیال آیا کہ اچھا اس بلی نے بھی ٹکٹ خریدا تھا۔ حیران کہ وہ کیسی بلی تھی اور کون تھی۔ مگر بس چل پڑی تھی اور بلی دور نکل گئی تھی۔ مگر پھوپھی اماں کی کہانیوں میں تو سب ہی چرند پرند رینگنے والے اور تیرنے والے بھید بھرے دکھائی پڑتے۔ جیسے ہر جانور ایک معمہ ہو اور ہر چڑیا چونچ میں ایک بھید کا دانہ دبائے اڑتی پھر رہی ہو۔ تو بھیا ہوا یوں کہ اس روز بھی وہ ماہی گیر اپنا جال لے کر ندی پہ پہنچا۔ پر آج اس کے جال میں لے دے کے ایک ہی مچھلی پھنسی اسی ایک مچھلی کو لے کے

چلا بازار کی طرف۔ اے بھیا بازار میں جو وہ پہنچا تو اس مچھلی نے تو ہنسنا شروع کر دیا۔ بزاری حریان کہ لو بھلا دیکھو مچھلی ہنس رہی ہے۔

"پھوپھی اماں، مچھلی ہنس رہی تھی؟"

"ہاں بیٹا۔"

"کیوں ہنس رہی تھی۔"

"بیٹا دم تو لو۔ اس میں بھی اک بھید تھا۔ آگے چل کے کھلے گا۔ تو وہ مچھلی ہنس رہی تھی اور لوگ حریان و پریشان کہ اللہ خیر کرے، مچھلی ہنس رہی ہے۔"

دنیا ان کہانیوں میں کتنی بھید بھری دکھائی پڑتی تھی۔ مگر کہانیوں پہ کیا موقوف تھا ان دنوں تو اردگرد کی دنیا میں بھی بھید ہی بھید تھے۔ مندر، بندر، برگد، پیپل، پیپل کی پھننگ پہ بیٹھا نیل کنٹھ، زمین پہ لہرکھاتا سرسراتا سانپ، سب بھید، کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کون کیا ہے۔ کون اپنی جون میں ہے۔ کون جون بدل کے کچھ سے کچھ بن گیا ہے۔ جیسے سب روپ نقلی ہوں اور سب ہی نے بہروپ بھر رکھا ہو۔ اوپر سے جنموں کا چکر۔ آگے جو ہنس ہنسنی تھے اب راجہ رانی ہیں۔ اور اب جو راجکماری ہے آگے وہ---------- اس شام زمانے بعد حویلی کی اس قدیم کا رنگ لئے خاموش فضا میں میمونہ کے ساتھ بیٹھے بیٹھے ذہن جانے کیسے اس طرف جانکلا۔ "میمونہ" تمہیں وہ سادھو یاد ہے جو کہتا تھا کہ مجھے اپنا پچھلا جنم یاد ہے۔"

"کونسا سادھو۔" یہ کہتے کہتے سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی "ہاں یاد ہے، مگر تمہیں اس وقت بیٹھے بیٹھے کہاں سے یہ خیال آگیا۔"

"اسی پہ تو میں حیران ہو رہا ہوں---------- عجیب بات ہے۔ کب کب کی بھولی بسری باتیں یاد آرہی ہیں۔ جیسے------------ بس جیسے مجھے بھی اپنا پچھلا جنم----------"

میمونہ نے مجھے غور سے دیکھا۔ پتہ نہیں اس کی نظروں میں کیا تھا کہ میں بات بھی پوری نہ کرسکا۔ فقرہ بیچ کا بیچ ہی میں رہ گیا۔ بس چپ ہو گیا۔ پھر کتنی دیر تک وہ بھی چپ، میں بھی چپ۔ مگر وہ سادھو میرے تصور میں گھوم رہا تھا۔ اردگرد لوگ اکٹھے ہیں۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد۔ بیچ میں وہ اپنی سفید جٹاؤں کے ساتھ، آنکھیں

مونڈے، ہاتھ باندھے، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا۔ بھانت بھانت کی بولی۔ طرح طرح کے سوال۔

"مہاراج، یہ کب کی بات ہے۔"

"بھنو، یہ شتابدیوں پہلے کی بات ہے۔ اس سمے میں دوارکا میں باس کرتا تھا۔ شبھ سمے تھا۔ دوارکا میں بن برستا تھا۔ روز بھور بھئے بھگوان جی کے درشن ہوتے۔ رتھ بادلوں کے سمان، جیسے ابھی ابھی آکاش سے اترا ہو۔ اس میں جتے دودھیا گھوڑے مانو دو اجلی بدلیاں ہنہناتے تو سارا وایو منڈل گونج اٹھتا۔ آگے پیچھے اپسرائیں، دھرتی سے انبر تک انہد کا راگ رچا بسا۔ اور پریم سنگیت---------- ٹرٹرٹرٹر۔ ٹیلی فون کی بھنگم آواز بے وقت کی راگنی۔ میں کہاں پہنچا ہوا تھا۔ اور ایک دم سے ----------

بس جیسے آدمی ایک کیفیت میں ڈوبا ہوا بلندی پہ چڑھ رہا ہو اور ایک دم سے پاؤں رپٹے اور پھسل کر نیچے آرہے۔ کتنی بری لگی وہ آواز اس وقت۔ ویسے اچھی کب لگی تھی۔ نئے زمانے کی بھنگم آوازوں میں ایک یہ آواز بھی ہے۔ جس نے اپنے بیڈ روم میں ٹیلی فون رکھ لیا سمجھو کہ اس نے اپنے لئے پراگندگی کا انتظام کر لیا۔ مگر اس سے مفر بھی تو نہیں۔ مجھ پر اس وقت یہ آواز کتنی گراں گزری تھی۔ مگر مجھے فون سننا پڑا۔ جس رو میں بہہ رہا تھا وہ تتر بتر ہو چکی تھی۔ اب میں اپنے پراگندہ زمانے میں تھا اور ریسیور کو کان سے لگائے ایک پریشان آواز سن رہا تھا۔

"بھئی میں نے تو صبح ہی فون کر کے بتا دیا تھا کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آ نہیں سکوں گا۔"

"مگر سر یہاں ایک کرائسس پیدا ہو گیا ہے۔ آپ کا آنا بہت ضروری ہے۔"

"کرائسس؟---------- کیسا کرائسس؟"

"سر، ہمارے ساتھ والے بینک میں ڈکیتی کی واردات ہو گئی ہے۔ چار مسلح آدمی ڈھاٹے باندھے آئے۔ گن مین کو انہوں نے پہلے ہی ہلہ میں ٹھنڈا کر دیا۔ اندر داخل ہو کر منیجر کو رسیوں سے باندھا۔ دوسروں کو پستول دکھا کر خوفزدہ کیا اور پستول کی نوک پر کیشیئر سے سارا کیش لے کر فرار ہو گئے۔"

"اچھا؟---------- یہ تو بہت بری خبر ہے۔"

"تو سر اس وقت دفتر میں کرائسس ہے۔"

"مگر یہ تو اس بینک کا مسئلہ ہے۔ ہمارے یہاں کرائسس کس خوشی میں۔"

"بس جی، سٹاف ہڑتال کے موڈ میں ہے۔"

"اچھا۔ مگر اس وقت یاں گاڑی نہیں ہے۔"

"سر جمال دین یاں سے چل چکا ہے۔ پہنچنے والا ہو گا۔"

اور واقعی چند ہی منٹوں میں ہارن کی آواز آئی۔ جمال دین پہنچ چکا تھا۔ میں نے الٹے سیدھے کپڑے پہنے اور نکل کھڑا ہوا۔

وہاں تو واقعی کرائسس کا نقشہ تھا۔ سارے سٹاف کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ چپراسی سے لے کر کیشیئر تک وہ جو اجازت لے کر میرے کمرے میں داخل ہوتے تھے اور سر سر کہہ کر بات کرتے تھے دھمکیوں سے لبریز لہجہ میں بول رہے تھے۔ "بینک ہم سے کام دبا کر لیتا ہے۔ مگر اس نے ہماری سیکیورٹی کا کیا انتظام کیا ہے۔"

"ایک گن مین سے اس زمانے میں کیا بنتا ہے۔ انہوں نے آتے ہی پہلے اسے سنکھوا لیا۔ اس کے بعد میدان صاف تھا۔"

"پھر کتنے گن مین ہونے چاہئیں کہ ہماری سیکیورٹی کی ضمانت بن سکیں۔" میں نے سوال کیا۔

اس سوال کا کسی کے پاس کوئی واضح جواب نہیں تھا۔

"مگر برادر" میں نے کہا "زیادہ گن مینوں کو اپنے اوپر مسلط کر لینا، یہ بھی تو کوئی عاقبت اندیشی نہیں ہے۔ زیادہ گن مین ہوں تو وہ خود خطرہ بن جاتے ہیں۔"

مگر ایسی فضا میں منطق نہیں چلتی۔ یونین کا اجلاس ہو چکا تھا جس میں بہت مطالبے کیے گئے تھے اور بہت نعرے لگے تھے۔ اور پھر انہوں نے بتایا کہ "سر، کل بینک بند رہے گا۔"

"بینک بند رہے گا۔ وہ کس خوشی میں۔"

"کل صبح گن مین کی میت اٹھے گی۔ یونین نے فیصلہ کیا ہے کہ بینک میں ہڑتال کی جائے۔ جنازے میں ہمیں شریک ہونا ہے۔"

سمجھانے بجھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نہ استدلال کا۔ ایسے وقت میں کون سنتا

ہے اور کون قائل ہوتا ہے۔ باہر مجمع اکٹھا ہوگیا تھا اور نعرے لگ رہے تھے۔ جلتے ٹائروں کا دھواں اور نعروں کا شور اندر تک آرہا تھا۔

(15)

"میاں، ہم مرنا چاہتے ہیں۔"

"ارے مرزا صاحب، یہ کیسا کلمہ آپ منہ سے نکالتے ہیں۔"

"اے مجو بھیا، انہیں سمجھاؤ۔" اچھی بی کہنے لگیں "آج کل انہیں یہی رٹ لگی ہے۔ ہم مرنا چاہتے ہیں، ہم مرنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھاتی ہوں کہ کیوں ایسا بد شگنی کا کلمہ منہ سے نکالتے ہو۔ مگر سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ مت جو ماری گئی ہے۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہ ہم مرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں میاں بہت جی لئے۔ آخر عاقبت کی بوریاں تو نہیں ڈھونی ہیں۔ اب ہمیں مرجانا چاہئے۔"

"مگر کیوں، قبلہ۔"

"میاں بات یہ ہے کہ اب ہمارا اٹھ جانا ہی اچھا ہے۔ نہ ہوں گے نہ دیکھیں گے۔" رکے۔ پھر بولے "مجو میاں، تمہاری عمر ہم سے کم ہے۔ تمہیں وہ زمانہ شاید زیادہ یاد نہ ہو۔ مگر ہمیں تو ایک ایک بات یاد ہے۔ جب میں نے یاں آکر اپنے دفتر کا چارج لیا تو عجب بے سرو سامانی کا نقشہ تھا۔ سٹاف والے کہنے لگے کہ نہ کاغذ ہیں، نہ پنسل، نہ قلم، کام کیسے شروع کریں۔ میں نے انہیں دلاسا دیا کہ بھائی ذرا دم لو۔ سب ہو جائے گا۔ دوسرے دن اپنی جیب سے تھوڑی سٹیشنری خریدی۔ پھر وہ دفتر چالو ہوا۔ آج اس دفتر کی عمارت آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ ہم کسی کو بتائیں تو کون یقین

کرے گا۔ مگر میاں تم تو اس کے گواہ ہو۔"

"صحیح فرمایا آپ نے۔ یہی نقشہ تھا۔ شروع میں تو حالات ہی ایسے ہی تھے۔"

"تو مجو میاں، ہم نے اس نگر کو بستے دیکھا ہے۔" رکے۔ پھر بولے "مجو میاں، ہماری دلی بھی بہت شاد آباد بستی تھی۔"

"اے مجو بھیا، اس کی تو میں بھی گواہی دوں گی۔ ایسی اِی جمی تھی کہ بس کیا بتاؤں۔"

"میاں، اکیلی جامع مسجد کی سیڑھیاں ایسی تھیں کہ وہاں کا ایک چکر لگالو اور عالم کی سیر کرلو۔ اس سے آگے چاوڑی تھی۔ بالا خانوں پہ یہاں سے وہاں تک چاند کے ٹکڑے۔ مگر خیر چاوڑی تو ہمارے جوان ہوتے ہوتے ہی اجڑ گئی تھی۔"

"بھیا بس اچانک سب کچھ بدل گیا۔ ایسی پٹکی پڑی، ایسی پٹکی پڑی کہ بھرے گھر اجڑ گئے۔ مگر میں نے کیا کہا تھا کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے بندی بائیس خواجہ کی چوکھٹ نہیں چھوڑے گی۔ پوچھ لوان سے، میں نے تو زمین پکڑلی تھی۔"

"ہاں تم نے تو زمین پکڑلی تھی۔ مگر زمین نے تو تمہیں نہیں پکڑا تھا۔" کہتے کہتے مجو بھائی سے مخاطب ہوئے۔ "مجو میاں، زمین کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ اجازت دیتی ہے تو اس طرح کہ دم کے دم میں نکال باہر کرتی ہے۔ اجازت نہ دینے پہ آئے تو گڑگڑاتے رہو منتیں کرتے رہو مجال ہے کہ ٹس سے مس، ہو جائے۔ کس بزرگ کے ملفوظات میں، میں نے پڑھا تھا، یاد نہیں۔ حافظہ بھی تو اب جواب دے رہا ہے۔ خیر واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ میں حوض شمسی پہ بیٹھا تھا۔ قریب ہی کوئی مجذوب بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔ بار بار ٹھنڈا سانس بھرتا اور کہتا کہ میں نے جب اس شہر میں قدم رکھا تھا تو سونا تھا۔ اب چاندی بن چکا ہوں۔ چندے اور یہاں رہا تو جانے کیا بن جاؤں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا کہ اے شخص، تو اس شہر میں اپنی مرضی سے رہتا ہے۔ کہا کہ نہیں، میں نے کہا کہ پھر اگر اس شہر سے تو ناخوش ہے تو یہاں سے نکل کیوں نہیں جاتا۔ تب اس مجذوب نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ کہا کہ میں نے مرشد کے حضور جاکر شہر سے اپنی ناخوشی کا ذکر کیا تھا۔ مرشد نے پوچھا کہ کیا تو لشکر گاہ میں رہتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں۔ تب انہوں نے فرمایا کہ اس شہر میں نہ اب امن ہے نہ

آئندہ ہو گا۔ مگر ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ تو اگر نکل سکتا ہے تو نکل جا۔ میں خوش خوش اپنی کوٹھری میں آیا۔ اپنی گدڑی سمیٹ بغل میں دابی اور چلا شہر سے باہر۔ مگر شہر سے قدم باہر نکالنے لگا تھا کہ زمین نے قدم پکڑ لئے۔ میں نے کہا، کیا کرتی ہے۔ میں نے مرشد سے شہر چھوڑنے کی اجازت لے لی ہے۔ بولی، میرے پاس حکم نہیں پہنچا ہے۔ میں تجھے کیسے اجازت دے دوں۔ پھر اگلے دن اسی طور گدڑی بغل میں داب اپنی کوٹھری سے نکلا۔ مگر پھر یہی ہوا کہ زمین نے قدم پکڑ لئے کہ ابھی حکم نہیں آیا ہے۔ اجازت کیسے دے دوں۔ اے بزرگ، پچھلے پچیس سال سے یہی ہو رہا ہے، میں روز صبحدم گدڑی بغل میں داب کوٹھری سے نکلتا ہوں۔ شہر کے کنارے تک جاتا ہوں۔ مگر زمین قدم پکڑ لیتی ہے۔ کہتی ہے کہ ابھی حکم نہیں آیا ہے۔ اجازت کیسے دے دوں۔ یہ سنا کر مجذوب نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولا، پتہ نہیں کب حکم آئے گا اور کب مجھے زمین شہر چھوڑنے کی اجازت دے گی۔ میں نے جب اس شہر میں قدم رکھا تھا تو سونا تھا۔ اب اتنے عرصے میں چاندی بن چکا ہوں۔ چندے اور یہاں رہا تو جانے کیا بن جاؤں۔" مرزا صاحب سنا کر چپ ہو گئے۔ پھر افسردگی سے بولے "پتہ نہیں زیادہ بدنصیب کون تھا۔ وہ جسے زمین نے نکلنے کی اجازت نہیں دی یا وہ جسے اس رنگ سے اجازت دی کہ وہ چشم زدن میں بے گھر بے در ہو گیا۔"

"اے بھیا، ہماری سنو۔" اچھی بی بولیں "سوئیوں والے محلہ میں کھم کی طرح گڑے بیٹھے تھے اور اچانک ایسے اکھڑے کہ نہ گھر رہا نہ در رہا۔"

مرزا صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے "ہاں بھائی، بس یہ سمجھو کہ زمین اچانک تنگ ہو گئی۔ اس وقت ابا حضور کا یہ فرمانا یاد آیا کہ بیٹے جب دیکھو کہ زمین تنگ ہو رہی ہے تو دامن جھاڑ کے کھڑے ہو جاؤ۔ سمجھ لو کہ وہاں کا پانی اب تمہارے لئے نہیں ہے۔ تو دلی کی زمین نے بہت نہال کیا۔ ہماری پشتوں کو سنگھوائے رکھا۔ مگر اب ہماری طرف سے اس کی آنکھ پہ میل آگیا تھا۔ سو ہم نے اسے سلام کیا کہ فقیروں نے تیرے دامن میں بہت ڈیرا کیا اب تجھے ہماری صحبت ناگوار ہے تو ڈیرا اٹھاتے ہیں اور چلتے ہیں۔ سو پھر ہم نے اس دیار کا رخ کیا۔"

"ارے بھیا، ہم نے سوچا تھا کہ اپنے ماریں گے تو چھاؤں میں تو ڈالیں گے۔۔

کیا خبر تھی کہ اپنے غیر بن جائیں گے۔ ارے یاں پہ تو کنبہ والوں نے بھی ایسی آنکھیں پھیری ہیں کہ کوئی کٹی انگلی پہ آ کے نہ موتے۔ بھلا پوچھو، ہمیں کسی سے کیا لینا ہے۔ ارے، ہم تو وہ تھے کہ چار کو کھلا کے منہ میں نوالا رکھتے تھے اللہ سے توبہ کرکے کہتی ہوں کہ یاں پہ بھی ہم نے دیا ہی ہے، کسی سے لیا نہیں ہے۔ مگر یاں لوگ طوطا چشم ہو گئے ہیں اور غیروں کی کیا شکایت کریں۔ ہمارے لئے تو ہماری بہو ہی غیر بن گئی۔"

"پھر تم نے دلہن صاحب کا ذکر نکال لیا۔ جانے بھی دو سعادت کی ماں"۔

"جانے کیسے دوں۔ جب سے میرا پوت مجھ سے چھٹا ہے مجھے کسی کل چین نہیں ملتا۔ مجو بھیا اور اے بھیا جواد، تم دونوں انصاف کرو۔ اس ہفت رنگن نے ایسا میرے پوت کو شیشے میں اتارا کہ اس نے ہمیں تو یاں گولیوں کی بوچھار میں چھوڑا اور خود اسے لے کے کلفٹن میں جا کے بس گیا۔"

"نیک بخت، اس نے تو کہا تھا کہ اس علاقہ کو چھوڑو۔ یہ تو حجرۂ ہفت بلا ہے۔ کلفٹن میں ہمارے ساتھ چل کر رہو۔ ہم ہی نے معذرت کرلی کہ بیٹے اب تم خاندان والے بن گئے ہو۔ اطمینان سے الگ بسر کرو۔ ہم جہاں ہیں وہاں ہمیں رہنے دو۔"

"مجھے خوب پتہ ہے کہ اس نے کس طرح کہا تھا۔ اے بھیا، کچھ مت پوچھو، میری بہو ایک حرافہ ہے۔ اندر ہی اندر سے ایسی جڑ کاٹتی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ اوپر سے میٹھی، اندر سے بس کی گانٹھ۔"

"مرزا صاحب، یاں رہنے کا ایک فائدہ تو ہے مشاعرے یاں پہ بہت ہوتے ہیں۔ آج آپ چل رہے ہیں نا۔"

"نہیں میاں۔"

"کیوں قبلہ۔"

"میاں استاد سائل دہلوی اور استاد بیخود دہلوی تک مشاعروں میں رونق تھی۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد اب مشاعروں میں کیا رہ گیا ہے۔ یہ تمہارے نئے شاعر کیا اول جلول بکتے ہیں، ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں۔"

مجو بھائی نے شاید مشاعرے کا ذکر جان کر چھیڑا تھا۔ وہاں سے اٹھنے کے لئے کوئی بہانہ تو پیدا کرنا تھا۔ وہاں سے نکل کر چلے ہم رفیق صاحب کی طرف۔ اصل میں مرزا

صاحب تو رستے میں پڑتے تھے اس لئے مجو بھائی نے کہ سیدھی راہ چلنے کے کبھی قایل نہ ہوئے۔ سوچا کہ یاں بھی جھانکتے چلو۔ ویسے ان کا پروگرام یہ تھا کہ پہلے رفیق صاحب سے ملاقات کی جائے۔ تھوڑی گپ بازی ہو اور پھر انہیں لے کر مشاعرے میں جایا جائے۔ رفیق صاحب ہمیں دیکھ کر کھل اٹھے۔

"یار، تم لوگ زندہ ہو۔" رفیق صاحب ہم دونوں کو دیکھ کر کتنے خوش ہوئے۔ "تمہارے علاقے سے تو بہت تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں۔ سنا ہے کہ بہت گولی چلی ہے۔"

"گولی کم چلی۔ ٹائر زیادہ جلے۔" مجو بھائی بولے "ویسے جتنی بھی گولی چلی ہو، تمہارے علاقے سے تو کم ہی چلی ہے۔"

"ہمارے علاقے سے تم لوگ کیا کھا کے مقابلہ کرو گے۔ اس نے تو ریکارڈ قائم کیا ہے۔"

"تو پھر جب تم گولیوں کی بوچھار میں زندہ رہ سکتے ہو، تو ہم نہیں رہ سکتے۔" مجو بھائی نے جواب دیا۔

"بھئی ہمارا تو یہ روزمرہ ہے۔ ہمیں اس بیچ زندہ رہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ تو ہماری بات مت کرو۔ خیر یہ بتاؤ کہ آج ادھر ورودِ مسعود کس خوشی میں ہوا۔"

"یار کیا بتائیں۔" مجو بھائی نے بیزاری سے کہا "کافی ہاؤس کے زمانے کو میں فراموش کر چکا ہوں۔ مگر وہ زمانہ اپنا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس زمانے میں کچھ لڈے ہوا کرتے تھے جو شاعری کی ٹانگ توڑتے رہتے تھے۔ ہم نے اس وقت سوچا کہ چلو داد کے دو لفظ کہہ دینے میں کیا بگڑتا ہے۔ مگر کیا زمانہ آیا ہے کہ اب وہ شہر میں معتبر شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ آج یہاں ان کے چیلے چانٹوں کی طرف سے کوئی مشاعرہ وشاعرہ ہے۔ اتنا اصرار کیا تو ہم نے سوچا کہ چلو جھانک آئیں۔ لگے ہاتھوں رفیق صاحب سے بھی مل لیں گے۔ اس وقت جواد کی گاڑی بھی میسر تھی۔"

رفیق صاحب نے قہقہہ لگایا "تو مشاعرہ آپ کو یہاں کھینچ لایا ہے۔" رکے۔ پھر بولے "مجو بھائی، میری اور آپ کی تو مجبوری ہے۔ یہ لوگ آپ کے گزرے وقتوں کے چیلے چانٹے ہیں۔ میرا محلہ داری کا معاملہ ہے۔ مجھے اس لئے جانے پڑے گا۔ مگر

بیچارے جواد صاحب نے کیا قصور کیا ہے۔ انہیں آپ کس جرم کی سزا دے رہے ہیں۔" اور فوراً ہی مجھ سے مخاطب ہوئے "جواد صاحب، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ آپ مشاعرہ سنیں گے۔"

"کوئی لازم نہیں ہے۔" میں نے کہا "مقصود تو مجو بھائی کو ان کی منزل تک پہنچانا تھا اور پھر آپ سے بھی تو ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔"

"خوب۔ گویا ایک پنتھ دو کاج۔"

"یار رفیق صاحب۔" مجو بھائی بولے "جواد کو کچھ سمجھاؤ۔"

"کیوں، کیا ہوا۔"

"مجھے اس شخص نے پریشان کر رکھا ہے۔ ہر پھر کر وہی ایک سوال، مجو بھائی، اس شہر میں کیا ہو رہا ہے؟"

رفیق صاحب نے ایک قہقہہ لگایا "خوب۔ مگر یہ بھی تو پتہ چلنا چاہئے کہ آپ نے کیا جواب دیا۔"

"میرے پاس تو ایک ہی جواب ہے کہ پیارے سوچنا چھوڑ دو، یا پھر یہ شہر چھوڑ دو۔"

رفیق صاحب نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ پھر بولے "کوئی ضرورت نہیں ہے شہر چھوڑنے کی۔ اس شہر میں رہنے کے لئے بس تھوڑے سے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ وہ سلیقہ اگر آپ میں ہے تو پھر آپ کے لئے کوئی جوکھوں نہیں ہے۔"

"یار، وہ گر ہمیں بھی بتاؤ۔" مجو بھائی بولے۔

"مثلاً میں نے اپنی بیگم سے کہہ رکھا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ ہم دونوں جب ساتھ نکلتے ہیں تو کار بیگم ہی چلاتی ہیں۔ تو میں نے بیگم صاحبہ سے کہہ رکھا ہے کہ جب کوئی کلاشنکوف والا گاڑی روکنے کو کہے تو فوراً گاڑی روکو اور قبل اس کے کہ وہ کوئی اور بات کرے، گاڑی کی چابیاں اس کے حوالے کردو۔ ادھر میں ذہنی طور پر تیار رہتا ہوں کہ ادھر گاڑی کی چابیاں اس کے حوالے کی جائیں ادھر میں اپنا پرس جیب سے نکال کر اس کو نذر کردوں۔"

مجو بھائی ہنسے "سبحان اللہ زندہ رہنے کا کیا نسخہ دریافت کیا ہے۔"

"ہنسنے کی بات نہیں ہے مجو بھائی، بتایئے اس کے بعد وہ کوئی بات کرنے جو گا رہے گا اور میں اس طریقہ کو آزما چکا ہوں۔"

"اچھا۔ واقعی؟"

"واقعی۔ یہ ابھی پچھلے ہی مہینے کی تو بات ہے۔ دو مسٹنڈے آن نازل ہوئے۔ ہماری بیگم صاحبہ تو حواس باختہ ہو گئیں۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں۔ چابیاں دے دو۔ چابیاں ان کے حوالے کیں۔ اور فوراً ہی میں نے اپنا پرس جیب سے نکال کر ان کو پکڑا دیا۔ پرس انہوں نے لینے کو تو لے لیا۔ مگر پھر دوسرے نے جو ٹولی کا سرغنہ لگتا تھا پوچھا۔ ٹیکسی کا کرایہ جیب میں ہے۔ میں نے کہا کہ برادر عزیز، کوئی بات نہیں۔ ہم پیدل چلے جائیں گے۔ وہ بولا، نہیں پیدل کیسے جاؤ گے۔ اور پرس لینے والے کو ہدایت کی، جوان، ان کے حساب میں سے پچاس روپے انہیں دے دو۔ تو اس جوان نے پرس سے ایک پچاس کا نوٹ نکال کر پھرتی سے مجھے پکڑایا اور گاڑی میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔ شرافت میں نے برتی تھی۔ انہوں نے بھی شرافت برتی۔ پچاس روپے دے دیئے کہ ہم پیدل چلنے کی زحمت سے بچ جائیں۔ ان میں سے بھی دس بچ گئے۔"

"خوب۔" مجو بھائی بولے۔

"اپنی بھابی کو دیکھو۔ پوچھتی ہیں کہ تھے کون لوگ یہ۔ رپورٹ درج کراؤ۔ میں نے کہا بیگم جانے دو۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ اور مت پوچھو کہ کون لوگ تھے۔ مجھے تو لکھنؤ کے بانکے لگ رہے تھے۔ بس وہ ہنستے سے اکھڑ گئیں۔ میں نے کہا کہ ارے یہ تو گھر ہی میں ایتھنک فساد برپا ہو گیا۔ فوراً اپنا بیان واپس لے لیا۔"

مجو بھائی نے اب کسی قدر سنجیدگی سے کہا "رفیق صاحب، مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ آخر ہم اس صورت حال میں اور کیا کر سکتے ہیں۔ سمجھداری اسی میں ہے کہ اکڑی ہوئی گردن جھکا لو اور چوں وچرا کے بغیر جو آپ کے پاس ہے اسے حوالے کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤ۔ آگے ان کی مرضی ہے۔ اگر کسی گولی پر واقعی آپ کا نام لکھا ہوا ہے تو پھر اس سے تو مفر نہیں ہے۔ کیا سمجھے میاں جواد، یہ ہے اس شہر میں جینے کا فلسفہ۔"

"جی سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کسی قدر بے مزہ ہو کر کہا۔

"نہیں جواد صاحب، آپ نہیں سمجھ رہے۔" رفیق صاحب کا لہجہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "ہماری بیگم صاحبہ کا بھی یہی خیال ہے۔ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں اور وہ نہیں سمجھتیں۔ آخر ایک دن زچ ہو کر میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ بیگم حضرت یہ آپ کا لکھنؤ نہیں ہے۔ یہ کراچی ہے کراچی۔ چڑ کر کہنے لگیں کہ کراچی ہے تو ہم کیا کریں۔ میں نے کہا کہ وہی کرو جو آپ کا محاورہ کہتا ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔"

رفیق صاحب جاری تھے کہ بیگم رفیق گھبرائی ہوئی آئیں۔ "کیا بیٹھے باتیں ملا رہے ہو۔ کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ باہر پھر وہ کمبخت ماری گولیاں چلنی شروع ہو گئی ہیں۔"

"یہ کوئی نئی خبر لائی ہو۔ یہ تو یہاں کا روزمرہ ہے۔ میں سمجھا کہ کوئی نئی پریشانی آن ٹوٹی۔"

"ہاں ہمارے لئے تو یہ نئی بات نہیں ہے۔ ہم تو جہنم میں رہتے ہیں۔ ہمارے مقدر میں تو یہی لکھا ہے۔ مگر یہ جو ہمارے دو شریف مہمان آئے بیٹھے ہیں میں ان کے خیال سے پریشان ہو رہی ہوں۔"

"بیگم۔ تم سمجھ رہی ہو کہ یہ کہیں جنت سے آ رہے ہیں۔ یہ بھی جہنم ہی سے چل کر آ رہے ہیں۔ اتنا ہی تو فرق پڑا ہے کہ اپنے جہنم کو چھوڑ کر ہمارے جہنم میں آج انہوں نے قدم رنجہ فرمایا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر بیچارے اگر یاں پھنس گئے تو پھر کیا ہو گا۔"

"کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ تمہیں صرف چائے سے تواضع کرنی ہے۔ کھانے کا اہتمام مشاعرے والوں نے کر رکھا ہے۔"

"مشاعرہ؟" بیگم رفیق نے کچھ تعجب کچھ غصے سے کہا "یہ کون بخت مارے ہیں۔ گولیوں کی اس بوچھاڑ میں مشاعرہ کریں گے۔"

رفیق صاحب اپنی طرف سے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس واقعہ سے وہ بالکل پریشان نہیں ہیں اور یہ کہ مہمانوں کو بھی پریشان ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ مگر میں اپنی پریشانی کو نہیں چھپا پا رہا تھا۔ میں تو اصل میں سوچ کر گھر سے نکلا تھا کہ مجو بھائی کو

وہاں اتار دوں گا، رفیق صاحب سے تھوڑی گپ شپ کروں گا اور مشاعرے سے پہلے پہلے کھسک لوں گا۔ اب مجھے لگ رہا تھا کہ میں تو پھنس گیا۔ رفیق صاحب نے میری پریشانی کو تاڑ لیا۔ بولے "ارے جواد صاحب، آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ یہ تو یہاں کا روٹین ہے۔ دو ہی اس کوچے کے جوانوں کے مشغلے ہیں، فائرنگ اور مشاعرہ۔ اور آج وہ لمبی فائرنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ آخر انہیں مشاعرے میں بھی تو جانا ہے۔"

"بھئی کمال ہے رفیق صاحب. آپ کا۔" مجو بھائی بولے۔ "دو آگوں کے درمیان کس اطمینان سے رہ رہے ہیں آپ۔"

رفیق صاحب ہنسے اور بولے "ویسے یہ دوسری آگ جس کا نام شعرائے کرام ہے، زیادہ ظالم ہے۔ مجو بھائی، آپ یقین کیجئے، کسی کل چین نہیں لینے دیتے۔ مشاعرے کو طرح دے بھی جاؤں تو پھر آتے جاتے گھیرتے ہیں۔ جان ضیق میں ہے۔ محلہ میں جس پر جو نئی غزل وارد ہوتی ہے اس کا وبال مجھ پر پڑتا ہے۔ اور میری مجبوری دیکھئے کہ ہر غزل کے ہر شعر پر داد دینی پڑتی ہے۔"

"یار، تم واقعی نرغے میں ہو۔" مجو بھائی نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

رفیق صاحب نے لمبا قہقہہ لگایا۔ بولے "مجو بھائی تم اپنے حساب سے کہہ رہے ہو کہ میں نرغے میں ہوں۔ ہمارے لاہوری عزیز نے اپنے حساب سے کہا تھا کہ پاجی، تم نرغے میں ہو۔ یاں سے نکلو۔ بیگم صاحبہ یہی بات اپنے حساب سے کہتی ہیں۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ بیگم حضرت، تم تو لکھنؤ والی ہو۔ تمہیں یہ گل و بلبل والی شاعری کیا گزند پہنچا سکتی ہے۔ میرے دل سے پوچھو کہ مجھ پر کیا گزرتی ہے۔ مگر جاؤں کہاں۔ بولیں اتنا بڑا شہر پڑا ہے۔ کرائے ہی پر رہنا ہے تو کہیں بھی جا کر رہ سکتے ہیں۔ اور گلشن میں تو تمہارے دوست اچھا بھلا فلیٹ دلوا رہے تھے۔ میں نے کہا، مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ جہاں ہم جا کر رہیں گے وہاں یہاں سے زیادہ شاعر نہیں ہوں گے اور زیادہ بری غزلوں پر داد نہیں دینی پڑے گی۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" مجو بھائی بولے "اس شہر میں کسی بھی علاقہ کے بارے میں کوئی آدمی یہ ضمانت تو نہیں دے سکتا۔"

"مجو بھائی میں واقعی نرغے میں ہوں۔ آپ کو پتہ ہے کہ ہماری اس گلی میں کتنے شاعر ہیں۔ بس سمجھ لو کہ آپ جن دکانوں سے گزرے ہیں ان میں سے ہر دکاندار اور ہر اس کا گاہک شاعر ہے اور آمد کا اتنا زور ہے کہ سودا تولتے تولتے غزل ہو جاتی ہے۔ میں چھپ کر گلی سے نکلتا ہوں۔ پھر بھی گلی سے نکلتے نکلتے دس بارہ غزلیں زہر مار کر لیتا ہوں۔ ادھر گھر سے قدم باہر نکالا اور ادھر کسی شاعر نے آن دبوچا۔ اس کے چنگل سے نکلے تو کسی اگلے نے آن گھیرا۔ بس جیسے تاک میں بیٹھے ہوں۔"

"مگر باہر نکلنا کیا ضرور ہے۔ تمہیں کونسا نوکری پہ جانا ہوتا ہے۔"

"یہ کر کے بھی دیکھ لیا۔ گھر پہ آن دھمکتے ہیں۔ رفیق بھائی، کئی دنوں سے آپ کے دیدار نہیں ہوئے۔ دشمنوں کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے۔ اور اس کے فوراً بعد نئی غزل کا مژدہ۔ مجو بھائی قطار لگ جاتی ہے۔ کوئی نگینوی، کوئی پیلی بھیتی، کوئی کمنڈوی، کوئی خورجوی، کس کس نگر کا شاعر اس کوچے میں جمع ہے۔ سب ہی کو سننا پڑتا ہے۔ محلہ داری کا معاملہ جو ہوا۔"

"اماں ہمارے بھائی بندوں کے بیچ رہو گے تو یہ قیمت تو ادا کرنی پڑے گی۔"

"ویسے میں نے ایسا علاقہ تلاش کر لیا تھا جہاں تمہارے بھائی لوگ کم ہوں۔ اچھا مکان تھا۔ آس پاس سب لاہوریئے تھے۔ مگر ان کے ساتھ دوسری مصیبت تھی۔ اس کوچے میں ہر لاہوریا میرا جی بنا بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ وہ مضمون ہوتا تھا کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ میں نے سوچا میرا جی کے چیلوں سے تو حضرت داغ کی امت ہی غنیمت ہے۔ کم از کم زبان کا چٹخارہ تو ہے۔ اور سمجھ میں تو آتا ہے کہ کیا مضمون باندھا گیا ہے۔"

"بھائی بات یہ ہے۔" مجو بھائی بولے "بھیڑ جہاں جائے گی مونڈی جائے گی۔ تم ہو شریف آدمی، سو بھائی صبر کرو۔"

"ارے صاحب، میں نے تو صبر کر لیا ہے۔ مگر یار لوگ مجھے احساس دلاتے رہتے ہیں۔ ایک کرمفرما کی سنو۔ انہوں نے اس علاقے کی دوسری ہی خرابی ہم پر جتائی۔ کہنے لگے، رفیق صاحب مجھے سن گن ملی ہے کہ آپ کے پچھواڑے میں کوئی عقوبت خانہ ہے۔ میں چپ رہا۔ بولے، آپ نے جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ جواب

کیا دیتا۔ ارے صاحب، پچھواڑے میں عقوبت خانہ نہ ہوتا تو قحبہ خانہ ہوتا۔ قحبہ خانہ نہ ہوتا تو تھانہ ہوتا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو ہوتا۔ کہنے لگے، مگر ہمسائیگی میں عقوبت خانے کا ہونا تو بہت خطرناک بات ہے اور تکلیف دہ بھی۔ اذیت بھری چیخیں جو سنائی دیتی ہوں گی وہ آپ کو پریشان نہیں کرتیں۔ میں نے کہا کہ میرے بھائی، سیاسی نعروں کے شور سے زیادہ اذیت ناک تو کوئی شور نہیں ہوتا۔ ہم نے جب اس شور کو سہنا سیکھ لیا تو عقوبت خانے سے آتی چیخیں کیا معنی رکھتی ہیں۔"

مجھے بے چینی ہو رہی تھی کہ رفیق صاحب واضح طور پر کچھ نہیں بتا رہے۔ دلگی میں بات کو گول کر رہے ہیں۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔ "رفیق صاحب، کیا واقعی آپ کے پچھواڑے کوئی عقوبت خانہ ہے۔"

رفیق صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "جواد صاحب، ہم آپ اتنے بڑے عقوبت خانے میں سانس لے رہے ہیں۔ اب اڑوس پڑوس میں کوئی چھوٹا موٹا عقوبت خانہ ہے بھی تو اس کی کتنی اہمیت ہو سکتی ہے۔ تو چھوڑیئے اس بات کو۔"

اتنے میں لڑکا چائے کی ٹرولی لے کر آ گیا۔ رفیق صاحب نے ٹرولی اپنی طرف سرکائی اور چائے بناتے ہوئے لڑکے سے مخاطب ہوئے "اے دینا، فائرنگ بند ہوئی یا نہیں ہوئی۔"

"پتہ نہیں جی۔" پھر جاتے جاتے بولا "دیکھ آؤں جی۔"

"ہاں دیکھ کے آ اور مجھے بتا۔"

دینا میں جیسے نئی حرارت پیدا ہو گئی ہو۔ کس پھرتی سے دروازے کی طرف لپکا اور باہر نکل گیا۔

چائے پیتے پیتے میں نے پھر زبان کھولی "رفیق صاحب، ایک بات پوچھوں۔"

"پوچھو۔"

"بہت ذاتی سا سوال ہے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔"

"دیکھیں نا یہ ستمگر شہر میری اور مجو بھائی کی تو مجبوری ہے۔ مگر آپ کا تو لاہور میں جدی ٹھکانہ موجود ہے۔ تو آپ کی کیا مجبوری ہے۔"

"بھائی، میری مجبوری میری لکھنوی بیوی ہے۔" یہ کہہ کر ہنسے۔

"ٹھیک کہا۔" مجو بھائی نے ٹکڑا لگایا۔ "دنیا میں بیوی سے بڑی کونسی مجبوری ہو سکتی ہے۔"

رفیق صاحب نے کس خوبصورتی سے سوال کو ٹالا اور پھر کس اطمینان سے چائے پینے لگے۔

تھوڑی دیر میں دینا بھی واپس آن پہنچا۔

"ہاں کیا خبر لایا۔"

"بند ہو گئی جی۔ ویسے جی بہت بجی۔ دھے فائر پہ فائر۔"

"کتنے مرے؟"

"پانچ مرے جی۔"

"اچھا صرف پانچ۔ گولیاں تو اتنی چلی تھیں۔ یہ لوگ گولیاں بہت ضائع کرتے ہیں۔ بہرحال مجو بھائی، آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب مطلع صاف ہے۔"

"جواد کو سناؤ۔ جواد سن رہے ہو، مطلع اب صاف ہے۔"

"مگر کتنی دیر کے لئے۔" بیساختہ میرے منہ سے نکلا۔

رفیق صاحب ہنسے "اچھا کہا۔"

مجو بھائی بولے "ویسے یہ بھی تو پتہ کراؤ کہ مشاعرہ کتنی دیر میں شروع ہو رہا ہے۔"

مشاعرے کے حوالے نے مجھے تھوڑا بے چین کیا۔ آخر میں نے زبان کھولی "دیکھئے صاحب، مشاعرہ آپ دونوں کی تو مجبوری ہے۔ رفیق صاحب کا محلہ داری کا معاملہ ہے۔ گولیوں کا مینہ برسے، یا بم پھٹے انہیں بہرحال مشاعرے میں جانا ہے۔ اور مجو بھائی کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کافی ہاؤس کے زمانے میں شاعری کا طوطا پالا تھا۔ کمبل کو وہ بیشک چھوڑ دیں مگر کمبل انہیں نہیں چھوڑے گا۔ مگر میری تو کوئی مجبوری نہیں ہے۔"

"میاں تمہاری بھی ایک مجبوری ہے۔" مجو بھائی بولے "اور وہ یہ ہے کہ اس وقت تم اس کوچے سے سلامت نہیں نکل سکتے۔ غزل یا گولی۔ انتخاب تمہارے ہاتھ میں

ہے۔"

"مشاعرے میں غزلیں سننے سے گولی کھانا بہر حال بہتر ہے۔"

"میاں سوچ لو۔"

"سوچ لیا ہے۔"

"پھر اللہ کے حوالے۔"

"مگر پھر آپ واپس کیسے جائیں گے۔"

"اس کی فکر مت کرو۔ اسی کافی ہاؤس والے کراؤڈ سے کسی نہ کسی کو یہ فریضہ انجام دینا ہو گا۔ اور آخر ہم داد دیں گے تو اس کی قیمت بھی تو وصول کریں گے۔"

میں اٹھنے لگا تو رفیق صاحب بھی مجھے رخصت کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے "جواد صاحب، مجو بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ اس بارے میں زیادہ سوچا دوچا نہ کریں۔ دیکھئے ہمارے سوچنے پریشان ہونے سے فرق کیا پڑے گا۔ ہمارے اختیار میں ہے کیا۔"

اتنے میں بیگم رفیق بھی آگئیں۔ تعجب سے مجھے دیکھا "ارے آپ جا رہے ہیں۔"

"جی۔"

"خدا کا خوف کریں۔ کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔"

"فائرنگ بند ہو گئی ہے۔"

"ارے ان کمبختوں کا کوئی اعتبار ہے۔"

"بھابی، اعتبار تو اس زمانے میں کسی کا بھی نہیں ہے۔ مگر کاروبار حیات کو اس باعث معطل تو نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو کیا جانا بہت ضروری ہے۔"

"جی ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"اچھا تو پھر ذرا چوکنے رہئے۔ اور دیکھئے گھر پہنچتے ہی ہمیں خیریت کا فون کر دیجئے۔"

"ہاں۔" رفیق صاحب نے تائیدی لہجہ میں کہا "فون ضرور کر دیجئے۔ ویسے تو

انشاء اللہ خیریت ہی رہے گی۔"

رفیق صاحب اور ساتھ میں مجو بھائی بھی مجھے رخصت کرنے دروازے تک آئے جہاں سامنے ہی گاڑی کھڑی تھی اور جمال دین اندر سکڑا سہا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے جھرجھری لی اور مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ مگر دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی مجھے ایک ڈراؤنے سناٹے کا احساس ہوا۔ جیسے اب یہ وہ گلی نہ ہو وہ شاد آباد گلی جو ہمارے آتے وقت تھی۔ اس وقت یہاں کتنی چہل پہل تھی۔ آتی جاتی سواریوں کا شور۔ دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھی ہوئی ٹولیوں کے قہقہے، آوازے، گزرتے لوگوں کی گہما گہمی۔ گاہکوں دکانداروں کا مول تول بھاؤ تاؤ۔ اب کچھ بھی نہیں تھا۔ دکانیں بند، راہگیر غائب، جیسے یہ رات کا پچھلا پہر ہو۔ دور ایک دکان ضرور کھلی نظر آ رہی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ معاملہ خراب ہے۔ مگر میں جانے کی نیت سے باہر نکل آیا تھا اور اندر کے خوف کو ظاہر کرنے میں مجھے اپنی ہیٹی نظر آتی۔ خیر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ یہ نقشہ آخر رفیق صاحب اور مجو بھائی کے سامنے بھی تو تھا۔

"یار۔" مجو بھائی نے تشویش سے کہا "رفیق صاحب، تمہاری گلی آج اتنی جلدی سو گئی۔"

"ہاں یہی میں دیکھ رہا ہوں۔ میرے خیال میں فائرنگ کے ہنگامہ میں دکانداروں نے دکانیں بند کر دیں۔ اور رات کو دکان بند کر کے جو گھر چلا جائے وہ واپس کیوں آئے گا۔"

"استاد، آثار اچھے نظر نہیں آ رہے۔" اور پھر فوراً ہی مجھ سے مخاطب ہوئے "جواد، میرے خیال میں ٹھہر جاؤ۔ مشاعرے کے بعد اکٹھے ہی چلیں گے۔ اور بھی ساتھ جانے والے ہوں گے۔ اس وقت اکیلے جانا مناسب نہیں۔"

"کمال ہے مجو بھائی، آپ تو اکیلے جانے سے ایسے منع کر رہے ہیں جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔" میں نے حوصلہ دکھاتے ہوئے کہا۔

"ویسے جواد صاحب" رفیق صاحب نے ٹکڑا لگایا۔ "کبھی کبھار اگر مشاعرے کا ذائقہ چکھ لیا جائے تو مضائقہ کیا ہے۔ مشاعرے کی بھی آخر اپنی ایک افادیت ہے ہی بالخصوص اس زمانے میں جس سے ہم گزر رہے ہیں۔"

"اچھا؟ وہ کیا افادیت ہے۔ ذرا سمجھائیے تو سہی۔"

"اس وقت جو حالات ہیں ان کا اگر ہمارے پاس کوئی توڑ ہے تو بس مشاعرہ ہے۔ جس نکتہ کو یارانِ دمشق نہیں پاسکے تھے اُسے اپنے کراچی والوں نے پالیا ہے۔"

"سبحان اللہ" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"رفیق صاحب کسے سمجھا رہے ہو۔" مجو بھائی بولے "یہ شخص مشاعرے سے بلکہ شاعری ہی سے ایسے بدکتا ہے جیسے گائے قصائی سے بدکتی ہے۔"

"مہاجروں میں یہ اپنی قسم کی واحد مثال ہیں۔" رفیق صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"تمہیں دو ایسے مہاجروں کی تلاش تھی نا۔ ایک تو ہم نے فراہم کردیا۔"

"دوسرا کہاں سے لاؤں۔"

"دوسرا بھی مل جائے گا۔ جوئندہ یابندہ۔"

"میں نے جلدی سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا "اچھا میں چلا۔"

"ہاں بھئی گھر پہنچ کے فون کر دینا۔" یہ کہتے کہتے رفیق صاحب جمال دین سے مخاطب ہوئے۔ "ڈرائیور صاحب، ذرا ہوشیاری سے یہاں سے گزرنا۔ اور ہاں شیشے چڑھالیں۔"

"آپ فکر نہ کریں جی۔" یہ کہتے کہتے جمال دین نے گاڑی سٹارٹ کی اور تیزی سے اس گلی سے نکلا۔

مگر وہ 'ایک گلی تھوڑا ہی تھی۔ گلیوں کا ایک پورا جال تھا۔ ویسے یہ بھی احساس مجھے اس وقت ہوا تھا، ورنہ ہمیشہ میں نے رفیق صاحب کے گھر کو ایسے تصور کیا تھا کہ مین روڈ پر بڑے پٹرول پمپ کے سامنے جا کر دائیں کو مڑیں گے، پھر ایک موڑ چھوڑ کر دوسرے موڑ پر بائیں کو مڑ جائیں گے۔ اس کے بعد پھر بائیں کو اور تھوڑا چل کر دائیں کو۔ لیجئے رفیق صاحب کا گھر آگیا۔ مگر اس وقت یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ چند گلیاں نہیں، گلیوں کا ایک پورا جال ہے۔ اور جیسے گاڑی جال کے اندر پھنس گئی ہو اور ایک گلی سے دوسری میں، دوسری سے تیسری میں، پھر گلی اور پھر گلی۔ کوئی کوئی دکان کھلی ہوئی۔ اس حساب سے وہاں کچھ زیادہ روشنی اور ساتھ ہی آدمی کی صورت دکھائی

دیتی۔ دکاندار اکیلا بیٹھا ہوا یا کسی کسی پر اکا دکا گاہک، مگر جیسے ڈرے ہوئے ہوں۔ دبی دبی آوازوں میں بولتے ہوئے۔

"جمال دین، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اطمینان سے چلاؤ۔" گاڑی کی تیز رفتاری نے مجھ بولنے کا موقعہ فراہم کر دیا تھا۔ اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے خوف پر بول کر قابو پایا جا سکتا ہے۔

"نہیں جی، گھبرانے کی کیا بات ہے۔" رک کر بولا "صاحب جی، مجھے تو روز ہی ایسے گزرنا پڑتا ہے۔ ایسے گھبرانے لگوں تو کر چکا ڈرائیوری۔"

"ظاہر ہے تمہیں تو اپنی ڈیوٹی انجام دینی ہوتی ہے حالات جیسے بھی ہوں۔ ان علاقوں سے بھی گزرنا ہوتا ہے جہاں آئے دن گولیاں چلتی ہیں۔ ڈرائیوری بھی اس زمانے میں خطرناک کام بن گیا ہے۔"

"صاحب جی، موت اور زندگی تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ پھر آدمی فکر کیوں کرے۔" اور جمال دین نے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔

(16)

میں اگلے دن دفتر قدرے دیر سے پہنچا۔ رفیق صاحب پہلے سے آئے بیٹھے تھے۔ میں حیران کہ رفیق صاحب کس خوشی میں صبح ہی صبح آن پہنچے۔ فوراً ہی خیال آیا کہ بینک کا کوئی کام ہوگا۔ مجھے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسے۔ "آپ زندہ ہیں؟ شکر ہے۔ آپ تو دفتر بروقت پہنچنے والوں میں سے ہیں یہاں آیا اور آپ کو نہ دیکھا تو مجھے واقعی فکر ہوگئی تھی۔"

"ہاں، آج نکلتے نکلتے دیر ہوگئی۔ آپ دیر سے آئے بیٹھے ہیں؟ معافی چاہتا ہوں۔"

"نہیں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ تشویش اس پر تھی کہ حضرت کہاں رہ گئے۔ خیر۔ شکر ہے۔"

"شکر تو بندے کو ہر حال میں کرنا چاہئے۔ مگر مجھے اس وقت شکر کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"آپ کو زندہ دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں۔" رفیق صاحب پھر کھلکھلا کر ہنسے۔

"گویا آپ نے یہ طے کر لیا تھا کہ میں سدھار گیا۔ مگر سدھارنے کے لئے کوئی بہانہ بھی تو ہونا چاہئے۔ میرے پاس کونسا بہانہ تھا۔"

"بھائی، ہمارے علاقے میں آکر جو شخص اپنی زندگی سلامت لے کر واپس چلا

جائے وہ بہت خوش قسمت آدمی سمجھا جاتا ہے تو آپ خوش قسمت آدمی ہیں۔"

"خوب۔"

"بس مٹھائی منگوالیں۔ اچھا چھوڑیں صرف چائے منگوالیں۔"

میں نے فوراً ہی چپراسی کو بلا کر چائے لانے کے لئے کہا۔ پھر اس نیت سے کہ رفیق صاحب اس موضوع سے کسی طور ہٹیں ان سے پوچھا "رفیق صاحب، آپ تو سویرے گھر سے نکلا نہیں کرتے۔ اور کیوں نکلیں، آپ کو کونسا دفتر جانا ہوتا ہے۔ آج کس خوشی میں سویرے سویرے گھر سے نکلے، اگرچہ مجھے خوش ہونا چاہئے کہ آپ نے مجھے نوازا ہے۔"

"ارے بھائی، آپ کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔"

"واقعی؟"

"لیجئے، ہمارے خلوص کا آپ کو یقین نہیں آ رہا۔" پھر لہجہ بدلا۔ کسی قدر سنجیدہ لہجہ میں کہنے لگے "جواد صاحب، میں واقعی آپ سے شرمندہ ہوں۔ معافی مانگنے آیا تھا۔"

"کس بات پر؟" میں نے حیران ہو کر رفیق صاحب کو دیکھا۔

"بات یہ ہے کہ آپ کے جانے کے بعد میری بیگم نے میری بہت خبر لی۔ کہتی تھیں کہ آپ عجب آدمی ہیں اور اچھے دوست ہیں کہ دوست کو ایسے خطرے میں اکیلے جانے دیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں نے روکا تو تھا۔ مگر جواد صاحب کو مشاعرہ زیادہ بڑا خطرہ نظر آ رہا تھا۔ اب وہ نہیں رکے تو میں کیا کرتا۔ مگر میری دلیل میری بیگم کو قائل نہ کر سکی۔ ان کے کہنے سننے سے مجھے بھی احساس ہوا کہ یہ کام ذرا غلط ہو گیا۔ مجھے آپ کو کسی نہ کسی طور روک لینا چاہئے تھا۔ صبح ہی صبح بیگم نے کہا کہ فون کر کے خیریت معلوم کرو۔ میں نے کہا کہ نہیں، میں بینک جا کر خیریت بھی معلوم کروں گا اور اپنی خطا کی معافی بھی مانگوں گا۔"

"ارے رفیق صاحب، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ معافی مانگنے کی اس میں کونسی بات ہے۔ اور وہاں کونسا بڑا خطرہ تھا۔ میں تو بہت آرام سے آیا۔ بس ذرا سناٹا نظر آ رہا تھا۔ باقی تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔"

"لگتا یہی ہے کہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آدمی ادھر یہ سوچتا رہ جاتا ہے، ادھر بہت کچھ ہو جاتا ہے۔" رفیق صاحب رکے۔ پھر بولے "جواد صاحب، آپ میرے یا مجو بھائی کے لہجہ سے یہ نہ سمجھیں کہ ہمیں خطرے کا احساس نہیں ہے۔ ہمیں شاید آپ سے زیادہ ہی احساس ہو۔ کم از کم میں تو بہت خوفزدہ رہتا ہوں۔ لیکن خوف کو چھپانا پڑتا ہے۔ کیسے نہ چھپاؤں۔ میری بیگم پہلے ہی ڈری سہمی رہتی ہے۔ اگر اسے پتہ چل جائے کہ میں بھی ڈرا ہوا ہوں تو وہ تو بالکل ڈھیر ہو جائے گی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"میں اس روز عقوبت خانے کی بات کر رہا تھا نا؟"

"ہاں، پھر؟"

"محلہ میں اڑتی اڑتی یہ جھوٹی سچی خبر اس نیک بخت کے کانوں تک پہنچ گئی۔ میں نے بہت ٹالا کہ بیگم آج کل سو طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ اس طرح ہم نے ان پر کان دھرا تو زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ مگر اچانک رات کو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اجی کیا سو گئے۔ سن رہے ہو، میں سوتے سے جاگ اٹھا۔ کیوں کیا بات ہے؟ بولی کسی کی چیخوں کی آواز آ رہی ہے۔ میں دیر تک کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا رہا۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ بیگم تمہارا وہم تھا۔ اے لو، میرا وہم تھا۔ ایسی تو چیخ کی آواز آئی تھی۔ پھر ایک رات کیا ہوا۔ سوتے سوتے اٹھ بیٹھی۔ بولی کہ سن رہے ہو میں نے کہا، کیا ہوا۔ بولی بلی رو رہی ہے۔ تو پھر کیا ہوا، میں نے کہا۔ اے لو، کچھ ہوا ہی نہیں، بلی کا رونا کوئی اچھی بات ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ اصل میں وہ بلے کو پکار رہی ہے۔ مگر توبہ کیجئے۔ ایک تو یار، یہ تم لوگ جو ادھر سے آئے ہو توہمات کی گٹھریاں باندھ کر اپنے ساتھ لائے ہو۔"

میں ہنس دیا "گویا یہاں لوگ توہمات سے بری تھے۔"

"یہاں بھی تھے توہمات، مگر اس رنگ سے نہیں کہ پتہ بھی کھڑکے تو ایک افسانہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک بیان تو روز ہی مجھے سننا پڑتا ہے۔ اللہ خیر کرے، آج صبح سے میری دائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ اور جواد صاحب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بیگم ہی کی آنکھ کیوں پھڑکتی ہے۔ کبھی تو میری آنکھ کو بھی پھڑکنا چاہئے۔ قدرت سارے

اشارے میری بیگم ہی کو کرتی ہے۔ مجھے وہ اس لائق نہیں سمجھتی۔"

میں کیا جواب دیتا۔ ہنس کر چپ ہو گیا۔

"یار، تم ہنس رہے ہو۔ ہم لوگ بہت مشکل میں ہیں۔ اور پھر جس علاقے میں ہم رہتے ہیں، بس کچھ مت پوچھو۔"

"ہاں واقعی اس علاقے میں رہنا بہت ہمت کا کام ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ آپ یہاں کس طرح رہتے ہیں۔"

"بس پوچھو مت۔ روز آزمائش سے گزرتے ہیں۔ سخت احتیاط برتنی پڑتی ہے ورنہ اب تک تو اپنا کام ہو چکا ہوتا۔"

"ہاں نقشہ تو یہاں کا کچھ اسی طرح کا ہے۔"

"مرنا تو یہاں کا معمول ہے۔ زندہ بچے رہنا البتہ ایک معجزہ ہے۔" رکے۔ پھر بولے "معجزہ اپنی جگہ، احتیاط بہرحال لازم ہے۔ ویسے معجزے بھی احتیاط ہی کے رہین منت ہوتے ہیں۔ اب جواد صاحب، یہ جو آپ کا بینک ہے یہ بھی تو بہت خطرناک جگہ ہے۔ جو بینک میں بیٹھا ہے وہ سب سے زیادہ خطرے میں ہے۔ آپ نے ایک بندوق بردار گیٹ پہ کھڑا کر دیا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے۔ بھائی سیکیورٹی کا کوئی معقول بندوبست کرو۔"

"رفیق صاحب، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم کتنا بندوبست کر سکتے ہیں۔ دو گارڈ اور کھڑے کر دیئے جائیں، پھر بھی کیا فرق پڑے گا۔ وہ مخلوق جس طرح لیس ہو کر آتی ہے اور جس طرح نازل ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں ہمارے حفاظتی انتظامات کیا معنی رکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر بساط بھر تو احتیاط برتنی ہی چاہئے۔ آگے جو اللہ کو منظور۔"

رفیق صاحب کے اس وقت کے موڈ کو دیکھ کر مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے وہی سوال جسے مجو بھائی نے کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا ان سے کر ڈالا۔ مجو بھائی کے پاس تو نپا تلا جواب ہے کہ سوچنا چھوڑ دو یا پھر کراچی چھوڑ دو۔"

رفیق صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ بس اسی کے ساتھ ان کا اپنا معمول کا لہجہ واپس آ گیا۔ "کراچی کیوں، پھر تو پاکستان چھوڑنا پڑے گا۔" رکے۔ پھر اسی طرح

ہنستے ہوئے بولے "میں کوئی جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ مجو بھائی سمجھتے ہیں کہ سوچنے والے کے لئے مصیبت خالی کراچی میں ہے۔ سبحان اللہ۔ اس روز آپ پوچھ رہے تھے کہ کراچی آپ کی مجبوری کیوں ہے جبکہ لاہور میں آپ کا جدی ٹھکانہ موجود ہے۔ اور آپ ایسے کہہ رہے تھے جیسے لاہور پاکستان میں نہ ہو۔ پاکستان سے باہر-----------"

اس گھڑی اپنے مرزا صاحب، بر میں شیروانی ہاتھ میں چھڑی، آن وارد ہوئے۔

"اخاہ رفیق صاحب بھی موجود ہیں۔ چپڑی اور دو دو۔"

رفیق صاحب نے بھی اسی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ کھڑے ہو کر بغل گیر ہوئے۔

"مرزا صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے۔"

"عزیز، مزاج کا احوال کیا پوچھتے ہو۔ کمبخت پاؤں میں بیڑی ایسی پڑی ہے کہ اس سے نکلنے کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی۔"

"کیسی بیڑی، مرزا صاحب۔"

"زندگی کی بیڑی۔ اور کونسی بیڑی۔ میاں، ہم مرنا چاہتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں مرزا صاحب آپ، ہم آپ کو مرنے نہیں دیں گے۔"

"یہی تو مشکل ہے۔" مرزا صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا "مرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ پتہ نہیں کاتب تقدیر نے ہمارے نوشتے میں کیا لکھا ہے۔ فی الحال نہ زندوں میں ہیں نہ مردوں میں۔ میاں کل پرسوں کی بات ہے، میں جواد میاں سے یہی شکوہ کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ آگے اللہ کے نیک بندے کس طرح نیت باندھ کر اس دنیا سے سدھارتے تھے۔ حضرت ابوالبدر قدس سرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ شہر میں ایک قتل ہو گیا تو آپ نے گریہ فرمایا اور کہا کہ دنیا میں ظلم بڑھ گیا ہے، اب مر جانا چاہئے۔ ساتھ ہی شیخ جلیل الحقی کو پیغام بھجوایا کہ شیخ غسل کر لے۔ شیخ نے جواب بھجوایا کہ پاک ہوں۔ غسل کی حاجت نہیں رکھتا۔ آپ نے پھر پیغام بھجوایا کہ شیخ غسل کر لے۔ شیخ نے پھر وہی جواب کہلا بھیجا۔ تب آپ نے پیغام بھجوایا کہ جو ہم کہتے ہیں وہ کر کہ تجھے جو فریضہ ادا کرنا ہے ادا کر سکے۔ تب شیخ نے ہدایت پر عمل کرتے ہوئے غسل فرمایا۔ ابھی غسل سے فارغ ہوئے تھے کہ فرستادہ آیا اور عرض گزار ہوا کہ حضرت ابوالبدر نے رحلت

فرمائی۔ افسوس اور تعجب سے پوچھا کہ کیونکر، فرستادے نے کہا کہ حضرت نے دعا فرمائی۔ پھر دراز ہو گئے۔ ہدایت فرمائی کہ جلیل سے جا کر کہو کہ آ کر ہمیں غسل دے۔ پھر آنکھیں موند کر ہچکی لی اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ شیخ جلیل الحقی فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت کو غسل دینے لگا تو جناب نے آنکھ کھول کر مجھے دیکھا، مسکرائے اور پھر آنکھیں موند لیں۔ تو میرے عزیز، اللہ کے نیک بندے جب دنیا سے متنفر ہوتے ہیں تو اس طرح جان جان آفرین کے سپرد کرتے ہیں۔ مگر ہم گنہگاروں کا احوال یہ ہے کہ

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

شہر میں اتنی گولی چل رہی ہے ادھر ہم موت کی تمنا لئے بیٹھے ہیں مگر کوئی گولی ہماری طرف نہیں آتی۔"

"بس مرزا صاحب قبلہ اسی سے سمجھ لیجئے کہ قدرت کو یہ منظور نہیں کہ آپ کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ جائے۔" رفیق صاحب پھر مسکرائے۔ ساتھ ہی استفسار کیا "قبلہ، یہ حضرت ابوالبدر کون بزرگ تھے۔"

"ہائے ہائے رفیق صاحب، آپ ان بزرگ کو نہیں جانتے۔ انہیں دنیا میں صرف چڑیوں سے شغف تھا۔ مگر جب چڑیاں بہت تنگ کرتیں تو انہیں مٹھی میں سمیٹتے اور پھنکی مار کر نگل لیتے۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد چڑیوں کو اپنے گرد نہ پا کر آزردہ ہوتے تو پھر چڑیوں کو اگلنا شروع کر دیتے۔ ایک ایک چڑیا حلق سے نکلتی اور پھر سے اڑ جاتی۔ فوراً ہی پھر ان کے گرد اکٹھی ہو جاتیں اور شور کرنے لگتیں۔"

"سبحان اللہ۔" رفیق صاحب نے بیساختہ کہا اور ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میاں جا رہے ہو؟ اتنی جلدی؟"

"میں پہلے سے بیٹھا تھا۔ جواد صاحب مصروف آدمی ہیں، خاصا وقت لیا ان کا۔"

"ارے رفیق صاحب، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اور میں اتنا مصروف نہیں ہوں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ بیٹھئے نا۔"

"نہیں بھئی، اب چلوں گا۔"

"عزیز، یہ ملاقات تشنہ رہی۔ اتنے زمانے بعد ملے اور اتنی مختصر ملاقات۔"

"کسی روز دولت کدے پر حاضری دوں گا۔ پھر مفصل ملاقات ہوگی۔"

"ہاں ہاں میاں ضرور آؤ۔ میاں بس یہ سمجھ لو کہ ہم ٹمٹما رہے ہیں۔ بتی ساری جل چکی ہے۔ تیل ختم ہے۔ بس اب بجھے کہ اب بجھے۔ سو اس سے پہلے کہ بجھ جائیں آؤ اور ملاقات کرلو۔"

"جلدی حاضر ہوں گا۔" یہ کہا۔ ہاتھ ملایا، مرزا صاحب سے، مجھ سے، اور یہ جا وہ جا۔

"اچھے آدمی ہیں رفیق صاحب۔ شریف آدمی فی زمانہ مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔" یہ کہتے کہتے مرزا صاحب نے جیب سے چیک نکالا اور میرے سامنے سرکا دیا۔ "ذرا میاں اس چیک کو دیکھو۔"

کتنے دنوں سے مرزا صاحب کا حساب اسی بینک میں چل رہا تھا۔ میرے یہاں ہوتے ہوئے انہیں اس میں سہولت نظر آتی تھی۔ ان کا پراویڈنٹ فنڈ، گریچویٹی، اور مہینے کے مہینے ملنے والا پنشن کا چیک، سب جمع جتھا یہیں تھی۔ یہیں سے ہر مہینے گھر کے خرچ اخراجات کے لئے رقم نکلواتے تھے۔ پہلے تو بیٹا یہ فریضہ انجام دیتا تھا۔ لیکن اس کے کلفٹن چلے جانے کے بعد سے چیک جمع کرنے اور کیش کرانے کا بوجھ ان پر آن پڑا تھا۔ سو اب وقتاً فوقتاً ان کی صورت نظر آنے لگی تھی۔

"میاں مشکل سے یہاں پہنچا ہوں۔ ٹیکسی والے کو یہاں آنے میں بہت پس و پیش تھا۔"

"اس علاقے میں تو امن و امان ہے۔ ممکن ہے درمیان میں کہیں گڑبڑ ہو۔"

"یہی کہتا تھا وہ۔ اب تو میاں سب رستے مخدوش ہیں۔ کوئی علاقہ محفوظ نہیں ہے۔ اللہ رحم کرے۔" رک کر بولے "آج ہم بیٹھیں گے نہیں۔ جلدی یاں سے نکل جائیں گے۔"

"مرزا صاحب، آپ فکر نہ کریں، میں آپ کو پہنچاؤں گا۔"

"میاں، تم اپنا بینک کا کام کروگے یا مجھے پہنچاؤ گے۔"

"ویسے تو ڈرائیور موجود ہے۔ مگر آج ہاف ڈے ہے۔ مجھے بھی جلدی ہی نکلنا

ہے۔"

سو میں نے مرزا صاحب کا چیک کیش کرایا اور جلدی ہی نکل کھڑا ہوا۔

"جمال دین، رستے میں کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہے۔"

"گڑ بڑ کی ابھی تک تو کوئی خبر نہیں ہے۔ خیری ہے آج تو۔"

"پہلے مرزا صاحب کی طرف چلنا ہے۔"

"جی سر۔"

ادھر اچھی بی پریشان دروازے پہ کھڑی تھیں۔ اوٹ میں سے ہر آتی جاتی ٹیکسی رکشا پر نظر دوڑا رہی تھیں۔ دروازے پہ کار کو رکتے دیکھ کر پہلے حیران ہوئیں۔ پھر مرزا صاحب کو اترتے دیکھا تو اطمینان اور خوشی کی ایک لہر چہرے پہ دوڑ گئی۔

"اجی کہاں رہ گئے تھے۔ میں بولائی بولائی پھر رہی تھی۔ کبھی آنگن میں کبھی ڈیوڑھی پہ۔"

"سعادت کی ماں، میں تمہیں بتا کے گیا تھا کہ بینک جا رہا ہوں۔ وہاں دیر لگے گی۔"

"مگر اتنی دیر۔"

"دیر کہاں ہوئی ہے۔ جواد میاں نے چیک جلدی ہی کیش کرا دیا۔ اور پھر فوراً ہی اپنی گاڑی میں پہنچانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ آئے ہیں۔ ان کی تواضع کرو۔"

"نہیں اچھی بی، آپ بالکل زحمت نہ کریں۔ میں چل رہا ہوں۔"

"اے بیٹا، ایسے تو ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ تم ہوا کے گھوڑے پہ سوار تو نہیں آئے ہو۔ تھوڑا دم لو۔ ابھی چائے بناتی ہوں۔ بیٹے کیا بتاؤں۔ ایک لنگڑا لولا نوکر تھا۔ وہ بھی بھاگ گیا۔ اور بخت مارا بتا کے بھی نہیں گیا۔ بس اچانک غائب ہو گیا۔ موت کے لئے کو میں نے اتنا کھلایا پلایا، کپڑے بنا کے دیئے، مگر آج کل کے نوکر کمبخت وفا کرنا تو جانتے ہی نہیں۔ ارے جب اپنے وفا نہیں کرتے تو پھر نوکروں کی کیا شکایت وہ تو ہوتے ہی غیر ہیں۔

"نوکر اس زمانے میں مشکل سے ملتا ہے۔" میں نے ایک رسمی سی بات کہی۔

اچھی بی نے اس میں سے اپنا مضمون نکال لیا۔

"اے بیٹا مل بھی جائے تو نکلتا نہیں۔ اور نوکروں ہی پہ کیا موقوف ہے، اپنوں پرایوں کا سب کا یہی حال ہے اور ہم غیر کی کیا شکایت کریں، خود ہماری بہو نے جو ہمارے ساتھ طوطا چشمی کی ہے۔ اب تم انصاف کرو میری عمر گھربار سنبھالنے کی تھی۔ عمر گزر گئی کام کرتے کرتے۔ ہڈی سے ہیڑا لگ گیا۔ اب تو یہ وقت تھا کہ میں چھپر کھٹ پہ بیٹھتی۔ بہو گھر سنبھالتی۔ مگر اس نے تو میاں کی تلی اکھیڑ دی۔ الگ رہیں گے۔ الگ رہیں گے۔ لو وہ الگ ہو کے بیٹھ گئی۔"

"سعادت کی ماں جانے دو دلہن صاحب کے ذکر کو۔ اور بات کرو۔ جواد میاں تھوڑی دیر کے لئے آئے ہیں۔ زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتے۔ دن خراب ہیں۔"

"ہاں بیٹا دن تو بہت خراب ہیں۔ میں تو انہیں گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتی۔ آج مجبوری کو گھر سے قدم نکالنے دیا ہے۔"

"مگر سب ہماری طرح نٹھالی تھکے تو نہیں ہیں۔ لوگوں کے کاروبار ہیں، نوکریاں ہیں۔ گھروں سے نکلنا ہی پڑتا ہے۔ اب جیسے ہمارے جواد میاں ہیں۔ کچھ بھی ہو، گولیاں برسیں، بم پھٹیں، انہیں تو اپنے بینک پہنچنا ہی ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اچھی بی سوچ میں پڑ گئیں "اے بیٹا، گھر سے چلتے وقت ایک کام کیا کرو۔ آیتہ الکرسی پڑھ لیا کرو۔ اور دفتر پہنچ کر حصار کھینچ لیا کرو۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو سعادت کی ماں۔ تمہیں آیتہ الکرسی یاد ہے تو سمجھتی ہو کہ سب کو یاد ہوگی۔ کوئی مختصر دعا بتائی ہوتی۔ اور حصار ہے تو بہت اچھی چیز۔ حصار کھینچ لیا جائے تو پھر سمجھ لو کہ بینک محفوظ ہے۔ پھر کسی گارڈ، کسی چوکیدار کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ارے بیٹا، ایک ہی دن میں نے حصار نہیں کھینچا تھا۔ ہونی بات تو ہو کر رہتی ہے۔ اس روز دھیان سے بات اتر گئی۔ سونے سے پہلے روز حصار کھینچتی تھی۔ اس روز بھول گئی۔ اسی روز کلموئے گھر میں آن گھسے۔"

"اللہ کے کلام میں بہت برکت ہے۔" مرزا صاحب کہنے لگے "اب کوئی اللہ کا کلام پڑھے ہی نہیں تو اس میں قصور کس کا ہے۔ ارے میاں، جب ہی تو اس شہر سے

برکت اٹھ گئی۔"

"ارے اس شہر پہ تو اللہ کا عذاب ہے۔" اچھی بی نے ٹکڑا لگایا۔

"عذاب سا عذاب۔" مرزا صاحب نے مضمون کو آگے بڑھایا "ایسا عذاب تو مغضوب قوموں پر بھی نہیں آیا تھا۔" مرزا صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا "ہم کونسے بچے ہوئے ہیں۔ ہم بھی گناہوں کی پوٹ لئے پھرتے ہیں۔ گنہگاروں کے بیچ رہ کر آدمی کس طرح گناہوں سے دور رہ سکتا ہے۔ مگر کیا کریں، کہاں جائیں۔" تامل کیا۔ پھر بولے "میاں میں اس روز سنا رہا تھا اس مجذوب کا قصہ جو مستقل کہتا رہتا تھا کہ، میں جب یہاں آیا تو سونا تھا۔ اب چاندی ہوں۔ کچھ عرصہ اور رہا تو جانے کیا بن جاؤں۔ جواد میاں، یقین جاننا، ہم نے جب اس دیار میں قدم رکھا تھا تو ہم بھی بس سمجھ لو کہ سونا ہی تھے۔ اب چاندی بھی نہیں ہیں۔ کانسی پیتل ہیں۔ نہیں ٹھیکرا ہیں ٹھیکرا"

یہ کہہ کر لمبی چپ سادھ لی۔ اچھی بی بھی چائے لے کر آگئی تھیں۔ پتہ نہیں وہ کس وقت اٹھ کر گئیں اور دم کے دم میں چائے بنا کر لے آئیں۔ چائے ہم نے خاموشی سے پی۔

اچھی بی نے آخر خاموشی توڑی۔ افسردہ آواز میں بولیں "نگوڑی یہ خبر نہیں تھی کہ ہم ٹھیکرا بن جائیں گے۔"

"خبر تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ زمانہ جب بدلنے پہ آتا ہے تو آنا فانا بدلتا ہے۔"

"آنا فانا ہی بدلا۔" اچھی بی نے اسی افسردگی کے ساتھ کہا "پتہ ہی نہیں چلا کہ ہوا کیسے۔ ابھی سونا ابھی ٹھیکرا۔"

"آگے کیا ہوگا، اللہ بہتر جانتا ہے۔"

"ہاں یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" اچھی بی بولیں۔ چپ ہوئیں، پھر تشویش کے لہجہ میں کہنے لگیں "رات کا کوئی منجھلا پہر ہوگا، میری آنکھ کھل گئی کوئی کتا رو رہا تھا۔ میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ پھر صبح تک آنکھ نہیں لگی۔ پتہ نہیں کون کمبخت مارا کتا ہے۔ روز رات کو، بس یہ سمجھو کہ آدھی رات کے آس پاس رونا شروع کر دیتا ہے۔ اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ بلی بخت ماری کو تو میں نے بھگا دیا۔ ایک رات کو بہت رو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ڈائن جا، اپنے جنوں کو کھا۔ اس کے بعد تو ایسی غائب ہوئی کہ

نظر ہی نہیں آئی۔ مگر اس نحوست مارے کتے کا کیا علاج کروں۔"

مرزا صاحب فکر مندانہ لہجہ میں بولے "جانوروں کا رونا کچھ اچھی بات نہیں ہے۔"

"اور خاص طور پر کتوں کا رونا۔" اچھی بی نے ٹکڑا لگایا۔

"اللہ ہمارے حال پہ رحم کرے۔" مرزا صاحب نے یہ کہتے کہتے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئے۔

اچھی بی بھی اب کچھ نہیں بول رہی تھیں۔ آخر میں اٹھ کھڑا ہوا "اچھا مرزا صاحب اب اجازت دیجئے۔"

"اچھا عزیز، تم نے ہمارے لئے بہت زحمت کی۔"

"مرزا صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ تو میرے لئے عین سعادت تھی۔ اور مجھے تو اس وقت اٹھنا ہی تھا۔ تھوڑا گھر پہ کام تھا۔ میں نے سوچا کہ جلدی گھر چلو۔"

"ٹھیک ہے، ہم تمہیں روکیں گے نہیں۔ ویسے بھی حتی الامکان جلدی ہی گھر لوٹنا چاہئے۔ یہ دن اچھے نہیں ہیں۔"

"مرزا صاحب، دن کب اچھے تھے۔" میں نے یونہی بے دھیانی میں ایک فقرہ لڑھکا دیا۔"

"ہاں بھائی یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔ اچھے دن ہمارے بزرگوں نے دیکھے تھے۔ ہماری قسمت میں اچھے دن تھے ہی نہیں۔ خیر جو اللہ کو منظور۔ اس کی مشیت میں کس کو دخل ہے۔"

وہاں سے نکل کر میں سیدھا گھر پہنچا۔ مجو بھائی گھر پہ موجود نہیں تھے۔

نعمت خاں نے کہا "کھانا تیار ہے جی۔ لگاؤں؟"

"اور مجو بھائی۔ وہ تو ابھی آئے ہی نہیں ہیں۔"

"وہ تو جی چلتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ دوپہر کو کھانے کے لئے میرا انتظار مت کرنا۔"

"اچھا تو پھر کھانا لگاؤ۔"

نعمت خاں نے جھٹ پٹ کھانا لگا دیا۔ میں بھی کھا کر جلدی ہی فارغ ہو گیا۔ اسی دم

ایک پھریری سی آئی کہ یہ کیا بات ہوئی کہ بینک میں بند بیٹھے تھے۔ وہاں سے نکلے تو گھر میں آکر بند ہو گئے۔ آج بینک سے جلدی فراغت ہو گئی ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ بس فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ پیدل نکل پڑنے کی ٹھانی۔ جمال دین کو رخصت کرنے لگا تھا کہ یاد آیا کہ آج تو مجو بھائی نے شام کو کہیں چلنے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔

"اچھا جمال دین، تم اس وقت تو چلے جاؤ۔ شام کو چھ ساڑھے چھ بجے تک آ جانا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے جی۔"

کتنے زمانے کے بعد پیدل گھر سے نکلا تھا۔ کتنا لطف آ رہا تھا پیدل چلنے میں۔ اور اب مجھے احساس ہوا کہ موٹر کی سواری تو ایک قید خانہ ہے۔

تانگہ اکہ میں کم از کم بند ہونے کا تو احساس نہیں ہوتا۔ موٹر میں تو آدمی بند ہو کر بیٹھتا ہے۔ باہر سے رابطہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ شیشوں کے پیچھے سے تیزی سے گزرتے ہوئے جتنا کچھ نظر آ سکتا ہے اتنا چکھ لو۔ پیدل چلنے کا اپنا لطف ہے۔ پیدل چلتے ہوئے ایک تو زمین سے براہ راست ایک رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ پھر ارد گرد کی دنیا زیادہ پھیلی ہوئی، زیادہ کشادہ نظر آتی ہے۔ مجھے اپنا وہ زمانہ یاد آیا جب سواری کے نام کار تو کجا سائیکل بھی اپنے پاس نہیں تھی۔ بس کی سواری یا پھر اپنی دو ٹانگوں کی سواری۔ کتنا پیدل چلتا تھا ان دنوں۔ زمین کا گز بنا ہوا تھا۔ کتنی خاک چھانی تھی ان دنوں۔ بینک کی ملازمت نے پیادہ پائی کے ذائقہ سے محروم کر دیا۔ شروع میں سکوٹر، پھر ترقی کے ساتھ موٹر کی سواری میسر آئی اور سواری بھی اس طرح کہ ڈرائیور چلا رہا ہے، خود آنکھیں موندے پیر پھیلائے پچھلی نشست پہ بیٹھے ہیں۔ قدموں کی راہ جو زمین سے زندہ رشتہ ایک زمانے تک قائم رہا وہ یکسر ختم۔

جاڑوں کی موسم ہو اور دھوپ نکلی ہوئی ہو، ایسے میں پیدل چلنے کا لطف دو چند

ہو جاتا ہے۔ بہت دنوں کے بعد ایسی نرم گرم روشن دوپہر مجھے پیدل چلنے کے لئے میسر آئی تھی۔ عجب آزادی کا سا احساس ہو رہا تھا کہ اپنی رو میں جس طرف چاہوں نکل جاؤں، جہاں چاہوں رک جاؤں۔ موٹر میں سوار ہونے کی صورت میں تو آدمی کو بندھے تلے انداز میں چلنا پڑتا ہے۔ بیچ میں رکنا پڑ جائے تو اس کے لئے بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اور نہیں تو پارکنگ ہی کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں اس وقت یہ عالم تھا کہ کوئی روک ٹوک ہی نہیں تھی۔ پارک کے برابر سے گزرا تو دھوپ میں پھیلے ہوئے سبزہ زار نے جیسے اشارہ کیا ہو، قدم خود ہی اس طرف مڑ گئے۔ اور میں پہلے بینچ پر بیٹھا۔ مگر پھر جلدی ہی اس نشست سے اکتا کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ قریب ہی ایک نوجوان جوڑا بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ مگر وہ ایک دوسرے میں اتنے مگن تھے اور اتنے ڈوبے ہوئے کہ نہ انہیں دھوپ کا احساس تھا اور نہ یہ احساس کہ ان سے تھوڑے فاصلہ پر ایک اجنبی بیٹھا ہے اور شاید انہیں دیکھ بھی رہا ہو۔ مگر میں جلد ہی اس جوڑے سے بے تعلق ہو گیا۔ کمسن لڑکوں کی ایک پارٹی نے بیچ سبزہ زار میں وکٹ کھڑے کر کے کرکٹ کھیلنی شروع کر دی تھی۔ پھر میری ساری توجہ ان کے کھیل پر مرکوز ہو گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گیند بٹ کے اثر سے تیزی سے لڑھکتی ہوئی میری طرف آتی۔ میرے قریب آ جاتی تو اس سے پہلے کہ فیلڈنگ کرنے والا کوئی کھلاڑی میری طرف آئے میں خود ہی گیند اٹھا کر ان کی طرف پھینک دیتا۔ اور ادھر سے آواز آتی۔ "تھینک یو انکل۔"

"تھینک یو انکل" کی تکرار سے میرے اندر سرور پیدا ہوتا چلا گیا۔ میں نے بال پھینکنے میں اب زیادہ سرگرمی دکھانی شروع کر دی تھی۔ بلکہ اب مجھ سے تھوڑے فاصلہ پر بھی گیند آ کر گرتی تو میں جا کر اسے اٹھاتا اور بالر کی طرف لڑھکا دیتا۔ مگر سرور میں کھنڈت پڑ گئی۔ آؤٹ ہونے نہ ہونے کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ کھیل رک گیا اور بحث یہ شروع ہو گئی کہ رن بن گیا یا کھلاڑی رن آؤٹ ہو گیا۔ جب اس پر تکرار ہونے لگی تو میں نے سوچا کہ میں دونوں پارٹیوں میں تصفیہ کرا دوں۔ مگر میری منصفی کی پیش کش سے پہلے ہی وہ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

میں نے انہیں لڑتا چھوڑا اور پارک سے نکل آیا۔ ویسے بھی اب دھوپ جا رہی تھی۔ نوجوان جوڑا بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جب میں گیٹ سے نکل رہا تھا تو ان کا سکوٹر

تیزی سے میرے برابر سے گزرا۔ لڑکی نے نوجوان کی کمر میں ہاتھ حمائل کر رکھے تھے۔ ہوا سے اس کے بال اڑ رہے تھے۔ جب تک سکوٹر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا میری نظریں سکوٹر کا تعاقب کرتی رہیں۔

میں اب چائے خانوں کے برابر سے گزر رہا تھا۔ یہ پورا فٹ پاتھ ہی چائے خانوں کی زد میں تھا۔ یہاں سے وہاں تک میزیں بچھی تھیں۔ کوئی میز خالی نہیں تھی ورنہ شاید میں بیٹھ ہی جاتا۔ فٹ پاتھ پر پڑی میز پر بیٹھ کر چائے پینے کا اپنا مزہ ہے۔ کسی بڑے ہوٹل میں چھت تلے کسی مزین ہال میں بیٹھ کر چائے پینے کے لئے تو بہت تکلف کرنا پڑتا ہے۔ یہاں صورت یہ ہے کہ اہلے گہلے پھرتے پھراتے آئے اور بے تکلفی سے کسی میز پر آکر جم گئے۔ چائے پینے والے یہاں اس وقت اس قدر تھے کہ کوئی میز خالی نظر ہی نہیں آئی کہ میں اس پر قبضہ جماتا۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو اچھا ہی ہے۔ ایک دفعہ بیٹھ گئے تو بیٹھ ہی جاؤ گے۔ اور چلنے کی لذت سے محروم ہو جاؤ گے۔ تو بس چلتے رہو۔ واپسی میں دیکھیں گے۔ اس وقت شاید کوئی میز خالی مل جائے۔ سو میں آگے بڑھ لیا۔

فٹ پاتھوں پر ایک رش پیدل چلنے والوں کا، دوسرا رش چائے پینے والوں کا، بوتلیں پینے والوں کا، سگریٹ پان خریدنے والوں کا۔ اور تیسرا رش اس ٹریفک کا جو برابر میں رواں دواں تھی۔ یہ رش سب سے بڑھ کر تھا۔ ہاں اور اس سے ذرا آگے شادی گھروں کی ایک قطار جگمگ جگمگ کرتی نظر آ رہی تھی۔ شام ہو چلی تھی اور شادی گھروں پر لدے پھندے رنگ برنگے قمقمے جگمگا اٹھے تھے۔ اس سارے ہنگامے کو دیکھ کر میں تھوڑا حیران ہوا۔ تھوڑا نہیں بہت حیران ہوا۔ میں نے دل میں کہا کہ کہاں دہشت گردی ہے، کہاں گولی چل رہی ہے۔ ہم لوگ اپنے گھروں اور دفتروں میں بیٹھے ڈرتے رہتے ہیں، شہر کے اندیشے میں دبلے ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تو زندگی اپنی پوری آب و تاب سے رواں دواں ہے۔

پہلے میں حیران ہوا۔ پھر اطمینان کا سانس لیا اور میرے قدم اب زیادہ اعتماد سے اور زیادہ تیزی سے اٹھنے لگے۔ چلتے چلتے میرے کان کھڑے ہوئے۔ کہیں قریب ہی سے ایک شور سنائی دے رہا تھا۔ بیچ بیچ میں نعرے، نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر، یاالٰہی یہ کیسا شور ہے۔ کوئی احتجاجی جلوس تو ادھر نہیں آ رہا۔ مگر جلد ہی عقدہ کھل گیا۔ چند قدم آگے

بڑھا تھا کہ ایک پنڈال خلقت سے لبریز نظر آیا۔ کوئی جلسہ ہو رہا تھا۔ "غافل مسلمانو، غازی عطاء اللہ تم سے صرف ایک بات پوچھتا ہے کہ تمہارے سینے سوز دروں سے کیوں محروم ہو گئے۔" اچھا غازی صاحب ہیں، میں چونکا۔ میں جلدی سے اس مقام سے گزر جانا چاہتا تھا مگر اندر ایک لہر اٹھی کہ سنو تو سہی کہ غازی صاحب پبلک جلسہ میں کیا کہتے ہیں۔ "مسلمانو، مجھے بس اس ایک سوال کا جواب دے دو۔ مگر جواب کون دے گا۔ میری بے عقلی دیکھو کہ میں ان سے پوچھ رہا ہوں جو مغرب کی عقل عیار کے دام میں پھنس کر، ان کی سائنس ان کا فلسفہ پڑھ کے بصیرت سے محروم ہو چکے ہیں۔ میں اندھیروں میں روشنی تلاش کر رہا ہوں۔ یہ میری دیوانگی نہیں تو کیا ہے۔ عطاء اللہ کو اپنی دیوانگی کا اعتراف ہے۔ یہ دیوانہ اپنے جیسے دیوانوں کی تلاش میں ہے، ایسے دیوانے جو نئی عقل و دانش کے بتوں کو پاش پاش کر دیں، آج کے ابو جہلوں اور ابو لہبوں سے ٹکرا جائیں، مغرب کے اسلام دشمن پہاڑوں کو اپنی ٹھوکروں سے دو نیم کر دیں---------- مسلمانو، مجھے صرف تین سو تیرہ دیوانے درکار ہیں۔ جس روز یہ تین سو تیرہ دیوانے میری صدائے درد پر لبیک کہتے ہوئے---------"

نمونہ کلام دیکھ لیا تھا۔ میں جلد ہی آگے بڑھ گیا۔ اور جلد ہی ایک نئے منظر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ شادی گھر اب کچھ زیادہ جگمگا اٹھے تھے۔ ان کے آس پاس سڑک پر دور تک گاڑیوں کی قطار چلی گئی تھی۔ خواتین کاروں سے اتر رہی تھیں اس رنگ سے کہ زرق برق جوڑوں میں گلابی اور سونے میں پیلی ہو رہی تھیں۔ شہر میں ای جی اور کس طرح ہوتی ہے، میں نے سوچا اور کتنے داستانی شہر میرے تصور میں گھوم گئے۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، کسی ملک میں تھا کوئی بادشاہ، رعیت خوش حال، خاص و عام، سب کی نیک چال، سونا، جنگلوں بازاروں میں اچھالتے چلے جاؤ، کوئی اچکے کسی کی کیا مجال، دل کو کتنی ڈھارس ہوئی۔

میں اب اچھا خاصا چل لیا تھا۔ تھک گیا تھا۔ اپنے پچھلے حساب سے یہ لمبی ٹہل نہ ہو لیکن اب کے حساب سے تو تھی۔ سو مڑا اور جس رستے سے آیا تھا اسی رستے سے واپس ہوا۔ اب واقعی چائے کی طلب تھی۔ سوچا کہ جن چائے خانوں میں آتے ہوئے چائے نہیں پی سکے تھے وہیں چل کر پھر قسمت آزمائی کرو۔ سڑکوں کو اتنا ناپا ہے تو چائے

بھی لب سڑک ہی پی جائے۔ قسمت نے یاوری کی۔ رش بہت تھا۔ چٹورے کباب تکوں کے آرڈر دے رہے تھے اور چائے کے لئے غل مچا رہے تھے۔ میں تاک میں کھڑا تھا۔ ایک پارٹی اٹھی تو فوراً ہی اس میز پر قبضہ کر لیا۔

چائے کا آرڈر دینے کے ساتھ ساتھ میں نے کلائی پر لگی گھڑی دیکھی اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ مجو بھائی بیٹھے مجھے کوس رہے ہوں گے۔ اب تو ان کے پروگرام کا وقت شروع ہونے لگا ہے۔ میں نے آرڈر دیتے ہوئے لڑکے سے پوچھا کہ "تمہارے یہاں ٹیلی فون ہے۔"

"ہاں ہے جی۔"

میں نے کاؤنٹر پر جا کر فوراً گھر فون ملایا۔ مجو بھائی بول رہے تھے اور غصے میں تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں گھر پہ بیٹھا بور ہو رہا تھا۔ ذرا دل اور سا کرنے کے لئے باہر نکل آیا۔ یہاں دیر ہو گئی۔ جمال دین پہنچ چکا ہو گا۔ اسے میری طرف بھیج دو۔ زیادہ دور نہیں ہوں۔ بس ابھی آیا۔ پھر جمال دین کو فون پر بلا کر اسے چائے خانے کا محل وقوع سمجھا دیا۔

فون کر کے واپس آیا تو دیکھا کہ ایک اور صاحب آ کر شریک میز ہو گئے ہیں۔ ان چائے خانوں میں یہی ہوتا ہے۔ اگر آپ اکیلے ہیں تو خطرے میں ہیں۔ کوئی اجنبی آ کر آپ کی میز میں آپ کا شریک بن سکتا ہے۔ سو میں کیا کرتا۔ چپ ہو رہا۔ مگر اندر سے کچھ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس میز پر میری آزادی ختم ہو گئی ہو۔

"آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے۔" اس نے بالآخر سلسلہ کلام شروع کیا۔

میں نے ایک بار پھر اپنی گھڑی دیکھی اور مختصراً جواب دیا "ساڑھے چھ۔"

ریل میں سفر کرتے ہوئے یا ریستوران میں چائے پیتے ہوئے آپ کے قریب بیٹھا کوئی اجنبی وقت پوچھے تو سمجھ لیجئے کہ یہ کسی لمبی گفتگو کا پیش لفظ ہے۔ تو مجھے یہی اندیشہ ہوا تھا کہ اس شخص کی نیت نیک نہیں ہے۔ کوئی باتونی آدمی ہے۔ انگلی پکڑلی ہے، اب پہنچا پکڑے گا اور مجھے باتوں میں الجھانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن شاید میرے روکھے پھیکے جواب نے اسے مایوس کیا۔ اگلی بات کرنے کی بجائے اس نے میز پر پڑا ہوا شام کا اخبار اٹھایا اور بڑے انہماک کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے

اطمینان کا سانس لیا۔ مگر یہ بھی عجب ہوا کہ جب تک یہ اخبار میز پر پڑا تھا میں نے اسے پڑھنا تو کجا اس کی سرخیوں پر بھی نظر دوڑانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ مگر دوسرے کے ہاتھ میں پہنچتے ہی وہ دو ورقی اخبار میرے لئے ایک کشش کی چیز بن گیا۔ میں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اخبار کے اس حصے پر جو میری طرف تھا نظر ڈالی اور جلی سرخیوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ خبریں کیا ہیں۔

تھوڑا پڑھنے اور ورق الٹ پلٹ کرنے کے بعد اس شخص نے اخبار سے فراغت پالی۔ اخبار بند کرتے ہوئے بڑبڑایا "اللہ ہم پہ رحم کرے۔" اور اسے میری طرف بڑھادیا۔ "آپ پڑھیں گے۔"

مجھے یوں لگا کہ اس نے میری نظروں سے تاڑ لیا ہے کہ میں اس انتظار میں ہوں کہ وہ اخبار پڑھ چکے تو میں اسے لے کر پڑھنا شروع کردوں۔ اس خیال کے ساتھ میں تھوڑا سٹپٹایا اور جھٹ سے جواب دیا "جی نہیں، آپ پڑھیں۔ مجھے ان خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ یہ آخری فقرہ کہہ کر میں پھنس جاؤں گا۔ بس وہ شروع ہوگیا "آپ صحیح کہتے ہیں۔ کسی شریف آدمی کو ان خبروں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ قتل، اغوا، زنا، فائرنگ، بم بلاسٹ۔ جیسے شہر میں اس کے سوا کوئی سرگرمی ہے ہی نہیں۔ کم از کم اخبار تو یہی ثابت کرتے ہیں۔ مجال ہے کوئی کام کی خبر ہو۔ بس انہیں دہشت خیز وارداتوں سے اخبار بھرا ہوتا ہے۔ آخر کہیں سے کوئی اچھی خبر بھی تو آنی چاہئے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ اخبار والے آخر اچھی خبریں کیوں نہیں دیتے۔ یا ایسا ہے کہ دینے کے لئے اب کوئی اچھی خبر ہے ہی نہیں۔ کیوں جناب آپ کا کیا خیال ہے۔"

میں پریشان کہ کیا جواب دوں۔ ہوں ہاں کرکے بھی نہیں ٹال سکتا تھا کہ اس نے براہ راست مجھ سے سوال کیا تھا "آپ کی شکایت بجا ہے۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ "مگر اچھی خبر آئے گی تو وہ دیں گے۔"

"آپ صحیح کہتے ہیں۔ واقعی یہی بات ہے۔ اچھی خبر اگر آئے ہی نہیں تو اخبار والے کیا کریں، کہاں سے پیدا کریں۔ وہ بیچارے مجبور ہیں۔ آخر انہیں اپنا اخبار بیچنا

ہوتا ہے۔ اچھی خبر نہیں ملتی تو بری خبریں چھاپتے ہیں۔ صاحب کیا زمانہ آیا ہے، اچھی خبر ہی غائب ہو گئی۔ جو خبر آتی ہے وحشت ناک ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں صاحب، آپ کا کیا خیال ہے۔ کچھ سمجھائیے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

"پہلے اپنی سمجھ میں تو آئے۔" میں نے پھر مختصر سا جواب دے کر ٹالنا چاہا۔ مگر وہ صاحب ٹلنے والی شئے نہیں تھے۔

"آپ صحیح کہتے ہیں۔ واقعی یہی بات ہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ مگر یہ آخر کب تک ہوتا رہے گا۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ اس کا کوئی علاج تو ہونا چاہئے۔ حکومت تو کانوں میں کڑوا تیل ڈالے بیٹھی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو نہیں بیٹھنا چاہئے۔ ہمیں کچھ تو سوچنا چاہئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور اس کا کیا علاج ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ اس کا کیا علاج ہے۔"

"علاج" میں مشکل پھنستا چلا جا رہا تھا "جی مجھے تو معلوم نہیں۔ آپ سوچئے۔"

"جناب، میں نے تو سوچا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سارے آشوب کا ایک ہی علاج ہے۔ اور جناب یہ زبانی بات نہیں ہے۔ زبانی بات تو ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ میں نے ایک مراسلہ لکھا تھا اور بہت تفصیل سے بتایا تھا کہ ہمارا روگ کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔ میں نے کئی اخباروں کو وہ مراسلہ بھیجا تھا۔ مگر کسی نے نہیں چھاپا۔ یہ اخبار والے بے حس لوگ ہیں۔ قومی احساس تو ان کے یہاں ہے ہی نہیں۔ بیکار کی خبریں اخبار میں بھر دیتے ہیں۔ کام کی بات کبھی نہیں چھاپتے۔ بہرحال میں نے تو اپنا فریضہ ادا کر دیا تھا۔ اس مراسلہ میں قوم کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ یہ ہمیں اسلام سے منحرف ہونے کی سزا مل رہی ہے۔ کوئی علاج کارگر نہیں ہو گا۔ صرف ایک علاج ہے کہ اسلامی نظام فوری طور پر نافذ کر دیا جائے۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا"۔

"کیسے نافذ کر دیا جائے۔" یونہی میرے منہ سے نکل گیا۔

"ڈنڈے کے زور سے۔ اور کیسے۔ جناب ہمیں ایک مرد آہن کی ضرورت ہے جو ہمیں مار مار کے سیدھا کر دے۔ جمہوریت کو تو ہم نے آزما کے دیکھ لیا۔ وہ ہمارے مرض کا علاج ہے ہی نہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جمہوریت نے

ہمارا کیا حال کیا ہے۔"

برابر کی میز سے ایک تن جلے نے جو دیر سے کان لگائے یہ گفتگو سن رہا تھا تڑپ کر کہا "ارے صاحب یوں کہئے کہ ہم نے جمہوریت کا کیا حال کیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے، آپ کا۔" میری میز والے نے برہمی سے کہا۔

"مطلب صاف ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اسے آپ جمہوریت کہیں گے۔"

چائے والا لڑکا اسی دم برابر سے گزرا۔ میں نے اسے روکا اور پوچھا "میاں چائے کتنی دیر میں لا رہے ہو۔"

شاید میرے کہنے پر ہی میرے ہمنشین کو یاد آیا کہ وہ بھی تو یہاں چائے کی آس پر بیٹھا ہے۔ اس نے گرم لہجہ میں اسے یاد دہانی کرائی۔ "ابے او لمڈے، تو کتنی دیر اور انتظار کرائے گا۔ چائے ملے گی یا نہیں ملے گی۔"

"بس جی ابھی لایا۔"

"ہاں فٹافٹ لے کے آ۔"

"ابھی آیا جی۔" لڑکے نے یہ کہا اور اس تیزی سے گیا جیسے وہ واقعی ابھی چائے لے کر آ رہا ہے۔"

میرا ہمنشین مجھ سے اب بے نیاز ہو چکا تھا۔ سو جب دوبارہ اس نے سلسلہ کلام شروع کیا تو مجھے مخاطب کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ برابر والی میز پہ بیٹھے شخص ہی سے اس کا خطاب تھا "مغرب نے ہمیں دو تحفے دیئے ہیں، جموریت اور بے حیائی۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔"

"بہت تعلق ہے۔ یہ جو نوجوانوں میں مادر پدر آزادی آئی ہے یہ اسی جمہوریت کی دین ہے۔ اور لڑکیاں تو بالکل برباد ہو گئیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس وقت کتنی بے حیائی پھیل رہی ہے۔ ہر لڑکی ڈش انٹینا دیکھتی ہے۔ مگر ہمارے مغرب زدہ لوگ اسے بے حیائی نہیں کہتے۔ آزادی نسواں کہتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آزادی نسواں کا مطلب کیا ہے۔ یہی نا کہ شوہر کو شوہر نہ سمجھے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ہمیں ایک مرد آہن کی ضرورت ہے۔ جمہوریت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ کیا کرے گا۔" تن جلے نے جل کر پوچھا۔

"پہلے تو وہ ان سیاستدانوں کو مرغا بنائے گا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اسے یہی کرنا چاہئے۔ سب سیاستدانوں کو ایک قطار میں کھڑا کردے اور کہے کہ مرغا بن جاؤ۔ سیاستدانوں کو مرغا بنانے کے بعد وہ---------"

"اس کے بعد وہ قوم کو مرغا بنائے گا۔" تن جلے نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں اسے کرنا یہ چاہئے کہ جو چوں بھی کرے اسے گولی سے اڑا دے۔ میں کہتا ہوں کہ دنوں میں یہ قوم ٹھیک ہو جائے گی۔ اگر نہ ہوئی تو میں آپ کی ٹانگ کے نیچے سے نکل جاؤں گا۔"

تن جلے کا چہرہ سرخ ہو گیا "گویا آپ مارشل لاء چاہتے ہیں۔"

"مسٹر میں اس جمہوریت سے نجات چاہتا ہوں۔ اور اسلام چاہتا ہوں۔ سمجھے۔"

عین اسی وقت کہیں قریب سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ اور اسی کے ساتھ ایک شور اٹھا "آ گئے۔" اور بھگدڑ مچ گئی۔ دم کے دم میں میرے اردگرد کی سب میزیں خالی ہو گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک دم سے لوگ کیوں بھاگ کھڑے ہوئے اور اتنی جلدی کہاں غائب ہو گئے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ برابر سے دو ٹیکسیاں گزریں۔ ساتھ میں فائر کی آوازیں۔ اس کے بعد-------- اس کے بعد تو مجھے ہوش ہی نہیں رہا۔ بجلی کی سی تیزی سے---------- جیسے میرے پرخچے اڑ گئے ہوں۔

(17)

میں مر چکا تھا۔ اس وقت تو یہی لگ رہا تھا۔ جیسے میں اب زندہ نہیں ہوں۔ فٹ پاتھ پہ پڑی لاش۔ ہاں بالکل۔ پھر بھی کہیں میرے اندر زندگی کی کوئی رمق، نہیں زندگی کی رمق کہاں، بس احساس کی کوئی رمق اٹکی رہ گئی تھی۔ یایوں کہہ لو کہ پورا وجود ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ کوئی ایک ریزہ اچٹ کر الگ تھرتھرا رہا تھا۔ کان میں کوئی کوئی آواز اس طرح آجاتی جیسے کوسوں دور کوئی بول رہا ہے، بہت سے لوگ بول رہے ہیں۔ کیا ہوا------------ گولی لگی ہے------------ اچھا------------ ہاں------------ وہ تو یہ کہئے کہ بروقت------------ ڈرائیور نے کمال دکھایا۔ فوراً ہی اٹھا کر ہسپتال------------ ہوا کیسے------------ آناً فاناً آئے اور سپرے کرتے چلے گئے------------ اندھادھند------------ دم کے دم میں آئے اور گئے------------ اور پولیس------------ توبہ کرو------------ کوئی نئی بات نہیں ہے------------ اللہ رحم کرے------------ ویسے یہ بھی معجزہ ہی ہے کہ------------ ہاں معجزہ ہی ہو گا اگر جان بچ جائے------------ اللہ چاہے تو------------ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر------------ ابھی رپورٹ------------ جیسے سوتے میں آوازیں آرہی ہوں، ایسے عالم میں کہ آدمی پوری طرح سویا ہوا بھی نہ ہو اور پورا جاگ بھی نہ رہا ہو۔ آدھا سوتا آدھا جاگتا، اور سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ بات کس کے بارے میں ہو

رہی ہے۔ کس کے گولی لگی ہے۔ کب کی بات ہے۔ کون تھا وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے کتنا تعجب ہوا۔ مجھے یعنی اس ریزے کو جو مرتے وجود سے اچٹ کر الگ تھرتھرا رہا تھا۔ اب جتنی بھی زندگی تھی اسی ریزے میں تھی ریزہ اپنے آپ کو پوری ذات سمجھ رہا تھا۔ پورا وجود بن کر سوچ رہا تھا۔ حیران ہو رہا تھا۔ متجسس تھا۔ کب لگی گولی؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیسے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہیں پڑا ہوں یا کسی نے اٹھا کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے معلوم تو ہونا چاہئے کہ آخر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور میں نے تھرتھراتے ریزے نے، کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اکٹھا کیا۔ اکٹھا کرنے کو وہاں تھا کتنا۔ بہرحال جتنا بھی تھا تو جس حد تک اپنے آپ کو اکٹھا کر سکا اکٹھا کیا۔ کراہا "خیرل بھائی"

"یار خیرل بھائی یہاں کہاں آ گئے۔ میں ہوں مجو بھائی"۔

"اچھا خیرل بھائی نہیں ہیں۔ کہاں ہیں"۔

"میں مجو بھائی ہوں"۔

"اور میں؟"

"تم جواد ہو"۔

"جواد؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا؟" مجھے کتنا تعجب ہوا۔

"مجھے پہچان رہے ہو؟"

"خیرل بھائی، آپ کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"یار خیرل بھائی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں مجو بھائی ہوں اور تم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کہاں ہوں میں"۔

"ہسپتال میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ہسپتال میں؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آخر کیوں۔

"میرا خیال ہے حافظہ پہ اثر پڑا ہے"۔ کسی نے کہا۔

"جواد کچھ یاد ہے، گولی کیسے لگی تھی"۔

"گولی؟-------------- مجھے گولی لگی تھی؟------------- مگر کب؟"

"ہاں ذرا یاد کرنے کی کوشش کرو۔ کب گولی لگی تھی تمہیں۔

میں تمہیں اسی لئے کہا کرتا تھا کہ استاد ذرا ہوشیار رہا کرو۔ یہ نہیں کہ منہ اٹھایا اور چل کھڑے ہوئے۔ میں اسی دن سے ڈرتا تھا۔ خیر اللہ رحم کرے گا-------------" مجھے لگ رہا تھا کہ مجو بھائی کہیں دور کھڑے بول رہے ہیں۔ جیسے بولے چلے جا رہے ہیں اور ادھر جیسے اتنے لفظ سننے کی سکت نہ ہو۔ جو گھٹ گھٹا کر ایک ریزہ رہ گیا ہو اس کی سماعت میں کتنی گنجائش ہو سکتی ہے۔ ریزہ کتنا سن سکتا ہے۔ اس کے لئے تو ایک لفظ کی سماعت بھی بار ہونی چاہئے مگر میں سن کیسے رہا تھا۔ پورا وجود تو ادھر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ ادھر ایک ریزہ ہی تو تھرک رہا تھا۔ اپنے آپ کو پورا وجود سمجھ رہا تھا۔ ایسے سن رہا تھا کہ جیسے وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ ثابت و سالم وجود ہے۔ مگر جلد ہی اس کی قلعی کھل گئی۔ آواز مدھم ہوتی چلی گئی۔

میں تو مر چکا تھا۔ پھر یہ میرے اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے؟ مجھے تعجب ہوا۔ تو گویا مرنے کے بعد بھی احساس باقی رہتا ہے اور قوت سماعت بھی۔ احساس کی نبض رک رک کر چل رہی تھی لیکن بہرحال چل رہی تھی۔ چل کیا رہی تھی، آہستہ آہستہ ڈوب رہی تھی۔ بالکل ڈوب ہی نہ جائے۔ اسے ڈوبنا نہیں چاہئے۔ پھر تو میں بالکل ہی ڈوب جاؤں گا۔ میں نے پھر اپنے آپ کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اتنا احساس تھا کہ میں سارا کا سارا بکھر گیا ہوں۔ اکٹھا کیسے کروں گا اپنے آپ کو۔ پھر بھی ہمت کر کے اپنے آپ کو اکٹھا کرنے کی ایک کوشش کی۔ اکٹھا کر کے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ہوا کیا تھا؟---گویا اگر یہ یاد آجائے کہ ہوا کیا تھا تو میں ایک مرتبہ پھر اپنے آپ میں آجاؤں گا۔ کیا واقعی گولی لگی تھی۔ میں نے اپنے حافظہ سے لڑنا شروع کیا۔ کچھ کچھ یاد آیا مگر عجب انداز سے جیسے زمانہ پہلے ایسا کوئی واقعہ ہوا ہو۔ فراٹے سے گزرتی ہوئی دو ٹیکسیاں، بھگدڑ------------ لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں، کون لوگ ہیں؟ کوئی واضح تصویر ذہن میں ابھر نہیں پا رہی تھی۔ تصویر مرتب ہوتے ہوتے پھر بکھر گئی۔ جیسے نبض پھر ڈوبتی جا رہی ہو۔ پھر ہوش و حواس کے ہمیٹے ہوئے ریزے بکھرنے لگے ہوں۔ پھر بھی ایک ریزہ، کوئی ننھا سا ذرہ، بس ایک کنکی، عجب ہوتا ہے پورا وجود بکھر جاتا ہے۔

ساری جان نکل جاتی ہے مگر کوئی ایک ریزہ، کوئی ایک کنکی اپنے آپ کو بچالے جاتی ہے اور اپنی خود مختاری کا اعلان کرتی ہے۔ تو کہیں ایک ریزہ بچا رہ گیا تھا۔ میں اب پورے کا پورا اس ریزے میں تھا اور اپنے ریزہ وجود کے ساتھ یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب میں سالم تھا، جب ابھی گولی نہیں لگی تھی مگر گولی کب لگی تھی، کدھر سے آئی تھی۔ میں اس وقت کہاں تھا۔ تو کیا میں ڈھے گیا تھا۔ کس نے مجھے اٹھایا تھا یا نہیں اٹھایا تھا۔ اگر نہیں اٹھایا تھا تو اس کا مطلب ہے ابھی تک وہیں پڑا ہوں۔ عجب ہوتا ہے کہ جوان جہان آدمی اپنے لانبے وجود کے ساتھ دم کے دم میں ڈھے جاتا ہے، لوتھ ہو جاتا ہے۔ ذات کہ اپنے تئیں ایک جہان ہوتی ہے، ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ کرچیاں بکھر جاتی ہیں۔ اسی عجب بات میں ایک اور عجوبہ۔ کوئی ایک کنکی حق خود اختیاری جتاتے ہوئے اپنی خومختاری کا اعلان کر دیتی ہے۔ اپنی دانست میں پوری ذات بن جاتی ہے تو میں اس ساعت پورا کا پورا اس کرچی میں تھا اور اپنے حافظہ سے لڑ رہا تھا۔ اسے اپنے قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا اور حافظہ باغی ہو چکا تھا۔ قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ عجب چالیں چل رہا تھا۔ جو باتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہ یاد نہیں آ رہی تھیں۔ جو سان گمان میں نہیں تھیں، وہ یاد آ رہی تھیں اور اس طرح یاد آ رہی تھیں جیسے وہ مجھے اپنے ریلے میں بہا کر لے جائیں گی۔ لگتا تھا کہ جو کچھ طاق نسیاں میں تھا وہ عود کر آیا ہے اور طاق نسیاں خالی پڑا ہے یا شاید ختم ہی ہو گیا ہے، اسے ختم ہونا ہی تھا۔ جب ذات ہی ریزہ ریزہ ہو گئی تو طاق نسیاں کہاں سلامت رہتا۔ وہ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا ہو گا۔ اب پتہ چلا کہ طاق نسیاں ہمارے لئے کتنا ضروری ہے۔ کتنی یادوں کو سنگھوا لیتا ہے۔ نہیں تو ہر گھڑی ہمارے اندر یادوں کا محشر بپا رہا کرتا۔ اس وقت میرے اندر یہی کچھ تو ہو رہا تھا۔ طاق نسیاں بکھر چکا تھا۔ میں کہ ایک ریزے، ایک کرچی میں بچا رہ گیا تھا۔ اپنی بے انت یادوں کے ساتھ بڑھتا، پھیلتا جا رہا تھا۔ منوجی کی مچھلی کی مانند کہ چھنگیا برابر تھی مگر پھیلنے پہ آئی تو اتنی پھیلی کہ ندی چھوٹی رہ گئی، وہ بڑھ کر سمندر میں پھیل گئی۔ میں کہ ایک کرچی رہ گیا تھا اپنی یادوں کے سمندر کے ساتھ ایک کائنات بنتا جا رہا تھا۔ میرے اندر یادوں کا روز محشر آ گیا تھا۔ جیسے کسی نے صور پھونک دیا ہو۔ مدفون یادیں ایک دم سے زندہ ہو گئی تھیں۔ جیسے اپنا اپنا حساب دینے پہ آمادہ ہوں مگر حساب دینے سے کترا بھی

رہی تھیں۔ کوئی یاد اپنا پورا حساب دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ کسی یاد کا سرا ہی نہیں مل رہا تھا۔ ابتدا یاد آئی تو انتہا غائب، انتہا کا سرا مل گیا تو ابتدا کا سرا غائب۔ کوئی کہیں بیچ میں سے نمودار ہوئی ہے۔ ابتدا بھی غائب، انتہا بھی غائب۔ پھر یہ کہ کون سی یاد میری اپنی ہے اور کون سی یاد کسی دوسرے کی میری یادوں میں آن ملی ہے۔ جیسے کسی دوسرے کبوتر باز کا کبوتر اڑتا اڑتا آئے اور ہماری چھتری پہ آن بیٹھے اور کبوتروں کو دانہ چگتے دیکھ کر چھتری سے اترے ان میں آن شامل ہو۔ کہاں کہاں کی یادیں، اپنی پرائی، بھٹکتی بھٹکاتی آئیں اور میری نجی یادوں میں آکر رل مل گئیں۔ میں اس وقت کیا کر سکتا تھا۔ نڈھال پڑا تھا، جانکنی کا سا عالم تھا۔ اتنی سکت کہاں تھی، نہ اتنی قوت تمیز کہ اپنی یادوں کو چھانٹ کر پرائی یادوں سے علیحدہ رکھوں۔ بس اس وقت تو یہ عالم تھا جیسے چاروں طرف اندھیرا ہو، گھرا اندھیرا اور ان گنت جگنو اردگرد اڑ رہے ہوں۔ دمکتی ماند پڑتی ان گنت جگنو ایسی یادیں۔ میں جگنو پکڑ رہا تھا۔ کرتے کے دامن میں جگنو ہی جگنو.........."منی، او منی! یہ دیکھ بیر بہوٹیں۔" یہ میمونہ کسے پکار رہی ہے، مجھے؟ یہ کون سا میں ہوں۔ میں جب منی تھا جو اب میرے لئے وہ ہے۔ وہ جو تتلیوں کو بھول بھال ادھر لپکتا ہے۔ میمونہ خوشی اور حیرت سے بھری نظریں زمین پہ گاڑے کھڑی ہے، زمین کے اس ٹکڑے پر جہاں بھیگی بھیگی گھاس پہ کتنی بہت سی بیر بہوٹیاں رینگ رہی ہیں، ننھی ننھی سرخ مخمل کی گٹھیاں سی۔ کتنی تیز تیز چل رہی ہیں۔

"منی، کتنی بہت سی بیر بہوٹیاں ہیں۔" میمونہ کے اندر سے خوشی چھلکی پڑ رہی ہے۔ منی اس کے ساتھ جا شامل ہوتا ہے۔

دونوں کتنی حیرت اور کتنی مسرت سے ہری ہری گھاس میں ان ننھی منی لال لال بیر بہوٹیوں کو رینگتے دوڑتے دیکھ رہے ہیں۔ منی سے ضبط نہیں ہو پا رہا۔ چھو کے دیکھنا چاہئے۔ ایک بیر بہوٹی کو انگلی سے چھوتا ہے۔ اے لو وہ تو چلتے چلتے ساکت ہو گئی۔

"منی، یہ کیا کیا؟"

"کیا کیا میں نے، کچھ بھی تو نہیں کیا۔ بس ذرا چھوا تھا۔" منی نے جیسے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے اور صفائی پیش کر رہا ہے۔

"بیر بہوٹی مر گئی۔"

"نہیں، مری نہیں ہے۔ مکر بنا کے پڑ گئی ہے۔"

"جھوٹ، وہ مر گئی ہے۔" میمونہ جیسے اب روئی اور اب روئی۔

"شرط بدتا ہوں، نہیں مری۔"

من کا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے۔ ساکت بیر بہوٹی کو تکے جا رہا ہے۔ اگر سچ مچ مر گئی ہے تو پھر کیا ہوگا۔ اللہ کرے بیر بہوٹی جی اٹھے۔ اللہ میاں بیر بہوٹی کو جلا دو۔ اللہ میاں نے تو واقعی سن لی۔ اے لو اس نے دھیرے دھیرے پنجے کھولے اور پھر رینگنا شروع کر دیا ہے۔

"آہا، بیر بہوٹی زندہ ہو گئی۔" میمونہ خوشی سے تالی بجا رہی ہے۔

"میں نہ کہتا تھا مری نہیں ہے۔ بیر بہوٹی بہت مکر کرتی ہے۔ ذرا چھو لو، ایسا مکر کرتی ہے جیسے سچ مچ مر گئی ہو۔"

پھر انہیں پکڑیں کیسے، دونوں دبدا میں پڑ جاتے ہیں۔ پکڑیں یا نہ پکڑیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ "میمونہ!"

"ہاں، کیا ہے۔"

"ہولے بول، تتلی۔"

"کہاں؟" میمونہ سرگوشی میں پوچھتی ہے۔

"وہ!" وہ انگلی کے اشارے سے بتاتا ہے۔ چنبیلی کی اوپر والی شاخ پہ ایک پتے پہ ٹکی ہوئی۔ کالے چمکتے پروں پہ سفید زرد چتیاں۔ وہ چپکے چپکے چنبیلی کی طرف بڑھتا ہے۔ ہاتھ اس طرف بڑھاتا ہے کہ وہ پھڑپھڑا کر اڑتی ہے اور فضا میں چکر کاٹنے لگتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تو بھیا رے وہ شہزادی جب باغ میں جاتی تو دیکھتی کہ وہ تتلی اسی پھول پہ آ کر پھر بیٹھی ہے اور حیران ہوتی کہ آخر یہ تتلی اسی پھول پہ آ کر کیوں بیٹھے ہے۔

"پھوپھی اماں، وہ تتلی کیوں اسی پھول پہ آ کے بیٹھتی تھی؟"

"اے بیٹا دم تو لو، دیکھو تو سہی آگے ہوتا کیا ہے۔ وہ تتلی تو تھی نہیں۔"

"وہ تتلی نہیں تھی، پھر کون تھی؟"

"تھوڑا دم لو، سنو کہ پھر ہوا کیا۔"

"میں بتاؤں پھر کیا ہوا؟" میمونہ بیچ میں تڑ سے بول اٹھتی ہے۔

"تو بیچ میں کیوں بول رہی ہے، کہانی سننے دے۔ ہاں پھوپھی اماں پھر کیا ہوا؟"

"اے بیٹا، پھر یہ ہوا کہ شہزادی نے----------"

"جواد، آنکھیں کھولو۔ دیکھو کون آیا ہے۔" مجو بھائی کی آواز۔ جگنوؤں سے بھرا اندھیرا تربتر ہو جاتا ہے۔ کس مصیبت سے میں اس آنند بھرے اندھیرے سے نکل کر اجالے میں آتا ہوں اور تھوڑی سی آنکھ کھولتا ہوں۔ ارے سید آقا حسن اور بشو بھابی!

"عالی جاہ، کیا کر لیا یہ آپ نے؟"

"اے ہے ان کلموؤں کو کچھ نہیں کہتے۔ انہیں ہیضے کی کلی آئے، وہ تھے کون؟"

"بھابی، اب اس بات کو جانے ہی دیں کہ کون تھے وہ؟ بہرحال باہر سے تو کوئی نہیں آیا تھا۔"

"ٹھیک کہتے ہو بھائی، ہم خود ہی اپنی جانوں پر ستم توڑ رہے ہیں۔ خیر، پہلے احوال بتایئے۔ خیریت تو رہے گی۔ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟"

"رپورٹ اطمینان بخش ہے۔ خطرے کی اب کوئی بات نہیں ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

"استاد! جان بچ گئی، شکر کرو۔ بھابی، اصل میں ڈرائیور ہمت والا نکلا۔ حاضر دماغی سے کام لیا۔ فرانٹے سے وہاں سے گاڑی نکالی اور سیدھا ہسپتال پہنچ گیا۔ بس بروقت ایڈ مل گئی۔"

"جان جو بچنی تھی۔ اے مجو بھائی، میری تو طبیعت رات ہی سے پریشان تھی۔ کمبخت بلی رات کو ایسی بری طرح روئی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ دل یوں یوں کرے۔ اے اللہ کوئی پریشانی کی خبر مت سنویو۔ یہ کہا اور تین مرتبہ ناد علی پڑھ کے پھونکا اور سو گئی۔ بس سمجھو کہ یہ ناد علی کا اعجاز ہے کہ جان بچ گئی۔"

"ہاں بھابی، بس معجزہ ہی ہوا ہے۔"

"بھائی مجید الحسینی، یہ شہر رہنے کے قابل نہیں رہا۔ اب نہ یہاں عزت محفوظ

ہے، نہ جان کی سلامتی ہے۔"

"ہاں کم از کم شریفوں کے رہنے کے قابل تو نہیں رہا۔"

"حد ہے جواد صاحب جیسا شریف آدمی جو نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ ارے بابا، یہ تمہارے اپنے سیاسی جھگڑے ہیں۔ تم ایک دوسرے کا سر پھوڑو، ایک دوسرے کی گردنیں کاٹو۔ ہم تو تمہارے کسی قضیئے میں شامل نہیں ہیں۔ ہم پر کیوں زندگی حرام کرتے ہو۔" اور اچانک آقا حسن صاحب کا لہجہ بدلا۔ "ارے ہم نے یہ کیا ذکر شروع کر دیا۔ مریض کو زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہئے، آرام کرنے دیں۔" اور ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اصل میں انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ میری آنکھیں بار بار مندنے لگتی ہیں اور میں زبردستی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"ہاں بھیّن آرام کرو، زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس سو جاؤ۔" بشو بھابی نے چلتے چلتے کہا۔

سو جاؤں، نیند کہاں، جگنوؤں بھرا اندھیرا پھر آہستہ آہستہ امنڈ رہا ہے مگر جگنو دور دور اڑ رہے ہیں۔ اس وقت تو بالکل میرے آس پاس اڑ رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کسے چھوڑوں اور کسے پکڑوں۔ مگر اس وقت جیسے حافظہ جواب دے رہا ہو۔ نہیں حافظہ کو زائل نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے یاد آنا چاہئے------------ کیا یاد آنا چاہئے------------ کچھ بھی------------ "پاکستان آ گیا۔" اندھیرے میں ایک مسرت بھری آواز۔

"اچھا پاکستان آ گیا۔" پورے ڈبے میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ سہمے سکڑے لوگوں میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ ایک کے اوپر ایک، ہر ایک کی کوشش یہ ہے کہ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھے کہ پاکستان کیسا ہے۔ بھلا رات کے اندھیرے میں کیا نظر آئے گا۔ ٹھیک ہے کہ رات ڈھل چکی ہے، پچھلا پہر ہے، صبح ہونے کو ہے۔ پھر بھی اچھا خاصا اندھیرا ہے۔ گاڑی کی رفتار دھیمی ہو گئی ہے، ہوتی چلی جا رہی ہے۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

"اے منّیا، خدا خدا کر کے پاکستان آیا ہے۔ دل میں ہولیں اٹھ رہی تھیں۔

رستے بھر جل تو جلال تو پڑھتی آئی ہوں۔"

"اے بہنو، کیا پوچھو ہو۔ سارا رستہ اس طرح کٹا ہے کہ جان حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔ جالندھر کے سٹیشن پہ دیکھا تھا۔ کیسے بھوت سے کھڑے تھے۔ ایک کلموئے نے بندوق ایسے پکڑی ہوئی تھی کہ نال سیدھی میری طرف۔ میں تو ہول گئی کہ اب آئی گولی۔ بس میں نے آیۃ الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ اللہ کے کلام میں بڑی برکت ہے۔ فوراً ہی ریل چل پڑی۔ میں نے کہا، اللہ تیرا شکر ہے۔"

"اماں! اب گولی کی بات مت کرو، پاکستان آگیا ہے۔ یاں تمہیں کوئی بندوق نہیں دکھائے گا۔"

"شکر ہے خوف کی سرزمین سے ہم نکل آئے ہیں۔" ایک سفید ریش بزرگ بڑبڑاتے ہیں پھر کلمہ کا ورد کرنے لگتے ہیں۔

"عجب حالات تھے، نہ جان محفوظ نہ عزت محفوظ۔"

"شکر ہے کہ ہم جانیں اور عزت بچا کر لے آئے ہیں۔"

"بس اللہ پاکستان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔"

"آمین!"

"ارے میاں، میرا تو دل ابھی تک کانپ رہا ہے۔"

"اماں، اب آپ کا دل کیوں کانپ رہا ہے اب تو پاکستان آگیا ہے۔ یاں آپ کو کس بات کا کھٹکا ہے۔"

"بڑی بی!" کسی نے بلند آواز سے کہا۔ "پاکستان دارالامان ہے۔"

اچانک کوئی اونچی آواز سے کہتا ہے۔ "پاکستان" اور پورے ڈبے والے مل کر نعرہ لگاتے ہیں۔ "زندہ باد!"

"اماں، دن کیا ہے؟"

"جمعہ لگ چکا ہے۔"

"مبارک دن ہے۔"

"اے میاں، چاند کی کونسی ہے۔"

"ذی الحج کی آج ۹ ہو گئی۔ اب کے حج اکبر ہے۔"

"تاریخ بھی مبارک ہے۔"

پھر کھانچا، بعد کی کوئی بات یاد نہیں آ رہی۔ ۹ ذی الحجہ بروز جمعہ، وقت صبح صادق، پاکستان میں آمد مبارک، آگے؟ کتنا یاد کر رہا ہوں۔ کچھ یاد نہیں آ رہا۔ دن، مہینے، سال۔ کوئی دن، کوئی ساعت، کوئی تقریب۔ کچھ یاد نہیں آ رہا۔ یا اللہ میرے حافظ کو کیا ہوا جا رہا ہے۔ کوئی تقریب خوشی کی، کوئی موقعہ غمی کا، کچھ تو یاد آنا چاہئے۔ کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔ حافظ کی لوح صفا چٹ ہے۔ یا اللہ، بسر ہونے والے اتنے میرے شب و روز کہاں گئے۔ سب کہاں جا چھپے۔ اتنے سارے برس تھے۔ ایک پوری عمر تھی، کیا واقعی مجھے گولی لگی تھی مگر کیا ایک گولی ان سب کو کھا گئی۔ کیسی گولی تھی کہ اتنے بہت سے برسوں کو، خوشی اور غمی کی سب ساعتوں سمیت ایسے چاٹ گئی جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔ سوچتے سوچتے مجھے یاد آتا ہے کہ پہلے بھی میرے ساتھ یہ ہو چکا ہے۔ ایسے ہی میری ایک پوری عمر گم ہوئی تھی۔ وہ سارے شب و روز، وہ صبحیں اور شامیں، لمبی دوپہروں کا وہ پورا سلسلہ، وہ ساری رتیں مگر یہ بھی تو ہوا کہ پھر اسی شدت کے ساتھ شب و روز کا وہ پورا قافلہ واپس بھی آیا۔ گم ہو جاتا تو شاید میں امن میں رہتا۔ مگر وہ تو سارے ہی شب و روز پلٹ آئے۔ اسی طرح زندہ تھے۔ زیادہ زندہ ہو گئے۔ عجیب بات ہے۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی۔ وہ شب و روز کون سے لمبے چوڑے تھے۔ بس چند دوپہریں، چند جھٹپٹی صبحیں اور شامیں مگر انہوں نے میرے اندر اتر کر کیسا رنگ پکڑا اور کتنی نشوونما کی کہ لگتا اجلی صبحوں اور دھواں دھواں شاموں کی وہ پوری ایک صدی ہے۔ ماہ و سال کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ ٹھکانے سے برتی ہوئی چند گرم دوپہریں اور چند ٹھنڈی مہکتی صبحیں اور چند اداس شامیں ایک پورا زمانہ بن جاتی ہیں۔ اپنے اندر اتنا کچھ لئے ہوتی ہیں کہ ماہ و سال میں مقید نہیں رہتیں، پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ کمال ہے، پورا وجود مر جاتا ہے، مگر کوئی ایک ریزہ اس سے ٹوٹ کر اس طرح متحرک ہوتا ہے کہ وجود سے بڑھ کر وجود بن جاتا ہے۔ اسی طور ایک دور ختم ہو جاتا ہے، ایک عمر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی چند دوپہریں، چند صبحیں، چند سانولی یا اداس شامیں پھیل کر صدیاں بن جاتی ہیں۔ اے لو جگنو پھر اڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔ جیسے چڑیاں دانہ چگتے چگتے ذرا سے کھٹکے سے پھر سے اڑ جاتی ہیں۔ لگتا ہے کہ گئیں، دور نکل

گئیں مگر کوئی دم جاتا ہے کہ پھر واپس آ جاتی ہیں۔ تو یادیں امنڈ گھمنڈ واپس آ گئی ہیں۔ مجھ پر چھاتی چلی جا رہی ہیں۔ ہاں وہ جو میں بیچ میں سے بھول گیا تھا، وہ کیا بات تھی۔ اب تو وہ بات یاد آ جانی چاہئے کہ کب کب کی بھولی بسری باتیں ایک دم سے یاد آ گئی ہیں۔ ہاں شاید یہ اس زمانے کی بات ہے جب رات کا پچھلا پہر آ جاتا تھا اور کہانی ختم نہیں ہوتی تھی۔ پھوپھی اماں اگلی رات پر ٹال کر ہمیں زبردستی سلاتیں۔ کہانی کئی کئی رات چلتی۔ آخر پھوپھی اماں اسے ختم کرنے میں کامیاب ہوتیں۔ کہنے والے کا بھلا، سننے والے کا بھلا، جس نے نہیں کہا اور جس نے نہیں سنا اس کا بھی بھلا، سب کا بھلا۔ اب بیٹے سو جاؤ۔ میمونہ تو بھی سو جا بہت رات ہو گئی ہے۔ گیدڑ بول رہے ہیں۔

"پھوپھی اماں! یہ گیدڑوں کی آواز ہے؟" یہ من کی آواز ہے تو پھر من آ گیا۔

"ہاں بیٹے! بہت رات ہو گئی ہے، گیدڑ بول رہے ہیں۔"

دور سے آتی ہوئی گیدڑوں کی آوازوں سے اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے۔ میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں یہاں نہ آ جائیں "پھوپھی اماں، یہ گیدڑ کہاں بول رہے ہیں۔"

"میں بتاؤں کہاں بول رہے ہیں؟" میمونہ تڑ سے بول اٹھتی ہے۔ "بھونڑ پہ بول رہے ہیں۔"

"جھوٹی۔"

"لو مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس دن جب ہم بھونڑ پہ گئے تھے تو وہاں ایک بھٹ دیکھا تھا نا، وہ گیدڑوں کا تھا۔"

"اس وقت تو وہاں کوئی گیدڑ نہیں تھا۔"

"بیٹے گیدڑ رات کو نکلتے ہیں۔"

"دن میں کہاں چھپے رہتے ہیں۔"

"میں بتاؤں۔" میمونہ پھر بول اٹھتی ہے۔

"بڑی آئی بتانے والی، تجھے کیا پتہ۔"

"اچھا لڑو مت، بہت رات ہو گئی ہے، سو جاؤ۔" اور پھوپھی اماں نے کروٹ لے کر ترت کے ترت خراٹے بھی لینے شروع کر دیئے ہیں۔ پھوپھی اماں نے جہاں

کہانی ختم کی انہیں نیند آئی۔ ان کے خراٹوں کی آوازیں۔ دور سے آتی گیدڑوں کی آوازیں۔ ان سے پرے کہیں دور سے آتی ہوئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ اسے ڈر لگنے لگتا ہے۔ "میمونہ، او میمونہ!" لو میمونہ بھی سو گئی۔ جیسے کوئی نہیں ہے۔ وہ اکیلا ہے۔ کتوں اور گیدڑوں کے بیچ جو اس کے گرد دائرہ بنا کر بھونک رہے ہیں، چلا رہے ہیں۔ دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے۔

"جواد، سو رہے ہو۔"

"ہوں، نہیں۔-----------" من غائب۔ پھر میں تھا اور پھر وہی مجو بھائی۔

"سونے کی کوشش کرو۔"

"مگر مجو بھائی، یہ آج گیدڑ اتنا کیوں بول رہے ہیں۔"

"گیدڑ، یار گیدڑ یہاں کہاں؟ وہم میں مت پڑو، سو جاؤ۔"

کیسے سو جاتا، دماغ نہیں سو رہا تھا۔ اندر چرخی سی چل رہی تھی۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ! کسی ملک میں تھا کوئی بادشاہ۔

"نہیں پھوپھی اماں، وہ کوے اور مینا والی کہانی۔"

"یار جواد، دیکھو یہ رفیق صاحب آئے ہیں۔"

جگنو پھر تتر بتر ہو گئے۔ کتنی مشکلوں سے میں نے ایک مرتبہ پھر آنکھ کھولی۔ دھندلی دھندلی دو شکلیں نظر آئیں۔ ایک تو مجو بھائی تھے جنہیں میں اب تک صرف آواز سے پہچان رہا تھا۔ اب چہرہ نظر آیا اور دوسرا چہرہ، ہاں ٹھیک ہے۔ یہ رفیق صاحب ہیں۔

"جواد صاحب، کیا حال ہے؟"

سن لیا، اتنی سکت کہاں تھی کہ جواب دیتا۔ رفیق صاحب نے بھی رسماً ہی پوچھا تھا۔ انہیں بھی پتہ تھا کہ میں اس وقت جواب دینے اور بات کرنے سے قاصر ہوں۔ سو وہ فوراً ہی مجو بھائی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مجو بھائی انہیں میرا حال بتا رہے تھے۔ "یار، شروع میں تو موصوف بالکل ہی بہکے ہوئے تھے اور کسی کی بات تو جانے دو، مجھے تک نہیں پہچانا۔ میں نے پوچھا کہ کچھ یاد ہے گولی کیسے لگی تھی۔ حیران ہو کر پوچھا کہ گولی؟ کیسی گولی۔ خیر وہ کیفیت تو اب نہیں ہے۔ لوگوں کو کچھ کچھ پہچاننا شروع کر دیا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ حالت سنبھل رہی ہے۔"

"ہاں کسی قدر سنبھلی تو ہے مگر اب بھی یہ حالت ہے کہ سیدھی بات کرتے کرتے اچانک بیچ میں کوئی انمل بے جوڑ بات آجاتی ہے۔ دو فقروں میں ربط ہوتا ہے، تیسرے فقرے پر آکر کوئی ایران کی کوئی توران کی۔"

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"واضح طور پر کچھ نہیں بتاتے۔ کہتے ہیں آپریشن کے بعد صحیح کیفیت سامنے آئے گی۔"

"ٹھیک کہتے ہیں۔ پہلے گولی تو نکل جائے۔ ویسے کوشش یہ کرنی چاہئے کہ وہ واقعہ انہیں کسی طرح پورے طور پر یاد آجائے۔" اور پھر روئے سخن میری طرف ہو گیا۔ "جواد صاحب!"

میں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کر کے آنکھیں کھولیں۔

"جواد صاحب!" رفیق صاحب کہہ رہے تھے۔ "میں تو آپ کو بینک میں بیٹھا چھوڑ کر گیا تھا۔ آپ کو اور آپ کے ساتھ مرزا صاحب کو۔ آپ کس وقت وہاں سے نکلے۔ یہ واقعہ کہاں ہوا اور کس وقت۔"

یہ واقعہ کہاں ہوا اور کس وقت، میں دل ہی دل میں بڑبڑایا مگر کون سا واقعہ؟ میری آنکھیں پھر مند گئی تھیں۔ ساتھ ہی دماغ میں جیسے ہنڈیا پکنے لگی ہو۔ کون سا واقعہ؟ بار بار سننے کے بعد اب مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ساتھ کچھ ہوا ضرور ہے مگر کیا ہوا ہے؟ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں اپنے حافظہ سے لڑنے لگا۔ ایک کشتم کشتا حافظہ کے ساتھ شروع ہو گئی تھی۔ اس اڑیل سے میں نے کتنا کچھ اگلوا لیا تھا۔ اگلی پچھلی کتنی بہت سی باتیں یاد آگئی تھیں مگر ایک موڑ پر آکر وہ اڑ جاتا تھا۔ کس کس زمانے کی باتیں یاد آئیں مگر جو واقعہ اب ہوا تھا وہ یاد نہیں آیا رہا تھا۔

اب؟---------- میں سوچ میں پڑ گیا، آخر کب؟---------- اور اب میری سمجھ میں ایک بات آئی۔ بس میں نے طے کیا کہ رفیق صاحب نے صحیح سمجھائی ہے۔ مجھے براہ راست اس واقعہ کو نہیں بلکہ اس وقت کو یاد کرنا چاہئے۔ اگر وہ وقت اور ساتھ میں وہ جگہ بھی یاد آجائے تو واقعہ خود بخود یاد آتا چلا جائے گا۔ تو وہ کون سا

وقت تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ "یہ ماچس کس نے جلائی ہے، بجھاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بجھاؤ۔ "اندھیرے میں غصیلی آوازیں۔ "بہت سگریٹ پینے کا شوق ہے۔ چاہے سگریٹ کے پیچھے جان چلی جائے۔"

"ایک جان تھوڑا ہی جائے گی۔ ساتھ میں یہ سگریٹ پینے والے ہمیں بھی مروائیں گے۔"

"بالکل، اندھیرے میں سگریٹ کی یہ ننھی سی روشنی دور سے دکھائی دیتی ہے۔ گولی اس کی سیدھ میں آئے گی۔"

"ہائے اللہ!" ایک بوڑھیا کی خوف سے بھری آواز۔ "اے بیٹو، اس وقت تو سگریٹ مت پیو۔ اللہ کو یاد کرو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔" بڑبڑاتی ہے۔ "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔"

"اے میں نے کہا کہ ان بخت ماروں نے بیچ جنگل میں گاڑی کھڑی کر دی ہے۔ اتنی دیر ہو گئی، چلاتے کیوں نہیں ہیں۔" ایک دوسری نسوانی آواز۔

"اماں چپکی بیٹھی رہو۔ کوئی بات ہے جب ہی تو گاڑی رکی ہے، بس دعا کرو۔"

"ارے دعا تو کر رہی ہوں۔ پوری آیتہ الکرسی پڑھی ہے۔ اے بھیا پاکستان اب کتنی دور ہے۔"

"پچھلی سپیشل پہ اسی جگہ حملہ ہوا تھا۔ پوری گاڑی کٹ گئی تھی، بس اللہ رحم کرے۔"

"بھئی کسی کے پاس گھڑی ہے، کیا وقت ہو گا؟"

"دو بج کر بارہ منٹ!"

"اچھا، ابھی صرف دو ہی بجے ہیں۔ ابھی تو بہت رات پڑی ہے۔"

"یہ رات کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی۔"

تو وہ سوا دو بجے کا وقت تھا۔ صبح ابھی بہت دور تھی۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔ کبھی کبھی روشنی کی جھلک دور کے درختوں پر اس طرح نظر آتی جیسے بجلی چمکی ہو۔

"ارے بھیا! یہ روشنی کیسی ہے۔ میرے منہ میں خاک، کلموئے حملہ کرنے

والے تو نہیں ہیں۔"

"نہیں اماں، یہ ملٹری گارڈ والے ہیں۔ سرچ لائٹ سے دیکھ رہے ہیں کہ کہیں کوئی ہے تو نہیں۔"

گاڑی کو جنبش ہوئی۔ "گاڑی چلنے لگی ہے۔" اطمینان بھری آواز۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" بوڑھی اماں کی اطمینان بھری آواز۔

میں نے ہڑبڑا کر اپنے آپ کو روکا۔ یہ میں کہاں نکل گیا۔ مجھے جلد ہی خیال آ گیا کہ میں بھٹک گیا ہوں۔ یہ اس وقت کی بات نہیں ہے۔ خطرہ تو بہت تھا مگر حملہ نہیں ہوا تھا۔ سگریٹ پینے والوں نے ایک مرتبہ نہیں اسی دوران جب سپیشل بیچ جنگل میں رک کر کھڑی ہو گئی تھی اور سب کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے تھا کئی مرتبہ ماچس جلائی تھی اور سگریٹ سلگائی تھی مگر ادھر کوئی گولی نہیں آئی۔ تو، میں نے سوچا، یہ اس وقت کی بات تو نہیں ہے۔ پھر کس وقت کی بات ہے، کب کی؟ میں اپنے حافظہ سے لڑ رہا تھا اور دھیان بھٹک کر کہاں کہاں جا رہا تھا----------- "منّن، او منّن، سانپ!"

"جھوٹی۔"

"سچی، وہ----------- وہ، ادھر جھاڑی کے برابر میں---------- اوئی----------- مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ابھی اینٹ سے مارتا ہوں۔"

"نہیں، منّن نہیں۔ کاٹ کھائے گا۔"

آگے؟ پھر کیا ہوا------------ پھر کیا------------ ہوا---------- یہ میں کہاں نکل آیا۔ میں حیران ہوا اور پھر جلدی ہی میں نے اپنے آپ کو روکا۔ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب میں منّن تھا اور میمونہ---------- خیر میمونہ تو میمونہ ہی تھی اگرچہ کبھی کبھی پھوپھی اماں اسے مموں کہہ کر پکارتی تھیں۔ مگر میاں جان فوراً ٹوکتے۔ "بہن، کیوں ہماری بیٹی کا نام بگاڑ رہی ہو۔ اتنا تو خوبصورت نام ہے۔" بہرحال میں ان دنوں منّن تھا اور یہ دھیان کر کے مجھے کتنا تعجب ہوا۔ وہ تو مجھ سے بالکل مختلف تھا۔ جیسے کوئی اور ہی آدمی ہو۔ یا میں نے سوچا، میں کوئی اور آدمی ہوں۔ جیسے وہ اور قالب تھا اور اب میں اور قالب میں ہوں

اور اچانک مجھے ایک شک نے آلیا۔ ایک تشویش بھرا شک۔ کہیں میں بھی آدمی سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ "پھوپھی اماں، جان عالم تو آدمی تھا۔ بندر کیسے بن گیا۔"

"عقل پہ پتھر جو پڑ گئے تھے۔ بخت مارے کو عقل آئی بھی تو بندر بننے کے بعد آئی۔ پھر تو اس نے ایسی تقریر کی کہ کیا کوئی آدمی کرے گا۔ مغز سے اتار کے ایسی ایسی باتیں کیں کہ دنیا دنگ رہ گئی"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خلقت حیران، حاکم پریشان کہ اے لو بندر بھی کلام کرتا ہے اور ادھر ملکہ نے طوطے کی گردن مروڑ پنجرا باہر نکالا، بندر سوداگر کی گود میں لیٹ طوطے کے قالب میں پرواز کر آیا۔ طوطا پھڑکا، ملکہ کا خوشی سے دل دھڑکا۔ پنجرہ اندر کھینچ لیا۔ سب نے متفق ہو یہی کہا، بسکہ بندر عقیل تھا، یہ پیام طلب کوس رحیل تھا، اپنا قتل جو ثابت ہوا خوف سے مرگیا، داغ تقریر ہمارے صفحہ دل پہ دھر گیا۔ پھر ملکہ مہر نگار نے وزیر زادے سے کہا۔ "ایک بکری کا بچہ خوبصورت سا ہمیں بھیج دو۔ پالیں گے، رنج کو ٹالیں گے۔" یہ بچہ بہت خوش ہوئے۔ اسی وقت بربری کا بچہ تحفہ بھجوا دیا۔ تب ملکہ نے پنجرہ اس ہمائے اوج سلطنت کا پلنگ کے پاس رکھ لیا۔ جب وہ نابکار روبرو آیا، ملکہ نے بچے کو گود میں اٹھا کے اس زور سے دبایا کہ وہ مرگیا۔ اس کا مرنا، اس کا نالہ و فریاد کرنا۔ کارخانے مسبب الاسباب کے مشہور و معروف ہیں۔ وہ پلنگ پر لیٹا، اپنی روح بکری کے بچے کے قالب میں لایا۔ سوچا، دو گھڑی ملکہ کی طبیعت بہل جائے، پھر روح اپنے قالب میں لے جاؤں گا۔ مطلب تو نکل آئے۔ یہ نہ سمجھا فلک کی گھات ہے، فریب کی بات ہے، چرخ کو کچھ اور چکر منظور ہے، اب اس جسم کے نزدیک جانا بہت دور ہے۔ القصہ یہ تو ادھر اس خیال میں رہا، ادھر شہزادہ جان عالم پنجرہ سے یہ تماشا دیکھتا تھا۔ قالب کو خالی پایا۔ فوراً اپنی روح اپنے جسم میں لایا۔ منہ سے الااللہ کہا، اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آگے یاد نہیں آرہا تھا۔ اسی یاد نہ آنے نے مجھے اپنی اس رو سے باہر آنے میں مدد دی۔ ذہن کون سے رستے پہ پڑ لیا۔ یہ تو کہانی ہے، میں نے سوچا اور میں واقعہ کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا اس وقت کو جب وہ واقعہ، جو بھی واقعہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خیر، کب کی سنی ہوئی اور کب کی پڑھی ہوئی کہانی کب یاد آئی ہے، میں حیران ہوا۔ خیر پڑھی تو بہت بعد میں تھی، پہلے تو سنی تھی۔ شہزادہ جان عالم کی

کہانی، پھوپھی اماں کی زبانی۔ بندر ہاتھی پہ سوار ہے اور تقریر کر رہا ہے، ایسی تقریر کہ وہ ہنستا ہے تو لوگ ہنستے ہیں، وہ روتا ہے تو لوگ روتے ہیں۔ اتنے لوگ، ایک پوری خلقت، ایک بندر کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے، میں یوں ہی سوچنے لگا، جانے کون بندر کب ہاتھی پہ سوار ہو کر تقریر کرنی شروع کر دے اور لوگ اس کا کلمہ پڑھنے لگیں۔ بندر کو، میں نے سوچا، اپنے مقام پر رہنا چاہئے اور آدمی کو اپنے جامے میں بلکہ اپنی کھال میں۔ بندر جب ہاتھی پہ بیٹھ جائے اور آدمی کھال میں نہ رہے اور قالب بدل لے تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر خیر جان عالم اپنی کھال میں نہ رہنے کی سزا بھگت کر مرپٹ کر، سبق سیکھ کر، اپنے قالب میں واپس آگیا تھا۔ مگر ہر کوئی واپس نہیں آتا۔ خیر جب وہ اتنے دنوں بعد اپنے قالب میں واپس آیا ہوگا تو اسے کیسا لگا ہوگا۔ جیسے مسافر لمبا سفر کر کے، بن بن کی خاک چھان کر، ہرج مرج کھینچ کر، اپنے دیس میں واپس آئے۔ واپسی پر اسے کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔ پر کیا خبر ہے کہ اسے بندر والی جون یاد آتی ہو کہ کیا خوب تھے، درختوں پہ آزادانہ کودتے، شاخوں میں جھولتے تھے یا شاید کبھی طوطے کے قالب کی یاد ستاتی ہو کہ کیا سندر قالب تھا، ہرے ہرے تھے، گلے میں کنٹھی، چونچ لال چہچہا۔ دن بھر بس چہچہانا، بے فکری سے دانہ چگنا، خوش رہنا۔ طوطا نو سٹالجیا۔ اس سے بڑھ کر بندر نوسٹالجیا۔ یاد ایام عشرت فانی کہ جب بندر تھے، جانو قلندر تھے، کھال کے اندر رہتے تھے مگر جب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر خیر میں نے اپنے آپ کو تھام لیا، بھٹکتے ذہن کو جیسے تیسے قابو میں لایا۔ یہ میں کس قصے میں پڑ گیا، میں نے اپنے آپ کو روکا ٹوکا۔ میں تو اس وقت کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب میرے ساتھ وہ واقعہ، جو بھی واقعہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ کہانی ہے۔ بھلا اس کہانی میں، میں کہاں سے آگیا۔ خیر میں کی بات تو جانے ہی دو، میں نے سوچا۔ "وہ" کے پردے میں بھی تو کبھی کبھی "میں" چھپا ہوتا ہے۔ آخر من جواب میرے لئے "وہ" ہے، میں ہی تھا۔ آدمی جب بدلنے پہ آتا ہے تو ایسا بدلتا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ جیسے نل بدل گیا تھا۔ بالکل ہی دوسرا آدمی بن گیا تھا۔ دمینتی جو اسے اتنا چاہتی تھی وہ بھی اسے نہیں پہچان پا رہی تھی۔ بیچاری یہی سوچتی تھی کہ وہ نل تو اتنا سندر تھا۔ یہ بدصورت آدمی وہ نہیں ہو سکتا۔ پھر کون ہے اور وہ کہاں ہے؟ جیسے من کتنا خوبصورت تھا۔ جیسے وہ جنم اور ہو اور جون

دوسری ہو۔ خیر جنموں کا چکر اور ہے۔ اس میں تو "میں" اس طرح "وہ" بنتا ہے کہ غائب ہی ہو جاتا ہے۔ کس کو یاد رہتا ہے کہ میں پہلے وہ تھا۔ یاد رہے تو مہاتما بدھ نہ بن جائے۔ تو ہے بھکشوؤ، ایک بندر ورشا میں بھیگتا بھاگتا آیا اور اسی ٹہنی پہ آکے بیٹھا۔ مینا نے اپنے گھونسلہ سے سر نکالا اور ترس کھاتے ہوئے کہا کہ ہے باندر، تو نے بھلے سے میں گھر بنالیا ہوتا تو آج کیوں ورشا میں بھیگتا۔ باندر نے سمجھا کہ مینا اسے نکھرے ہونے کا طعنہ دے رہی ہے۔ کھسیانا ہوا اور اسی کھسیان پٹ میں اس کا گھونسلہ کھسوٹ ڈالا۔ مینا پچھتائی کہ اس ناسمجھ کو سمجھ سکھانے کی کیوں کوشش کی۔ پھر نر مادہ دونوں ورشا میں بھیگتے ہوئے اڑ گئے۔ تتھاگت چپ ہوئے پھر بولے، ہے بھکشوؤ وہ مینا میں تھا۔ بھکشوؤں نے اچرج کیا، تتھاگت تم، تم نے اس ناستک باندر کے ہاتھوں یہ دکھ بھوگا؟ ہاں میں، بس میں نے اسی گھڑی پران چھوڑ دیئے۔ پھر میں نے طوطے کے روپ میں جنم لیا۔ تو ہے بھکشوؤ، یہ اس سمے کی بات ہے جب میں یہ میں نہیں تھا، طوطا تھا۔ ان دنوں ٹکشیلا سے پرے ایک گھنی بنی تھی۔ وہاں ایک برکش کی ایک کھکھل میں اس طوطے نے اپنا گھونسلہ بنایا۔ پر پھر ایسا ہوا کہ ایک سانپ بھی آکر اسی برکش کی ایک کھکھل میں رہنے لگا۔ طوطے نے یہ دیکھا تو اپنی طوطی سے کہا کہ ہے میری پتنی، ایک زہری سانپ ہمارے پڑوس میں آکر بس گیا ہے اور ہماری شانتی میں اس نے بھنگ ڈال دیا ہے۔ ہماری بھلائی اب اسی میں ہے کہ اس برکش سے اپنا ڈیرا اٹھائیں اور کسی بھلے سے برکش کی کسی ڈال پہ، کسی کھکھل میں اپنا ٹھکانہ بنائیں۔ طوطی نے یہ سن کے بلاپ کیا اور بولی کہ ہے سوامی ہم نے تنکا تنکا جمع کرکے یہ گھونسلہ بنایا تھا۔ اب جب میں انڈے دینے کو تھی اور یہ گھونسلہ آباد ہونے کو تھا تو یہ کلوا سانپ یاں پہ آن بسا اور تم کہہ رہے ہو کہ اس برکش سے سدھار کر ہم کسی اور برکش میں جاکر اپنا ٹھکانہ کریں۔ ہے سوامی، تنک سوچو کہ میں نے یہ گھونسلہ بنانے کے لئے کتنے دکھ سہے۔ اب میں اپنے بنے بنائے رستے بستے گھونسلہ کو دم کے دم میں کیسے چھوڑ دوں۔ یہ سن طوطے نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ کہا کہ ہے پتنی ہم نے اپنے ان گول گول نینوں سے کتنے گھونسلے اجڑتے ویران ہوتے دیکھے ہیں۔ تو اپنے ایک گھونسلہ کی بات کرتی ہے۔ آنکھیں کھول کے اردگرد گھونسلوں اور گھروں کی دشا کو دیکھ۔ چاروں دشاؤں میں آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ برہمانڈ جل رہا

ہے۔ گھر، گھونسلے، برکش، بن، بستیاں، نگر، محلے، محل دو محلے سب آگ کی لپیٹ میں ہیں اور بھکشو یہ سوچ کے دکھی ہوئے کہ بدھ سینتوجی کو طوطے کے جنم میں بھی سکھ نہ ملا۔ پھر گھر سے بے گھر ہو گئے اور بدھ جی نے کہا، ہے بھکشوؤ، کسی جنم میں چین نہیں ہے اور کوئی بستی سدا بسی نہیں رہتی اور ہر گھر جو بستا ہے، اجڑنے کے لئے بستا ہے۔ شتابدیوں پہلے کی بات ہے۔ تب کی جب میں نے بیل کا جنم لیا تھا اور ورناری کے راجکمار کے رتھ میں جتا پھرتا تھا۔ پھر ایک نئے جنم کی کتھا آرمبھ ہو گئی۔ وہ مہاتما جنموں کی بات کس سادگی سے سناتا تھا، فر فر۔ جیسے اچھے بچے پہاڑا سناتے ہیں مگر ناگیشری رانی خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ راجہ کے پاس گئی۔ بولی کہ ہے میری سوامی، آج دن اچھا نہیں چڑھا۔ مجھے بیٹھے بیٹھے جانے کیا ہوا کہ بس ایک ساتھ پچھلا جنم یاد آگیا۔ راجہ دھرم دت چنتا میں پڑ گیا۔ پھر بولا، ہے رانی! میرے ساتھ بھی آج یہی ہوا۔ بس بیٹھے بیٹھے پچھلا جنم یاد آگیا۔ یہ سن کے ناگیشری رانی روئی اور بولی کہ "ہے راجہ، یہ برا شگن ہے۔"

"کیسے برا شگن ہے۔"

"ہے مہاراج، بات یہ ہے کہ پچھلا جنم یاد آجائے تو پھر سنانا پڑتا ہے اور سناؤ تو اس سے مرتیو ہو جاتی ہے تو اب میں تو اپنے پچھلے جنم کا حال سنائے بنا رہ نہیں سکتی۔ پر تم سنتے رہنا۔ اپنی مت سنانا۔"

"ہے میری رانی! یہ تو بہت کٹھن کام تو نے مجھے بتایا۔ پچھلا جنم یاد آگیا ہے تو میں اسے سنائے بنا رہ نہیں سکتا۔"

"اچھا، یہ تو بہت مشکل آپڑی، پھر کیا ہوگا؟"

"بس جو ہو سو ہو۔ اب ہمیں اپنا اپنا پچھلا جنم یاد آگیا ہے تو ایک دوسرے کو سنائیں اور ہونی کے لئے تیار رہیں۔"

ناگیشری رانی دیر تک چپ رہی، پھر بولی۔ "ہے راجہ! پچھلے جنم میں ہم ہنس ہنسنی تھے۔ میں ہنسنی، تم راج ہنس!"

"ہے رانی، پر یہ تو سوچ کہ ہم ہنس ہنسنی بنے کیسے تھے۔ اس سے پہلے جنم میں تو ہم کچھ اور تھے۔ میں منتری تھا تو منتری کی استری تھی۔"

"ہے میں مرجاؤں، سوامی تمہیں اس سے پہلا جنم بھی یاد آگیا ہے۔ یہ تو بہت

برا ہوا۔"

"میری رانی، اب تو جو ہوا وہ ہوگیا۔ تو ہاں ہم اس جنم میں بھی پتی پتنی تھے۔ راج پاٹ کے بکھیڑوں سے جب میں بہت تھک گیا تو میں نے سوچا کہ تیرتھ کر آئیں۔ پر ہم رستے میں تھے کہ بٹ ماروں نے ہمیں آلیا۔ ہم نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ وہ ہماری عزت آبرو پہ ہاتھ ڈالیں ہمیں جل مرنا چاہئے۔ تو ہم نے بن کی لکڑیاں اکٹھی کر کے انہیں سلگایا اور آگ میں اتر گئے۔ پر اسی آن ایک ہنس ہنسنی کا جوڑا آکاش میں اڑا جارہا تھا۔ کیسے سندر تھے وہ۔ پر ایسے مانو چاندی کے پتر ہوں۔ پنجے جیسے سونے کے ہوں۔ چونچ مونگے کی طرح کی۔ ہم آگ کو تو بھول گئے، اس جوڑے کو تکنے لگے، ان پر موہت ہو گئے تو بس پھریوں ہوا کہ ادھر ہمارے پران گئے اور ادھر ہم نے ہنس ہنسنی کے روپ میں جنم لے لیا۔ دور دور تک کی اڑانیں لیتے تھے۔ آکاش کا پتہ لاتے تھے اور پوتر پانی والی جھیلوں پر اترتے تھے۔ پر ایک دن ایسا ہوا کہ ہم اڑے چلے جارہے تھے کہ آندھی آگئی، جھکڑ چلنے لگے۔ دھرتی سے انبر تک دھول ہی دھول۔ اس میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ جب آندھی نکل گئی اور دھول بیٹھ گئی تو میں حیران کہ میری ہنسنی کہاں گئی۔ ڈھونڈتا پھرا، تال تلیوں کو چھان ڈالا، تم نہ ملیں۔ پھر میں نے ایک لمبی یاترا کی اور مانسرودر جھیل پر گیا۔ اے لو تم وہاں موجود تھیں۔ مانسرودر کے موتی جیسے چمکتے پانی میں مزے سے تیر رہی تھیں۔"

ناگیشری رانی مانسرودر کے دھیان میں کھو گئی۔ پھر ٹھنڈا سانس بھرا، بولی۔

"سوامی! وہ دن کتنے اچھے تھے مانسرودر جھیل پہ منڈلاتے تھے۔ میں ہنسنی تم راج ہنس۔ سندر پوتر تھا وہ جنم۔ میرے سوامی آدمی کے جنم کو بہت بھوگا۔ چلو ہم پھر اپنے اسی جنم میں چلیں کہ راج پاٹ کے بکھیڑوں سے چھوٹیں اور اس چھل فریب کے جیون سے چھٹکارا ملے۔ موتی کی طرح چمکتی مانسرودر جھیل ہو۔ ٹھنڈا میٹھا لرس لیتا پانی، پوتر وایو، پریم بھری دھرتی، سندر انبر اور ہم۔" اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ مندتی چلی گئیں، اس کی بھی راجہ دھرم دت کی بھی------------ تو گویا یہ اس وقت کی بات ہے جب ناگیشری رانی کو اپنا پچھلا جنم یاد آیا تھا اور موت اچانک اس کے سر پہ منڈلانے لگی تھی۔ مگر یہ بھی خوب ہے کہ پچھلا جنم یاد آجائے تو اسے سنائے بغیر

چارہ نہیں اور سنا دو تو پھر موت سے مفر نہیں۔ "میمونہ! تمہیں وہ سادھو یاد ہے جو کہتا تھا کہ مجھے اپنا پچھلا جنم یاد ہے۔" مگر وہ پھر گیا کہاں؟ اس کے بعد وہ نظر تو آیا نہیں۔

"مہاراج، یہ کب کی بات ہے۔"

"بچو، یہ اس سمے کی بات ہے جب میں دوارکا میں رہتا تھا۔"

"دوارکا میں؟"

"ہاں دوارکا میں!" بس پھر وہ شروع ہو گیا۔ "یہ شتابدیوں پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں کی جب اس نگر میں ہن برستا تھا۔ شانتی، سکھ، آنند!" مگر گنیش تو واں پہ ان دنوں بھی سکھ میں نہیں تھا۔ سب خوش تھے، بس ایک وہی خوش نہیں تھا۔ جو بھول نہیں پاتے وہ کبھی خوش نہیں رہتے۔ وہ متھرا نگری کو بھول نہیں پا رہا تھا۔ آخر دم تک بھول نہیں پایا اور جب دوارکا کے برے دن آئے تو پھر تو اسے اپنی چھوڑی ہوئی نگری زیادہ ہی یاد آنے لگی۔ پر یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابھی آنند کی ندی چڑھی ہوئی تھی۔ نرناری سکھی تھے، پریم کی گنگا بہتی تھی۔ دھرتی سے امبر تک انہد راگ کی گونج مگر گنیش کو متھرا نگری کے چھٹنے کا دکھ کھائے جا رہا تھا۔ اس نگری کی گیّاں اور گلیاں ہر آن ہر گھڑی اس کی آنکھوں میں پھرتی تھیں۔ نسدن وہی ایک دھیان کہ جیسے سویرے منہ اندھیرے دوسروں کی گیوں کے ساتھ وہ بھی اپنی گیّا کو لے کے گلی سے نکل رہا ہے۔ جیسے جھٹپٹا ہے اور گودھول ہے اور موہن کی مرلی باجتی ہے اور گوپیاں بیکل ہو کے اپنی اپنی ڈیوڑھی میں آکھڑی ہوئی ہیں۔ مرلی کی آواز، وہ سوچتا، انہیں کیسا موہت کر دیتی تھی۔ گیّوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجتی رہتیں۔ ان کے گلابی گلابی تھنوں سے نکلتی دودھ کی سفید سفید دھاریں اس کی آنکھوں پھرتی رہتیں۔ کتنا دودھ نکلتا تھا ان سے کہ گھر کی ساری مٹکیاں بھر جاتی تھیں اور روز گھر میں کھیر پکتی۔ یہ سب کچھ کبھی ایسے یاد آتا جیسے یہ پچھلے جنم کی بات ہے اور کبھی ایسے جیسے کل کی بات ہے، کبھی ایسے مانو خواب دیکھ رہا ہے کبھی ایسے کہ جانو وہ اس نگری کی گلیوں میں چل پھر رہا ہے۔ کبھی برہ کے برس ایسے لگتے جیسے شتابدیاں بیت گئی ہیں، کبھی یوں دکھائی دیتا کہ ابھی ابھی وہ متھرا سے نکلا ہے۔ خیر شروع کے دنوں میں تو اور متھرا باسیوں کو بھی اپنا نگر بہت یاد آتا تھا۔ پر دوارکا کے سکھ نے دھیرے دھیرے کر کے

متھرا کے دکھ کو بھلا دیا۔ جیسے دھیرے دھیرے انہیں صبر آتا جا رہا ہو۔ یہ بات دل میں گھر کر چلی تھی کہ اب ہم یادووں کو دوارکا ہی میں رہنا ہے۔ متھرا نگری کبھی کبھی ایسے یاد آتی جیسے بسرا سپنا یاد آتا ہے۔ دوارکا کے بازاروں گلیوں میں اتنی گھما گھمی تھی، اتنا آنند تھا کہ یاد آیا سپنا پھر بسر جاتا۔ ہولے ہولے بالکل ہی بسر گیا۔ سب متھرا باسی نئے نگر کے آنند میں مگن ہو گئے۔ متھرا کو یاد کرنے کے لئے اکیلا گنیش رہ گیا۔

پر اب سے بدل چکا تھا۔ دوارکا نگر سنکٹ میں تھا اور اس کی گیاں اب گدھیا کے بچے جننے لگی تھیں اور ایک دن پرکاش نے آکر نرالی خبر سنائی۔ "گنیش بھیا! تم نے کچھ سنا۔"

"کیا؟"

"ہے بھیا کتنے اچرج کی بات ہے کہ بکری کتیا بن گئی۔"

"پرکاش! تیری مت تو نہیں ماری گئی۔ لو بولو بکری کتیا بن گئی، اچھی اڑائی۔"

"بھیا میں سچی کہہ رہا ہوں۔ ایسے ہوا کہ بڑی بزریا سے بکریوں کا ایک ریوڑ گزر رہا تھا۔ اچانک ایک بکری ریوڑ سے ٹوٹ کر ممیاتی ہوئی ایک طرف کو بھاگی۔ ممیاتے ممیاتے اس نے اچانک بھونکنا شروع کر دیا۔"

گنیش کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "پرکاش! یہ تو انہونی بات ہے۔"

"ہاں انہونی تو ہے۔ جب ہی تو سب اچنبھے میں ہیں، خالی اچنبھا نہیں، لوگ سہم گئے ہیں۔"

پھر انہونی باتیں ہوتی چلی گئیں۔ ایک گنجے سر والا کالا کلوٹا لمبا تڑنگا آدمی جانے کہاں سے آیا۔ لوگوں نے تو بس اسے دوڑتے ہوئے دیکھا۔ دم کے دم میں پورے نگر میں گھوم گیا۔ سورماؤں نے اس پر تیر چلائے۔ تیر اسے لگے بھی، پر کسی تیر سے وہ گھائل نہیں ہوا۔ پھر ایک گلی میں جا کر اچانک غائب ہو گیا اور پھر یوں ہوا کہ نگر کے بڑے مندر کے اندر سے گیدڑوں کی چیخیں سنائی دیں اور پوجا ستھان میں پوجاریوں نے دیکھا کہ ایک بڑا سوئر بیٹھا ہے۔ جس نے سنا سناٹے میں آگیا۔ ہے رام یہ کیا ہو رہا ہے اور پھر ایک اپسرا دیکھی گئی جو اونچی آواز سے کہتی جاتی تھی کہ ہے دوارکا باسیو، تیرتھ پر جاؤ۔ دوارکا باسیوں نے اپسرا کی آواز کو آکاش وانی جانا اور ترنت تیار ہو، تیرتھ کے لئے

چل پڑے۔ پر وہ آواز تو موت کا بلاوا بن گئی۔ وہ تیرتھ یاترا تھی یا موت یاترا۔ ایک استھان پر یاتریوں کو ہری ہری گھاس دکھائی دی تو وہیں انہوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ کھایا پیا' ڈٹ کر دارو پی۔ نشہ نرالے رنگ سے چڑھا کہ ایک دوسرے کو للکارنے لگے۔ جو سورما کورو کشیتر میں ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے' انہیں وہ لڑائی یاد آ گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف کرودھ کیا۔ بس دیکھتے دیکھتے ان پہ خون سوار ہوا۔ ایک دوسرے پہ پل پڑے۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے۔ ہری ہری گھاس خون سے لال ہو گئی۔

انہیں دنوں گنیش کے بالپن کا سنگھی نریندر متھرا سے چل کر ہرج مرج کھینچتا دوارکا پہنچا۔ گنیش اسے گلے ملا اور متھرا کو یاد کر کے رویا۔

"گنیش!" نریندر کہنے لگا۔ "تو نے تو یاں پہ آ کے اپنے سارے بال سفید کر لئے۔"

"متر، یہ بھی تو دیکھ کہ تب سے اب تک سے کتنا بیت گیا ہے۔" گنیش نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ سے کی بات کرتے کرتے بیتا سے اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ متھرا نگری کی گلیاں، گیاں' گودھول' گوپیاں۔ "ہے متر، متھرا نگری کا کیا حال ہے؟"

"گنیش!" نریندر اداسی سے بولا۔ "متھرا نگری کا حال مت پوچھ ---------- وہ نگری رانڈ ہو گئی۔ جن کے دم سے اس کا سہاگ بنا ہوا تھا' وہ اسے چھوڑ گئے۔ اب وہاں نہ موہن کی مرلی باجتی ہے نہ پریم کی بانی گونجتی ہے نہ گوپیوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ گلیوں میں دھول اڑتی ہے۔ گوپیاں اداس ہیں' گیاں دبلی ہو گئی ہیں۔ جانے والے واں کی شوبھا اپنے سنگ لے گئے۔ اب وہ نگری اجاڑ ہے۔"

گنیش یہ سن رویا۔ نریندر بھی یہ حال سنا کر بہت دکھی ہوا' پھر بولا۔ "تم لوگوں نے متھرا کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ تم نے نیا نگر آباد کر لیا۔ نئے نگر میں تم چین کی بنسری بجاتے ہو۔ واں پہ ہم ہونق بنے پھرتے ہیں اور کشٹ کھینچتے ہیں۔"

"متر!" گنیش نے دکھی ہو کر کہا۔ "تجھ سے کس نے کہا کہ یہاں پہ ہم چین کی بنسری بجاتے ہیں۔ ہاں بجاتے تھے' پر اب نہیں۔ سکھ کے دن بیت گئے۔ اب ہم سنکٹ

میں ہیں۔ دوار کا میں اس سے اندھکار مچا ہے۔ گلیوں، بازاروں میں سرکٹے گھومتے ہیں۔ بکریاں بھونکتی ہیں، گائیں رینکتی ہیں۔ مندروں سے گیدڑوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ہون استھانوں میں سوئر بیٹھے اور چوہے دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔"

"گنیش! تو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے اپنے کانوں پہ اعتبار نہیں آرہا۔ ہم تو واں بیٹھے یہ سوچا کرتے تھے کہ دوار کا میں شردھا کی ورشا ہوتی ہے۔ شانتی ہے، پریم ہے، سکھ اور آنند ہے۔"

"تھا، پر اب نہیں۔ یاں کے سورما کورو کشیتر میں لڑنے گئے تھے۔ واں پہ وہ آپس میں بٹ گئے اور ایک دوسرے کے خلاف لڑے۔ واں سے وہ پھرے تو کرودھ کی آگ میں جل رہے تھے۔ خون ان کے سر پہ سوار تھا۔ انت کار وہ رنگ لایا۔ انہوں نے شانتی اور پریم کی اس نگری کو کورو کشیتر بنا دیا۔ نریندر، دوار کا اجڑ چکا ہے۔"

"پر متر، یہ تو عجب بات ہے۔ مرغی اپنی جان سے گئی، کھانے والوں کو سواد نہیں آیا۔ متھرا بھی اجڑ گیا اور دوار کا بھی۔ اب سکھ آنند میں نہیں۔" نریندر رکا اور جھجکتے جھجکتے بولا۔ "گنیش! ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھ!"

"سری کرشن مہاراج تو بہت بدھیمان ہیں، بہت گیانی ہیں۔ انہوں نے کیا سوچ کر متھرا چھوڑا تھا؟"

"نریندر، تو نے میرے دل کا چور پکڑ لیا۔ یہ پرشن تو مجھے بھی بیکل رکھتا ہے۔"

"شاید!" نریندر رکتے رکتے بولا۔ "شاید انہوں نے اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر ----------- شاید ------------"

"صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ اچھا نہیں کیا۔"

"پر اب وہ کیا کہتے ہیں، کیا سوچتے ہیں؟"

"اب کیا کہتے ہیں؟" گنیش کڑوی سی ہنسی ہنسا۔ "اب وہ کیا کہیں گے۔ کہتے کچھ نہیں۔ پر مجھے لگتا ہے کہ وہ خوش نہیں ہیں۔ مرلی تو وہ متھرا ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ یاں آکر گدا چکر بھی ان سے چھن گیا۔"

"کیا کہا؟" نریندر اچھل پڑا۔ "گدا چکر چھن گیا، یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ کون مائی کا

لال ان سے ان کا گدا چکر چھین سکتا ہے۔"

"کسی مائی کے لال نے نہیں چھینا۔ آکاش سے آیا تھا، آکاش میں چلا گیا۔ پتہ ہے کیا ہوا، بھگوان کا رتھ اپنی آن بان سے چلا جارہا تھا کہ تین اپسرائیں اوپر سے آئیں۔ انہوں نے رتھ کا جھنڈا اتار لیا۔ ابھی وہ یہ کرتی تھیں کہ بھگوان کے ہاتھ سے گدا چکر نکلا اور آکاش میں جا کے کھو گیا۔"

نریندر سنانے میں آگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ گنیش خود ہی بولا، کچھ ڈری ڈری آواز میں۔ "نریندر! یہ اچھے اشارے نہیں ہیں۔ لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔"

"اتنا کچھ تو ہو گیا، اب اور کیا ہو گا؟"

"لگتا ہے کہ ابھی اور بہت کچھ ہونے والا ہے۔"

"کیا ہونے والا ہے؟"

"یہ تو کوئی گیانی ہی بتائے گا۔ کتنی دفعہ میں نے سوچا کہ گورو شمبھو مہاراج کے پاس جاؤں اور پوچھوں کہ مہاراج یہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟"

"گورو شمبھو مہارج!" نریندر چونکا۔ "کیسے ہیں ہمارے گورو، اب تو بہت بوڑھے ہو گئے ہوں گے؟"

"بس ہڈیوں کی مالا بن کے رہ گئے ہیں۔ بال سفید سن جیسے، پلکیں جیسے آنکھوں پہ برف جمی ہو۔"

"گنیش چل، گورو کے درشن کو چلتے ہیں۔"

دونوں واں پہ گئے اور گورو کے چرن چھوئے۔ گنیش نے کہا۔ "گورو جی، آپ کا ایک شش متھرا نگری سے آیا ہے۔"

"متھرا نگری سے؟" گورو مہاراج نے اپنی سفید پلکیں کھولیں۔ "وہ کون ہے؟"

"مہاراج، نریندر! آپ کا پرانا شش۔"

"نریندر!" گورو نے اپنی یاد پہ زور ڈالا۔ "اچھا، اچھا میں سمجھا، نریندر ہے۔ پتر تیرا کیا حال ہے۔ متھرا نگری کا کیا حال ہے؟"

"مہاراج! میں اچھا ہوں۔ پر متھرا نگری کا حال اچھا نہیں۔ ہم اب ایک اجڑے نگر کے باسی ہیں۔"

"اوم تت ست!"

"گورو مہاراج!" گنیش نے رکتے رکتے کہا۔ "دشا تو اب دوارکا کی بھی اچھی نہیں ہے اور نریندر نے مجھ سے ایک نرالا ہی سوال پوچھ ڈالا ہے۔ پوچھتا ہے کہ ہمارے بڑوں نے کیا سوچ کے متھرا نگری کو چھوڑا تھا؟"

"پترو!" شمبھو مہاراج بولے۔ "سب کال کا چمتکار ہے۔ ہم تم اس کے آگے بے بس ہیں۔ ہم سو جاتے ہیں، پر کال جاگتا رہتا ہے۔ پھر وہی ہمیں جھنجھوڑ کے جگاتا ہے کال مہابلی ہے، ہم نربل ہیں، اس کے آگے بے بس ہیں۔ ہم مورکھ سو جاتے ہیں۔ وہ جاگتا رہتا ہے۔ پھر وہ ہمیں جھنجھوڑ کے جگاتا ہے اور جب ہم جاگتے ہیں اور آنکھیں مل کے اپنے چاروں اور دیکھتے ہیں تو سب کچھ بدل چکا ہوتا ہے۔ اوم تت ست!"

"اوم تت ست!" گنیش بڑبڑایا اور بولا۔ "ہے گورودیو، سب کچھ بدل گیا ہے، سب کچھ۔ ہم سوتے میں پکڑے گئے۔" پھر سوچ کر بولا۔ "پر گورودیو، سری کرشن مہاراج تو خود کال کا روپ ہیں، وہ تو جاگ رہے تھے۔"

گورو شمبھو نے ٹھنڈا سانس بھرا، پھر بولے۔ "جب دروپدی کے پانچوں مارے گئے تو وہ بلاپ کرتی گندھاری ماتا کے پاس گئی۔ گندھاری ماتا اسے دیکھ یہ بولیں کہ ہے دروپدی، تیرے پانچ مارے گئے ہیں تو تو بلاپ کر رہی ہے۔ مجھے دیکھ کہ میں اپنے سو پوتوں کو بھی گنوا کے چپ ہوں۔ پھر اس نے کرشن مہاراج کی اور دیکھا اور کرودھ سے بولیں کہ ہے دیوکی کے جنے، تو وِس کی گانٹھ ہے۔ تو نے میری کوکھ اجاڑی ہے۔ سوچتر دیکھتا رہ، یادوستان بھی ایسے ہی اجڑے گی۔ بھگوان کرشن گمبھیرتا سے بولے کہ ہے ماتا، یادوستان کو اور کوئی نہیں اجاڑ سکتا، میں ہی اجاڑوں تو اجاڑوں۔ تو نے سراپ دے کے میرا کام آسان کر دیا۔" گورو مہاراج رکے، پھر بولے۔ "پترو، کرشن بھگوان کال اوتار ہیں اور گندھاری ماتا نے جس سمے کی چیتاونی دی تھی وہ سمے آخر کب تک ٹلے گا۔" پھر گورو مہاراج نے آنکھیں موند لیں اور بڑبڑانے لگے۔ "اوم تت ست، اوم تت ست، اوم تت ست!"

Scanned with CamScanner

اچھا تو یہ اس وقت کی بات ہے۔---------- اس وقت کی جب---------- ویسے تو ہر شہر کا ایک ہی انجام ہے۔ جیسے شہر اجڑنے ہی کے لئے بستے ہوں---------- تب عبداللہ یوں گویا ہوا کہ "اے یار عزیز، تو اپنے جدی شہر اشبیلیہ کے لئے صحیح روتا ہے۔ بستی بستے بستے بستی ہے مگر جب اجڑنے پہ آتی ہے تو دم کے دم میں اجڑ جاتی ہے جیسے میرے اجداد کا شہر قرطبہ اجڑا۔ پڑھا میں نے اپنے جد اکبر کے تذکرے میں جو زوال کے ہنگام لکھا گیا تھا۔ کچھوے کی پت سے کہ اس باعث صرف رات کے اوقات میں پڑھا جا سکتا تھا، ہاں تو میں نے پڑھا اس تذکرے میں کہ اس مبارک شہر میں جسے میرے جد نے عروس الاندلس کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ کوچہ و بازار بے شمار تھے۔ ہر موڑ پر ایک حمام، ہر کوچے میں ایک مسجد۔ مسجدوں کے بیچ مسجدوں کی ملکہ مسجد الاعظم کہ قرطبہ کی پیشانی پر جھومر کی مثال تھی۔ گرداگرد اس کے رونق بے حساب تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا، کٹورا بجتا تھا۔ اس سے پرے مدینتہ الزہرا میں صبح و شام نوبت بجتی تھی۔ پر جب یہ خوش بو شہر اجڑنے پہ آیا تو نہ کٹورے کا بجنا، نہ نوبت کی ٹکور، نہ اذان کی آواز، نہ نقیبوں کی پکار، رہے نام اللہ کا، لا غالب الا اللہ!" عبداللہ ٹھنڈا سانس بھر کر چپ ہو رہا مگر کسی قدر تامل کے بعد پھر بولا اور آغاز کلام یوں کیا کہ "اے مرے یار جانی، ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ تیرے آبگینہ دل کو ٹھیس نہ لگ جائے۔"

"میرے دوست! اب یہ دل آبگینہ نہیں۔ سنگ حوادث نے اسے چوٹیں کھانے کا عادی بنا دیا ہے۔ سو بے فکر ہو کر جو کہنا چاہتا ہے کہہ دے۔"

"اے یار! میرے جد اکبر نے اپنے شہر کو بہت یاد کیا۔ اردگرد سے بے خبر قرطبہ کے خوشبو کوچوں کو اپنی آنکھوں میں لئے پھرتا تھا اور مستقل روتا رہتا تھا حتیٰ کہ اس کی آنکھ بند ہو گئی۔ اس کا فرزند یعنی میرے جد کا جد مرد عاقل تھا۔ اس نے باپ کے حال تباہ کو دیکھ کر عبرت پکڑی اور اپنے بیٹے اور پوتے کو ایک روز اپنے پاس بٹھا کر یوں کہا کہ اے مرے فرزند اور اے مرے فرزند کے فرزند! تم نے اپنے جد کو دیکھا کہ قرطبہ کے غم نے اس کا کیا حال کیا اور کس طرح وہ اس دنیا سے رخصت ہوا۔ جان لو کہ شہر کی جدائی کا غم عورت کی جدائی کے غم سے بڑھ کر قاتل ہوتا ہے۔ جس نے دل کو یہ

غم لگایا سمجھو کہ وہ دین دنیا سے گیا۔ تو اے مرے بیٹو بیشک ہم قرطبہ کی مٹی ہیں مگر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اس کو فراموش کرو مبادا اس کی یاد تمہیں گھن کی مثال کھا جائے۔ اب غرناطہ ہی ہمارا قرطبہ ہے اور اے یار جو ہمارے جد بزرگ نے اپنے بیٹے سے اور بیٹے کے بیٹے سے کہا وہی میں تجھ سے کہتا ہوں۔"

یہ کلام سن کر ابن حبیب رویا اور بولا۔ "اے یار ناصح، اشبیلیہ کی یاد تو اب خود ہی میرا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ تجھے کیا بتاؤں کہ میرے ساتھ نیا واقعہ کیا گزرا ہے۔ اشبیلیہ میں جو میرا جدی گھر تھا، اس کا رستہ کل تک مجھ پر روشن تھا مگر جانے میرے ساتھ کیا واردات گزری کہ اب وہ رستہ میں بھول چکا ہوں۔"

عبداللہ چکرایا "میرے یار، تو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اشبیلیہ تو کب گیا تھا کہ اس دیار کا کوئی راستہ تجھے یاد ہوتا"۔

ابن حبیب پھیکی ہنسی ہنسا اور بولا۔ "اے یار میں جو کہتا ہوں اسے سچ جان! میں اپنے خوابوں میں اس اجڑے دیار میں اتنا چلا پھرا ہوں کہ اس کی ایک ایک راہ مجھ پر روشن تھی مگر رات میں نے عجب خواب دیکھا۔ جیسے میں اشبیلیہ گیا ہوں اور گلیوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ حیران ہو رہا ہوں کہ یا اللہ وہ گلی کون سی تھی جس میں داخل ہوتے ہی مجھے وہ بلند و بالا کھجور کا شجر نظر آتا تھا اور میرے قدم تیز تیز اس گھر کی طرف اٹھنے لگتے تھے۔ دور سے بلی مجھے دیکھتی اور لپک کر میری طرف آتی۔ میرے رب، وہ کھجور کا شجر کہاں اوجھل ہو گیا، بلی کو کیا ہوا، گھر کہاں کھو گیا۔ یہ سوچتا حیران ہوتا چل رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ آگے رستہ بند ہے۔ یاالٰہی اب کدھر جاؤں۔ اشبیلیہ میں بچھے گلیوں کے جال میں کوئی اندھی گلی بھی ہو گی، یہ بات تو کبھی میرے دھیان ہی میں نہیں آئی تھی۔ بس اسی عالم تذبذب میں تھا کہ کیا کروں، کدھر جاؤں کہ میری آنکھ کھل گئی۔" ابن حبیب بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ تامل کیا، پھر بولا۔ "پھر میں سو نہ سکا۔ وہ شاید پچھلا پہر تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد اذان کی آواز سنائی دی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا، دوگانہ ادا کیا اور پھر دونوں ہاتھ بلند کر کے بصد زاری دعا کی کہ بارالٰہا، مجھے وہ دن دیکھنے سے محفوظ رکھ کہ میں اشبیلیہ جاؤں اور میری مٹی مجھے پہچاننے میں تامل کرے اور میری گلیاں مجھے راہ دکھانے سے انکار کر دیں۔ پھر روتے روتے میری ہڑکی بندھ گئی۔" ابن حبیب

چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھ بھر آئی تھی اور آواز رندھ گئی تھی۔

عبداللہ کہ خاموشی سے سنتا رہا تھا اب بعد تامل کے یوں بولا کہ "اے ابن حبیب! میں تیرے درد کو سمجھتا ہوں۔ ایک اعتبار سے تجھے خوش نصیب بھی جانتا ہوں کہ تو غم ہجر کی دولت سے مالا مال ہے۔ ایک میں بیدرد ہوں کہ قرطبہ کو بھول کر غرناطہ میں خوش بیٹھا ہوں اور مجھ جیسے کتنے ہیں کہ ان کی خانہ خرابی نے انہیں اس شہر کی راہ دکھائی۔ غرناطہ نے انہیں پناہ دی، عزت دی، دولت دی مگر افسوس کہ ان سے درد کی دولت چھین لی۔ تو اے ابن حبیب ان کے مقابلہ میں تو خوش نصیب ہے کہ غرناطہ نے تجھے پناہ دی مگر تجھ سے درد کی دولت نہیں چھینی۔" عبداللہ نے تامل کیا، پھر بولا۔ "مگر اے ابن حبیب! جو ہم نے کیا وہی زندگی کا آئین اور زمانے کا دستور ہے۔ اسی آئین کا پاس کرتے ہوئے میرے جد کے جد نے اپنے بیٹے کو اور بیٹے کے بیٹے کو جد اکبر کی روش سے باز رہنے کی نصیحت کی۔ اولاد نے اس کی نصیحت کو پلے باندھا اور پھر غرناطہ ہی کو قرطبہ جانا اور اس مٹی اور ہوا میں رچتے بستے چلے گئے۔ اے یار! تیرے خواب کی بھی تعبیر یہی ہے۔ یہ اشارہ غیبی ہے یا تیرے باطن نے تجھ سے کہا ہے ہر حال مناسب یہ ہے کہ تو اس اشارے کو جان اور زندگی کے تقاضے کو پہچان۔"

یہ کلام سن کر ابن حبیب نے سر نیوڑھا لیا اور دیر تک خیالوں میں غلطاں رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور یوں بولا۔ "اے مرے یار غمگسار، تیرا مشورہ صائب ہے۔ پر تو نے یہ نہ بتایا کہ یادوں کے اس اثاثے کو جو میرا واحد اثاثہ ہے کہاں ٹھکانے لگاؤں۔ کاش کوئی ایسا مدفن ہوتا جہاں میں انہیں دفن کر سکتا۔ اے عبداللہ! عجب بات ہے کہ جب میں اس تیرے شہر میں وارد ہوا تھا تو میں بھی بکھرا ہوا تھا اور میری یادیں بھی تتر بتر تھیں۔ مجھے وہ شام خوب یاد ہے جب میں نے تیرے اس گرم تندور کے برابر بیٹھ کر اس شہر میں وارد ہونے کے بعد پہلی مرتبہ گرم روٹی کھائی تھی۔ جانے کون سے آٹے کی وہ روٹی تھی، وہ ذائقہ میری زبان پر آج بھی زندہ ہے۔ اس چھت کا میں احسان مند ہوں کہ اس کے نیچے بیٹھ کر اور اس تندور سے حرارت لے کر میں نے اپنے بکھرے وجود کو اپنی یادوں سمیت اکٹھا کیا اور عجب بات ہے کہ جتنا میں اس شہر میں رستا بستا گیا اتنی ہی یہ یادیں نمو پاتی گئیں تا آنکہ ایک پوری اقلیم بن گئیں جو میرے تصور

میں غرناطہ کے ساتھ پیوست ہے اور جس کے عین وسط میں ایک کھجوروں کے گچھوں سے لدا پھندا شجر کھڑا ہے اور ایک سیاہ بلی بیٹھی ہے۔ اب یہ دو جڑواں شہر ہیں مگر ----------" ابن حبیب نے تامل کیا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ----------" ابن حبیب پھر چپ ہو گیا۔

"اے ابن حبیب! تو رک کیوں گیا۔ کچھ بتا کہ کون سا خیال تجھے پریشان کر رہا ہے۔"

ابن حبیب نے تامل کیا اور پھر یہ کلمہ زبان پر لایا کہ "اے عبداللہ! میں یہ سوچ کر پریشان ہوں کہ یہ تیرا شہر تو بہت مہربان شہر تھا۔ پالنے والے کی قسم، میں نے اسے سمندر سے زیادہ وسیع القلب پایا تھا مگر اب اس نے مجھے ڈرانا کیوں شروع کر دیا ہے۔"

عبداللہ ابن حبیب کا منہ تکنے لگا۔ پھر تشویش بھرے لہجہ میں بولا۔ "اے میرے یار! تو نے آخر کیا دیکھا کہ خوف کا کلمہ زبان پر لایا۔"

"میرے دوست! یہی بات تو مجھے زیادہ پریشان کر رہی ہے کہ میں نے واضح طور پر کچھ نہیں دیکھا، پھر بھی ایک ڈر میرے اندر باہر منڈلا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو میں زیادہ ہی ڈر جاتا ہوں۔ پتہ نہیں یہ میرا محض وسوسہ ہے یا----------"

"یا----------کیا؟ دوست جو بھی تیرا وسوسہ ہے اسے بلا تامل واضح طور پر بیان کر۔"

"میرے عزیز، واضح طور پر میں تب بیان کروں جب خود مجھ پر کچھ واضح ہو۔ بس ایک اندیشہ سا میرے اندر پل رہا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، کبھی شام پڑے کبھی رات گئے کہیں آس پاس کوئی پرندہ پھڑپھڑایا ہے یا تیزی سے بازوؤں کی سنسناہٹ کے ساتھ میرے قریب سے گزر گیا ہے۔ اس کے پروں کی عجب نامبارک سی پھڑپھڑاہٹ ہوتی ہے کہ میرے اندر ایک سنسنی دوڑ جاتی ہے۔"

دھاڑ سے دروازہ کھلا۔ سٹریچر اور پیچھے پیچھے مجو بھائی کہ عجلت میں تھے اور سٹریچر والے کو ہدایت دے رہے تھے۔ ساتھ والے دوسرے آدمی کو اور نرس کو بھی ہدایات جاری کیں۔ ہدایات کچھ میرے بارے میں احتیاطیں برتنے سے متعلق تھیں۔

میں جیسے کوئی سارا کا سارا بکھر گیا ہو۔ ہوں، مجھے کیا۔ مجو بھائی جانیں ان کا کام جانے، میں نے سوچا۔ اور میں نے پھر سے اپنے آپ کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اچھا تو یہ اس وقت کی بات ہے، اس وقت کی جب غرناطہ کا ای جی کا زمانہ گزر چکا تھا اور-----------

"میاں احتیاط سے۔" مجو بھائی کہہ رہے تھے۔ "ویسے اپریشن تھیٹر کون سے فلور پر ہے۔" کبھی ایک بات، کبھی دوسری بات۔ مجو بھائی بولے چلے جا رہے تھے۔ ادھر شاید سٹریچر والوں کو جلدی تھی کہ مجھے یہاں سے اٹھائیں، کمرے سے نکالیں اور جلدی سے آپریشن تھیٹر پہنچائیں۔ میں بہت پریشان ہوا، اس وجہ سے نہیں کہ مجھے بے آرامی ہو رہی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ خیال کی رو تتر بتر ہو گئی تھی۔ اس پہ میرے مزاج میں درہمی پیدا ہونی ہی تھی۔ یہ سوچ کر میں برہم تھا کہ اصل بات تک میں پہنچتے پہنچتے رہ گیا ہوں۔ بس بال برابر کی کسر رہ گئی۔ جہاں اتنا کچھ یاد آیا تھا وہاں باقی بات بھی یاد آ جاتی اور پھر پتہ چل جاتا----------کیا پتہ چل جاتا----------میں چکنم میں پڑ گیا۔ مسئلہ کیا تھا، یہ کس تقریب سے میں اپنے ذہن کو کرید رہا تھا۔ اگر وہ وقت یاد آ جائے تو باقی بات بھی----------- کچھ ایسی ہی بات رفیق صاحب نے کی تھی۔ اصل میں، میں اس وقت یکسوئی کے ساتھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ سٹریچر پہ جو لیٹا تھا۔ لگ رہا تھا کہ چھکڑے میں بیٹھا ہوں اور بیل دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ آپریشن تھیٹر کب آئے گا، کتنی دور ہے، کون سے فلور پر؟ جیسے سرنگ میں جا رہا ہوں۔ جیسے گاڑی کسی اندھیری سرنگ سے گزر رہی ہو اور سرنگ ختم ہونے ہی میں نہ آ رہی ہو۔ "یہ گاڑی آخر رینگ کیوں رہی ہے۔" اندھیرے میں ایک آواز۔ "چل پڑی، یہی شکر کرو۔" دوسری آواز۔ "پچھلی سپیشل یہیں کٹی تھی۔ یہاں سے کسی طرح سے نکل جائیں"----------- "پھر تو گاڑی کو تیزی سے یہاں سے نکلنا چاہئے مگر وہ چیونٹی کی چال چل رہی ہے۔" گاڑی واقعی رینگ رہی ہے اور کس طرح سے چل رہی ہے جیسے میں سٹریچر پہ لیٹا ہوں-----------

(18)

اچھا میں زندہ ہوں۔ حیرت، ساتھ میں کسی قدر بے یقینی! کہیں بہت دور سے وہ میٹھی آواز آئے چلی جا رہی تھی۔ میری بے یقینی پر مسلسل یلغار کر رہی تھی۔ کوئل کی آواز بھی ایک طلسم ہوتی ہے۔ خود کوئل تو جیسے اور پرندے ویسے وہ ایک پرندہ! کوئی ایسا حسین پرندہ بھی نہیں ہوتا۔ کوے کی طرح بالکل کالی۔ کوئل ساری کی ساری اپنی آواز میں ہوتی ہے مگر یہ آواز آ کہاں سے رہی ہے۔ کتنی دیر تک یہ بات مطلق میری سمجھ میں نہ آئی کہ قریب یا دور کوئی درخت ہوگا جس کی ٹہنیوں میں چھپی بیٹھی ہوگی۔ لگتا تھا کہ خوابوں کی کسی اقلیم سے آواز آ رہی ہے۔ تب ہی تو پوری طرح یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں ہوں جو اپنے زندہ وجود اور حساس سماعت کے ساتھ یہ آواز سن رہا ہوں۔ ویسے بھی ابھی میں کم از کم آدھا سویا ہوا تھا مگر پھر بہت قریب سے بس جیسے میرے سرہانے کوئی پرندہ بہت عجلت میں اپنی تیز آواز میں چہچہایا۔ ایک دم سے میں نے آنکھیں کھولیں اور تھوڑا کروٹ لے کر اپنے سرہانے نظر ڈالی۔ پہلی مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ شیشے کے دریچے کے ادھر ایک ہرا بھرا درخت کھڑا ہے۔ اسی کے بیچ سے پرندہ بولا تھا۔ پھر کتنی ہی چڑیوں نے مل کر چہچہانا شروع کر دیا۔ اچھا تو صبح ہو گئی ہے۔ اور یہ کہ میں زندہ ہوں یا ہو گیا ہوں۔ ایک خوشی کی رو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے اندر پھیلتی چلی گئی۔ کتنی مسرت بھری حیرت کے ساتھ میں نے اس ہرے بھرے درخت کو

جس حد تک لیٹے لیٹے دریچے کے پیچھے سے دیکھ سکتا تھا، دیکھا۔ میری متجسس نظریں ٹہنیوں کے بیچ اس پرندے کو ڈھونڈ رہی تھیں جس نے چہک کر مجھے آدھے سوتے آدھے جاگتے والی کیفیت سے نکالا تھا اور میرے جی اٹھنے کی نوید مجھے سنائی تھی۔ مگر وہ نظر ہی نہیں آیا۔ ہاں گھڑی دو گھڑی بعد بازوؤں کے پھڑپھڑانے کی آواز آئی اور وہ چہکار معدوم ہو گئی۔ شاید میرا تجسس اسے بھایا نہیں۔ بہرحال اس نے اپنا فریضہ ادا کر دیا تھا۔ جیسے اب اسے یہاں کوئی کام نہ ہو۔ سو اڑ گیا۔

دروازہ کھلا۔ اور دروازے کے کھلتے ہی ایک اجلا چہرہ نمودار ہوا۔ اجلا چہرہ سفید گاؤن کے ساتھ۔ کمرے میں اجالا پھیل گیا واقعی صبح ہو گئی تھی۔ تھرمامیٹر ان انگلیوں کے بیچ کتنا خوب نظر آ رہا تھا۔ جھٹک کر میرے ہونٹوں کے بیچ سرکایا۔ پھر تھوڑی دیر بعد نکال کر اس کا جائزہ لیا اور سرہانے رکھی میز پر دھرے چارٹ پر کچھ لکھا اور جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے چلی گئی۔ بہرحال کمرے کی فضا اب یکسر بدل چکی تھی۔ جیسے شادابی کی ایک لہر دوڑ گئی ہو۔ اور کتنا اجالا پھیل گیا تھا۔ وہ جو ایک دھند لکا تھا وہ گھل گھلا گیا تھا اور اب صبح زیادہ اجلی دکھائی دے رہی تھی۔ کل تک تو مجھے صبح و شام کا، دن اور رات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ زندگی اور موت کے بیچ ایک نیم تاریک اذیت سے لبریز فضا میں رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ اسی عمل کے بیچ کسی وقت آپریشن کے عمل سے گزرا تھا۔ مگر اس ہنگام تو غشی کا عالم تھا۔ ہوش سمجھو کہ اب آیا تھا۔ تو ایک لمبی رات کے بعد یہ صبح چڑھی تھی۔ اور کیا صبح تھی۔ کتنے زمانے بعد اتنی اجلی صبح مجھ پر اتری تھی۔ پھر کتنی شاداب اور کتنی پرسکون۔ مجھے بیساختہ ان دنوں کی صبحیں یاد آ گئیں جب میں ابھی منن تھا۔ اتنی اجلی صبحیں تو انہیں دنوں دیکھنے میں آتی تھیں۔ ہر صبح یوں لگتا کہ زمین نے ابھی ابھی نیا جنم لیا ہے اور آسمان نے تازہ تازہ ظہور کیا ہے۔ ساری فضا کتنی پاکیزہ نظر آتی تھی، درخت تازہ دم دکھائی دیتے تھے۔ اور پرندے، ان کی تو پوچھو ہی مت، ویسے تو سارے دن ہی چہکتے رہتے تھے۔ کبھی اچھا خاصا شور مچانے لگتے تھے۔ مگر آخر کیوں، بس شوقیہ۔ مگر صبح کو تو یوں لگتا تھا کہ جیسے ان کے اندر کسی نے پارہ بھر دیا ہے۔ شاما چڑیا کی دم کس تیزی سے اوپر جاتی نیچے آتی۔ اور جنگلی کبوتر، ان کی تو غٹرغوں ہی سے ساری فضا ایک نرم دھیمی گونج سے بھر جاتی۔ طوطے الٰہی توبہ بہت شور

بچاتے تھے۔ ویسے جب ہماری حویلی والے نیم پر اترتے تھے تو کیسی چپ سادھ لیتے تھے۔ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ ان ٹہنیوں کے بھیتر اور اوپر پھننگوں پر طوطے ٹکے ہوئے ہیں۔ ہرے میں ہرا مل جاتا تھا۔ وہ تو جب بھرا کھا کر اڑتے تھے تب پتہ چلتا تھا کہ یہ نیم جو ابھی اتنا سبز اور اتنا گھنا نظر آ رہا تھا وہ طوطوں کی وجہ سے تھا۔ ان کے اڑتے ہی ٹہنیاں کتنی چھدری نظر آنے لگتیں اور جیسے اب اتنی سبز نہیں ہیں۔ کیا سوچ کر ڈار کی ڈار ان ٹہنیوں کے بیچ آن اترتی تھی اور پھر کیا سوچ کر ایک دم سے بھرا کھا کر اڑ جاتے تھے۔ پھر فضا میں ایک سبز ٹیڑھی میڑھی لکیر کھینچتی چلی جاتی۔ بس لگتا تھا کہ صبحیں بنی ہی طوطوں، میناؤں، بلبلوں اور کبوتروں کے لئے ہیں۔ آدمی تو ان سے بچی ہوئی صبح سے فیض یاب ہوتے تھے۔ پہلے تو وہی جاگتے تھے۔ وہی پہلے صبح کو برتتے تھے، بے دریغ صرف کرتے تھے۔ جتنی بچ جاتی تھی بعد میں جاگنے والی انسانی مخلوق کے صرفے میں آتی تھی۔ ایک صبح پہ کیا ہے، صبح و شام دونوں ہی جیسے خاص پرندوں کے اوقات تھے۔ شام بھی جیسے انہیں کے لئے پڑتی تھی اور صبح بھی جیسے بس انہیں کی خاطر چڑھتی تھی۔ ادھر شام پڑی اور ادھر پرندوں میں کھلبلی پڑی۔ کوے کتنے سراسیمہ ہو جاتے تھے اور مور اپنی لمبی لمبی نیلی نیلی گردنیں اٹھا کر کتنی گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھتے اور کتنی ہراس بھری آواز میں جھنکارتے۔ شام سے اتنا خوف جیسے شام نہیں پڑ رہی قیامت اٹھ رہی ہے۔ صبح کو اتنے خوش جیسے صبح عید ہو۔

میں کن صبحوں میں جا نکلا۔ وہ صبحیں تو ناپید ہی ہو گئیں۔ پھر بھی مجھے یوں لگ رہا تھا کہ یہ صبح جیسے صبحوں کے اسی قافلہ میں سے کوئی صبح ہے کہ بھٹک کر آج ادھر آ گئی ہے۔ بلکہ مجھے تو اگلی صبح بھی اسی تسلسل میں نظر آئی، اتنے فرق کے ساتھ کہ یہ صبح میں نے ہسپتال میں کی تھی اگلی صبح گھر جا کر کی۔ اصل میں مجو بھائی اس اطمینان کی بعد کہ میری جان بچ گئی ہے مجھے زیادہ دیر ہسپتال میں رکھ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آپریشن تو ہو ہی چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے حالت تسلی بخش قرار دے دی تھی۔ پھر وہ کیوں مجھے ہسپتال میں چھوڑتے۔ سارے دن بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ اس ڈاکٹر سے مل، اس ڈاکٹر سے رپورٹ لے، بس شام ہوتے ہوتے وہ مجھے ہسپتال سے نکال کر گھر لے آئے۔ میں نے بھی گھر آ کر اطمینان کا سانس لیا۔ ہسپتال میں لاکھ خبر گیری ہو، مگر گھر پھر

گھر ہوتا ہے۔ لگا کہ لمبا سفر کر کے ہرج مرج کھینچ کے گھر آیا ہوں۔ اس احساس نے کتنا سکون دیا۔

مجو بھائی نے بھی گھر پہنچ کر اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ ہسپتال میں تو وہ مستقل گھبرائے گھبرائے نظر آتے تھے۔ ڈاکٹروں نے جب حالت تسلی بخش قرار دے دی، اس کے بعد بھی ان کی گھبراہٹ میں بس واجبی واجبی ہی سا فرق آیا تھا۔ مگر گھر میں قدم رکھتے ہی جیسے ان کی ساری پریشانی دہلیز سے ادھر رہ گئی ہو۔ اچانک کتنے مطمئن نظر آنے لگے تھے۔ جیسے اب انہیں یقین آیا ہو کہ میں سچ مچ بچ گیا ہوں۔

"جواد میاں، یقین جانو کہ تم اللہ میاں کے گھر سے واپس آئے ہو۔"

"ہوں۔" میں نے آہستہ سے تائیدی لہجہ میں ہوں کی اور چپ ہو گیا۔

"بڑی بے یقینی کی صورت تھی۔ ڈاکٹر کچھ زیادہ پرامید نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نے کتنا پوچھا۔ کوئی ڈاکٹر واضح جواب نہیں دے رہا تھا۔ بس یہی کہ آپریشن کے بعد پتہ چلے گا۔ نازک آپریشن تھا۔ گولی بھی کہاں جا کر لگی تھی اور پتہ ہے میں کیا سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ یار میں تو اکیلا رہ جاؤں گا۔"

"اکیلے۔" میں مسکرایا "مجو بھائی آپ کے دوستوں، واقف کاروں، فدائیوں کی تو قطاریں لگی ہوئی ہیں۔"

"ہاں وہ بھی ہے۔ مگر یار------------ بس تم سمجھ نہیں سکتے اس بات کو۔"

میں اس بات کو اپنی حد تک تو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لے دے کے اب اپنے لئے مجو بھائی ہی رہ گئے تھے۔ باقی اور جن شرفاء سے ربط و ضبط تھا وہ بھی مجو بھائی ہی کے واسطے سے تھا۔ مگر کیا میں بھی مجو بھائی کے لئے اسی طرح ناگزیر ہوں۔ کم از کم اس سے پہلے میں یہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔ یہی سمجھتا تھا کہ منجملہ احباب میں بھی ہوں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ہم دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔

"مگر خیر خدا نے کرم کیا۔ اللہ میاں کو میری حالت پہ رحم آ گیا۔ میرے خیال

میں اللہ میاں کو پہلی مرتبہ مجھ پر تھوڑا رحم آیا ہے۔" یہ کہہ کے مجو بھائی ہنسے۔ پھر اچانک ان کا موڈ ہی بدل گیا "لاحول ولا قوہ۔ ڈاکٹر نے تو تاکید کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ آرام کرنا ہے زیادہ بولنا نہیں ہے۔ دوسرے بھی زیادہ باتیں نہ کریں تاکہ مریض کم بولے۔ تو خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہئے۔" اور اس کے ساتھ ہی نعمت خاں کو آواز دی "نعمت خاں۔ او میاں نعمت خان۔"

نعمت خان کچن سے نکل کر لپک کر آیا "جی صاحب۔"

"یار، تم نے کمرے کی تھوڑی صفائی کر لی ہوتی۔ جواد میاں کا بستر ذرا جھاڑ جھوڑ کے قرینے سے بچھا دیا ہوتا۔"

"جی، میں نے سب کر دیا ہے۔ بس آپ صاب جی کو لٹا دیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ وہ تو میں لٹائے دیتا ہوں۔ مگر برابر میں ایک میز رکھ دو۔ اور یار کوئی گلدان نہیں ہے۔ خیال نہیں آیا کہ تھوڑے پھول رستے میں سے لے لیتا۔ اور دیکھو جواد میاں کے لئے دلیا تیار کرلو۔"

بس اسی قسم کی بہت سی باتیں ایک سانس میں کر ڈالیں اور کرتے چلے گئے۔ پھر مجھے سہارا دے کر لٹایا اور خود کمرے کا ایک نظر جائزہ لے کر صفائی ستھرائی پر جت گئے۔ نعمت خاں تھوڑی ہی دیر میں دلیا لے کر آگیا۔ مجو بھائی کی نگرانی میں، میں نے دلیا کھایا۔ اس کے فوراً بعد مجو بھائی نے مجھے جلدی جلدی کئی ایک قسم کی دوائیں کھلا پلا ڈالیں اور ہدایت کی "بس اب تم سو جاؤ۔"

شاید انہیں دواؤں میں کوئی سونے کی بھی دوا تھی۔ جب ہی تو مجھے اتنی جلدی نیند آگئی۔ پھر شاید یہ بات بھی تھی کہ آج میں اپنے گھر میں سو رہا تھا۔ احساس ہو رہا تھا کہ ایک زمانے بعد باہر خراب و خستہ ہو کر اپنے گوشے میں واپس آیا ہوں۔ اپنا کمرہ، اپنے درو دیوار، اپنا بستر، کتنی آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ بس جلدی ہی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ آدمی گھر سے باہر بیشک ریشم و مخمل کے نرم گرم بستر میں ساری آسائشوں کے ساتھ آرام کرے، مگر اپنے گوشے میں لمبی تان کر سونے میں جو راحت ہے اس کی بات ہی اور ہے۔ تو میں جلدی ہی سویا اور اس شان سے کہ سمجھ لو گھوڑے بیچ کر سویا۔ پھر صبح ہی کو آنکھ کھلی۔ ہاں صبح کو آنکھ جلدی کھل گئی۔ بس موذن لاؤڈ سپیکر پہ ابھی

کھنکھار رہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ ایسے کھلی کہ نیند بالکل ہوا ہو گئی۔ کتنی دیر تک میں آنکھیں موندے پڑا رہا کہ شاید پھر آنکھ لگ جائے۔ آخر اتنی سویرے میں اٹھ کر کیا کروں گا۔ ابھی تو بہت اندھیرا تھا۔ اجالے کی ذرا جو رمق ہو۔ مگر خیر مجھے لمبا انتظار کھینچنا نہیں پڑا۔ گاڑھا اندھیرا چھدرا ہوتا چلا گیا۔ ادھر چڑیوں نے بولنا شروع کر دیا۔ اس صبح مجھے احساس ہوا کہ ہمارے گھر کے آس پاس اتنی چڑیاں ہیں۔ لگتا تھا کہ کہیں پاس ہی لکھوکھا چڑیاں ہیں کہ ایک دم سے جاگ پڑی ہیں اور شور مچانا شروع کر دیا ہے۔ اور ہاں کہیں بہت دور سے کوئل کی آواز بھی آ رہی تھی۔ بہت مدھم تھی، مگر آ رہی تھی۔ کتنی خوشی ہوئی یہ سوچ کر کہ کوئل کی آواز ہمارے گھر تک آتی ہے۔ پھر یہ کہ اس شہر میں یہ آواز موسم کی پابند نہیں ہے۔ ہمارے ادھر تو گرمیوں گرمیوں سنائی دیتی تھی۔ ادھر برسات ختم ہوئی اور ادھر کوئل کی آواز غائب۔ پھوپھی اماں اس کی توجیہ یوں کرتیں کہ کوئل پہاڑوں میں واپس چلی گئی۔ ان کے حساب سے کوئل کا اصلی ٹھکانہ پہاڑ تھے۔ آموں پر بور آنے کے ساتھ پہاڑوں سے اتر کر ہمارے باغوں میں آتی، گرمیوں میں شروع ہو کر برسات کے ختم تک کوکتی رہتی۔ برسات کو اپنی آخری کوک کے ساتھ رخصت کرتی اور پہاڑوں میں واپس چلی جاتی۔ مگر اس شہر میں یوں احساس ہوتا کہ کوئل نہ کہیں سے آتی ہے نہ کہیں جاتی ہے۔ اس لئے بے موسم بھی اس کی کوک سنی جا سکتی ہے۔

میں نے آہستہ سے دائیں سے بائیں، پھر بائیں سے دائیں کروٹ لی۔ مگر کسی کل چین نہیں آیا۔ نیند پوری ہو چکی تھی اور اب بستر میں لیٹے رہنا ناگوار گزر رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجو بھائی کے پلنگ پر نظر ڈالی۔ بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے آخر ہمت کی۔ آہستہ سے پلنگ سے اترا اٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ چل کر بالکنی میں جا پہنچا۔ کمرے میں تو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ یہ تو اچھا خاصا اجالا ہو چلا تھا۔ اجلا اجلا دھندلکا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ دور چوراہے پر کوئی آدمی چلتا پھرتا تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ آدمی نہ سواری۔ ہاں ایک کتا ایک کتیا کے ساتھ چہلیں کر رہا تھا۔ اور وہ کتیا اس سے کتنی انکھیلیاں کر رہی تھی۔ مگر جلدی ہی جھاڑو دینے والے آن پہنچے۔ ان کی جھاڑو نے ان کی خوشی میں کھنڈت ڈال دی۔ پھر کہیں سے تیسرا کتا آن نکلا۔ ایک اور کھنڈت۔ بے

مزہ ہو کر وہاں سے وہ سرک ہی گئے۔

چوراہے کے بیچوں بیچ جو چبوترے میں گڑا ایک کھمبا کھڑا تھا اس کی روشنی اب بجھ چکی تھی۔ دکانیں ابھی بند تھیں۔ ہاں وہ جو چائے والے کی دکان تھی اور جو ہماری بالکنی سے صاف نظر آتی تھی کھل گئی تھی۔ چولہا بھی گرم ہو گیا تھا۔ گاہک ابھی کوئی نمودار نہیں ہوا تھا۔ بس دکاندار اپنے ہی طور پر کچھ سٹرپٹر کرتا نظر آ رہا تھا۔

اچانک ایک سمت سے ایک کار نمودار ہوئی اور ہارن دیتی ہوئی تیزی سے دوسری سمت میں چلی گئی۔ بس اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ دور کی سڑکوں پر ایک دم سے بہت سی رکشائیں، ٹیکسیاں، بسیں، موٹریں نکل پڑی ہیں اور شور کرتی ہوئی دوڑ رہی ہیں۔

نعمت خان نے ایک کرسی لا کر رکھ دی۔ "صاب، آپ کھڑے کھڑے تھک جائیں گے۔ تھکنا آپ کو نہیں چاہئے۔ کرسی بچھا دی ہے بیٹھ جایئے۔"

میں بیٹھ گیا۔ نگاہیں اسی طرح دور چوراہے کی سمت میں دیکھتی ہوئیں۔ چوراہا بھی اب ساکن اور خاموش نہیں رہا تھا۔ لوگ چلتے پھرتے نظر آنے لگے تھے۔ ابھی ابھی ایک بس کھمبے سے دائیں ہاتھ والے سٹینڈ پر آ کر رکی تھی۔ اور وہاں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک سواری آن کھڑی ہوئی تھی اسے لے کر تیزی سے آگے چلی گئی۔ اب اس سٹینڈ پر کئی ایک لوگ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ایک رکشا کسی سمت سے آ کر وہاں رکی۔ اور ایک شخص لپک کر اس میں بیٹھا۔ رکشا تیزی سے سٹارٹ ہوئی اور شور کرتی ہوئی مین روڈ کی طرف چلی گئی۔

سکول جانے والے بچے، کالج جانے والی لڑکیاں، دفتر جانے والے بابو لوگ، رنگ رنگ کی مخلوق مختلف گلیوں سے نکل کر امنڈ رہی تھی۔ کوئی بس سٹینڈ پر بس کے انتظار میں۔ کوئی رکشا کا منتظر۔ اور ہاں سکول کے بچے بچیاں اور لڑکیاں اپنی اپنی درسگاہ کی وین کی منتظر تھیں۔ اپنی اپنی سکول اور کالج کی پوشاکوں میں کتنی خوش اور شاداب نظر آ رہی تھیں۔

تو اب صبح اپنے عروج پر تھی۔ اور میں حیران بھی اور خوش بھی کہ ایسے خراب زمانے میں اتنی خوشگوار، اتنی شاد آباد صبح، جیسے شہر کو کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ وہی بھلے

دنوں کا جیتا جاگتا شہر اور اس کی جیتی جاگتی صبحیں۔ تو گویا اس شہر کی صبحیں ابھی تک زندہ و سلامت تھیں، ابھی تک گزرنے دنوں کی صبحوں کے تسلسل میں چڑھ ڈوب رہی تھیں۔ یہ تو نیک علامت ہے، میں نے سوچا، ابھی تک اس شہر میں چڑیاں اسی طرح منہ اندھیرے چہکنا شروع کر دیتی ہیں، لڑکیاں اپنی اجلی اجلی پوشاکیں پہن کر اپنے اپنے کالجوں کی ویں میں لدی پھندی اپنے کالجوں کی طرف جاتی نظر آتی ہیں، بچے گلے میں بیگ ڈالے اپنے اپنے سکول کے لئے رواں دواں نظر آتے ہیں، کتنے پیدل، باقی ٹولیوں کی ٹولیاں، بسوں، ویگنوں، رکشاؤں، میں لدی پھندی۔ پھر تو اس شہر کی بحالی صحت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یا شاید جیسے میں زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر کر، لمبی اذیت سے نکل کر یہاں خوش کھڑا ہوں یہ شہر بھی اپنی اذیت کے دن گزار کر اب شفا پا چکا ہے۔ خیر اگر ایسا نہ بھی ہو، میں نے سوچا، اتنا تو طے ہے کہ اس کی صبحوں کی پاکیزگی پر ابھی کوئی آنچ نہیں آئی ہے۔ یہ نیک فال ہے۔ ایک شہر کی جب تک صبحیں سلامت ہیں اس کی سلامتی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ دن اور رات کے باقی پہر کسی حال میں ہوں، صبح کے پہر کو بچا کر رکھنا چاہئے۔ خوشگوار صبح کسی ڈوبتے شہر کا آخری سہارا ہوتی ہے۔ جب صبحیں بھی ڈوب جائیں تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"یار تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔" مجو بھائی سر پہ آن کھڑے ہوئے "میں سمجھ رہا تھا کہ باتھ روم میں ہوں گے، حیران اور پریشان تھا کہ باتھ روم میں اتنی دیر۔ کیا ہو گیا، چلو اٹھو، منہ ہاتھ دھوؤ، ناشتہ کرو، دوا میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔"

صبح سے میں سیر ہو ہی چکا تھا۔ انہوں نے کہا، میں اٹھ کھڑا ہوا۔ باتھ روم گیا۔ آہستہ آہستہ ہاتھ منہ دھویا۔ تازہ دم ڈائننگ ٹیبل پہ آ بیٹھا جہاں مجو بھائی پہلے سے بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ صبح سے ملاقات کے بعد میں کتنا ہشاش بشاش ہو گیا تھا۔ میں اپنے حساب سے شفایاب ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ شہر بھی۔

مجو بھائی مجھے دیکھ کر مطمئن نظر آ رہے تھے۔ پوچھنے لگے "طبیعت اب کیسی ہے؟"

"بس صبح کے ساتھ طبیعت بحال ہو گئی۔ مجو بھائی، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ اپنے آپ کو آزاد سمجھیں۔"

"پابند میں کب تھا۔"

"لو میری وجہ سے تو آپ کے پاؤں میں اچھی خاصی بیڑیاں پڑ گئی تھیں۔"

"کون کہتا ہے۔"

"میں کہتا ہوں۔ اس سے پہلے آپ کبھی زندگی میں اتنے بندھ کر بیٹھے تھے۔ آپ کے کتنے کام، کتنے پروگرام میری وجہ سے کھوٹے ہوئے۔"

"اماں ہمارے کونسے کام، کونسے پروگرام ہیں۔ اگر پروگرام بنا کر چلتے تو پھر ہماری زندگی کسی اور طرح بسر ہوتی۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ خدا واسطے کے کام جو آپ اپنی جان کے ساتھ لگائے رکھتے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ خیال بیچارے آقا حسن کا ہے۔ ان کا تو بیٹی کا معاملہ ہے۔"

مجو بھائی نے ٹھنڈا سانس بھرا "جواد میاں، کیا پوچھتے ہو، اس معاملہ میں ہم بہت ذلیل ہوئے۔ البتہ ایک فائدہ ہوا۔"

"وہ کیا۔"

"لکھنؤ اور میرٹھ دونوں کا بھاؤ معلوم ہو گیا۔ مگر یار، یہ تمہارے میرٹھ والے، اور ایک تو میرٹھی اوپر سے کمبوہ، کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ میں مان گیا انہیں۔"

"میں نے آپ سے کیا کہا تھا۔ بہر حال یہ بتائیے، اب وہ کیا کہتے ہیں۔"

"ارے یار بھائی بہن دونوں پٹھے پہ ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتے۔ اور باجی اختری، وہ عورت تو بالکل ماش کا آٹا بنی ہوئی ہے۔"

"اور لکھنؤ والے؟"

"اماں پہلے تو میرا حال پوچھو۔ پہلے وہ لوگ ان میرٹھیوں میں عیب نکالتے تھے اور میں پردہ ڈالتا تھا۔ اب وہی عیب میں نکالتا ہوں اور وہ پردہ ڈالتے ہیں۔ میں اب گھما پھرا کر جتاتا ہوں کہ یہ لوگ تو واقعی کمبوہ ہیں اور واقعی قینچی والے ہیں۔ مگر بشو بھابی ایک کان سنتی ہیں، دوسرے کان اڑا دیتی ہیں۔ اب تو اقن صاحب کو بھی توصیف میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"اماں پھر یہی ہو گا کہ میں کسی دن انہیں صاف صاف بتا دوں گا کہ ہم نے تو لاسہ لگایا تھا مگر پنچھی دانہ چگ کر اڑ گیا۔"

اتنے میں نعمت خان آن نازل ہوا۔ اس نے جلدی جلدی ناشتہ لگایا۔ پھر رک کر کھڑا ہو گیا۔ مجو بھائی نے اسے غور سے دیکھا "کہو نعمت خان، کیا بات ہے۔"

"مجو صاب جی، دو عرضیں ہیں۔"

"یک نہ شد دو شد۔ اچھا بتاؤ، وہ کیا دو عرضیں ہیں۔"

"پہلی عرض تو یہ ہے صاب جی کہ یہ جو ہمارا دروزہ ہے اس میں ایک چھوٹا سا چوکور خانہ کھلوا کے جالی لگوا دو۔"

مجو بھائی نے معنی خیز نظروں سے نعمت خان کو دیکھا "اچھا لگوا دیا۔ مگر اس کا فائدہ کیا ہو گا۔"

"پھر جی اچانچک تو نہیں پکڑے جائیں گے۔ پتہ تو چل جائے گا کہ آنے والا ہے کون ہے؟"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"صاب جی، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ زمانہ کیسا خراب جا رہا ہے۔ وارداتیں کرنے والوں نے اب ایک نیا چکر چلایا ہے۔ کہ آ کے دروازے کی گھنٹی بجاتے ہیں۔ دروازہ کھولو تو داخل ہو کے سب گھر والوں کو پستول دکھا کے رسیوں سے باندھا، پھر سارا مال سمیٹا، پھر گولی ماری، اور یہ جا وہ جا۔ تو جی دروازہ کھولنے سے پہلے یہ تو دیکھ لیا جائے کہ ہے کون۔"

"نعمت خان، تم کہاں کہاں سے کیا کیا بے سر پیر کی سن کے آتے ہو۔"

"بے سر پیر کی نہیں جی۔ برابر والی گلی میں جو حاجی صاحب ہیں ان کے گھر میں ایسے ہی گھس کے آئے تھے وہ۔"

"حاجی صاحب تو دولتمند آدمی ہیں۔ ڈاکوؤں کو کسی نہ کسی دن کسی نہ کسی راستے ان کے یہاں آنا ہی تھا۔ نعمت خان، ڈاکو احمق نہیں ہوتے۔ انہیں ہماری اوقات کا پتہ ہے۔ وہ یہاں آ کر کیوں اپنا قیمتی وقت ضائع کریں گے۔" "مجو صاب جی، ان ڈاکوؤں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ضروری تو نہیں کہ ڈاکہ ڈالنے ہی آئیں۔ کبھی کبھی

ڈاکہ نہیں بھی ڈالتے۔ کلمہ پڑھوایا، گولی ماری، اور دفع ہو گئے۔ کئی بیری ایسا ہوا ہے۔ تو صاب جی، دوسری عرض یہی ہے۔"

"وہ کیا ہے۔"

"میرا کلمہ صحیح کرادو جی۔"

"گویا تمہارا خیال ہے کہ اگر تم نے کلمہ صحیح سنا دیا تو وہ تمہیں بخش دیں گے۔ واہ نعمت خان واہ۔"

"نہ بخشیں، موت اور زندگی تو جی اللہ تعالٰی کے ہاتھ میں ہے۔ مگر آدمی کا کلمہ تو صحیح ہونا چاہئے۔ جاناہی ٹھہر گیا ہے۔ تو کلمہ صحیح پڑھ کے تو جائیں۔"

"نعمت خان، عقل کے ناخن لو۔ یار لوگ بے سر پیر کی اڑاتے ہیں۔ تم ان پر اعتبار کر لیتے ہو۔"

"نہیں جی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ تو کئی راتوں سے ہسپتال میں تھے۔ مجھ سے پوچھو۔ اکیلا تھا، کئی بیری لگا کہ کوئی دروزے پہ ہے۔ بلکہ ایک دفعہ تو گھنٹی بھی بجی تھی۔ مگر میں نے بھی کچی گولیاں تو نہیں کھیلی ہیں۔ دم سادہ کے پڑا رہا۔ ہنکارا بھی نہیں بھرا۔ دروزہ کھولنا تو دور کی بات ہے۔"

نعمت خان بولے جا رہا تھا اور میں اس کا منہ تک رہا تھا۔ کتنا خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ میری بشاشت بھی اب غائب تھی۔ صبح کتنی سہانی چڑھی تھی، باہر بھی، میرے اندر بھی۔ اور اب وہ کس طرح ڈوب رہی تھی۔

(19)

"مجو بھائی۔" میں تھوڑا جھجکا مگر پھر پوچھ ہی لیا "گولی واقعی نکل گئی تھی۔"

"کیا مطلب؟" مجو بھائی نے گھور کے مجھے دیکھا "تمہارا خیال ہے کہ گولی ابھی تک تمہارے اندر گھسی بیٹھی ہے۔ یہ تو تم نے بلچو نچوں والی بات کی۔"

"میں اپنے اطمینان کے لئے پوچھ رہا تھا۔"

"بندۂ خدا، آپریشن کس بات کا ہوا تھا۔ اسی خاطر ہوا تھا۔"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے سے کیا مطلب۔ تمہیں شاید ابھی تک اعتبار نہیں آیا ہے۔ کاغذ پر لکھ کر دے دوں۔ یا ڈاکٹروں سے لکھوا کر لا دوں۔"

"نہیں مجو بھائی میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"پھر کیا مطلب تھا۔"

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب گولی نکل گئی ہے تو پھر کیا چیز ہے جو میرے اندر رڑکتی رہتی ہے۔"

"کچھ دنوں یہی احساس رہے گا۔ آخر گولی تھی، غلہ تو نہیں تھا۔ آرام کرو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ چند دنوں بعد یہ احساس بھی نہیں رہے گا کہ کبھی گولی لگی تھی۔ مگر شرط یہ ہے کہ آرام کرو۔ مکمل آرام، ڈاکٹر نے سخت تاکید کی ہے کہ دفتر نہ جائیں، باہر نہ نکلیں۔"

"آرام ہی کر رہا ہوں۔ باہر نکلنے کا مجھے کونسا شوق ہے۔ آپ ہی لئے لئے پھرتے تھے۔ رہا دفتر تو وہاں سے فی الحال چھٹی لے ہی رکھی ہے۔"

"ہاں بس آرام۔"

"یہی تو تعجب ہے کہ آرام کر رہا ہوں۔ پھر بھی کوئی چیز اندر رڑکتی رہتی ہے۔ جیسے کولی کہیں بہت اندر اتر گئی ہو اور رڑک رہی ہو۔"

"معلوم ہے کیا چیز رڑکتی ہے۔"

"کیا؟"

"دماغ۔"

"دماغ؟"

"ہاں دماغ۔ یہ تمہارا دماغ ہے جو رڑکتا رہتا ہے۔ بھلے آدمی دماغ بھی آرام چاہتا ہے۔ اسے آرام نہیں کرنے دو گے تو وہ ستائے گا۔ بلکہ ستا رہا ہے۔ کم از کم اس حال میں تو سوچنے سے باز رہتے۔ مگر تم تو اس وقت بھی جب تم بے سدھ پڑے تھے اس قبیح حرکت سے باز نہیں آئے۔ تمہارا دماغ ہے۔ یا شیطان کا چرخہ ہے۔ ہر وقت چلتا رہتا ہے۔"

"مجو بھائی، اس وقت مجھے سوچنے کا ہوش تھا۔ میرے ساتھ میرا دماغ بھی نڈھال تھا۔ آوارہ خیالوں اور یادوں نے غریب پر یلغار کر رکھی تھی۔"

"پتہ ہے تم بیہوشی میں کیا کیا بنکار رہے تھے۔ جیسے دنیا کے سارے برباد شہر تمہارے دماغ میں گھس کر فتور پیدا کر رہے ہوں۔"

"اچھا؟ کیا بنکار رہا تھا، مجھے تو یاد نہیں۔"

"ہاں اب تمہیں یاد نہیں ہے۔ اس وقت تو لگتا تھا کہ تمہیں بہت کچھ یاد ہے۔ دنیا زمانے کی باتیں۔ ہاں یاد آیا۔ تم بنکارتے بنکارتے کہنے لگے، ہاں مجو بھائی، وہ جو میں بیچ میں سے بھول گیا تھا، وہ بات اب یاد آئی۔ وہ بات یہ تھی کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ تمہیں زیادہ باتیں نہ کرنے دی جائیں تو میں نے تمہیں روک دیا کہ یار، سو جاؤ۔ پھر سنانا۔" مجو بھائی ہنسے "ہاں اب بتاؤ، وہ کیا بات تھی۔"

"اچھا میں نے ایسا کہا تھا۔" میں سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑا سا پریشان بھی ہوا کہ کہیں پھر کچھ غلط سلط تو نہیں کہہ گیا۔ مجو بھائی تو بات کو پکڑ لیتے ہیں۔ میں نے بہت یاد کرنے کی کوشش کی۔ مگر یاد نہ آیا کہ کونسی بات ایسی یاد آئی تھی جو میں مجو بھائی کو سنانا چاہتا تھا۔ "مجو بھائی، اس وقت تو بہت کچھ یاد آگیا تھا۔ مگر اب ------------"

"ہاں ٹھیک ہے۔ پھر یاد کر کے بتانا، اس وقت ذہن پہ زور مت ڈالو۔" یہ کہتے کہتے نعمت خاں کو آواز دی۔ نعمت خاں دوڑا آیا۔

"دیکھو نعمت خاں، میں چل رہا ہوں۔ تم جواد میاں کا خیال رکھنا، تھوڑی دیر میں یخنی پلا دینا۔ کھانے میں شوربہ اور پھلکے کے بکل۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "یار، یہ غازی صاحب مجھ سے برے چپٹے ہیں۔ میں نے مروت میں بس رسمی سے چند فقرے ان کی شان میں کہہ دیئے تھے۔ وہ سمجھ بیٹھے کہ میں بھی باجی اختری اور توصیف کی طرح ان کا مرید بن گیا ہوں۔ آج وہ کوئی معرکہ کا خطبہ دے رہے ہیں۔ اصرار ہے کہ آکر سنو۔"

میں چونکا اور حیرت سے مجو بھائی کو دیکھا "آپ غازی صاحب کو سننے جا رہے ہیں۔"

"کیا کریں۔ گلے جو پڑ گئے ہیں۔ مروت میں یہ کام بھی کرنا پڑے گا۔ رفیق صاحب سے کہوں گا کہ اس مشکل وقت میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ ان کے ساتھ جاؤں گا تو جلدی اٹھ کر آنے میں آسانی رہے گی۔ وہ تو اس کام میں ماہر ہیں۔ بس غازی صاحب کو اپنی صورت دکھانی ہے۔ جھانکوں گا اور آجاؤں گا۔"

"پھر جائیں۔ اللہ آپ پہ رحم کرے۔"

مجو بھائی بس اسی طرح کی عذر معذرت کرتے کرتے نکل گئے۔ بات اصلی یہ تھی کہ مجو بھائی گھومنے پھرنے والے آدمی۔ میری وجہ سے ان کے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی تھی۔ بیچارے ہسپتال میں میری پٹی سے لگے بیٹھے رہے۔ مجھے اب ہسپتال سے رہائی ملی تھی تو انہیں بھی گویا رہائی مل گئی۔ تو آج انہیں کسی نہ کسی بہانے گھر سے نکلنا ہی تھا۔ میرے ساتھ قید ہو کر تو گھر میں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ نعمت خان دیکھ بھال کے لئے گھر میں موجود ہی تھا۔ پھر انہیں فکر کس بات کی تھی۔ ادھر میں نے بھی ان کے جانے کے بعد

اطمینان کا سانس لیا۔ اپنے آپ سے جو یہ نئی قسم کی ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس میں وہ مستقل مخل ہو رہے تھے۔ یہ ملاقات خلوت مانگتی تھی۔ وہ میسر نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ اب میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ موت و زیست کی کشمکش سے تو میں اب نکل آیا تھا۔ اس کشمکش نے تو واقعی مجھے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ نہ زندوں میں تھا نہ مردوں میں۔ جانے جان کہاں اٹکی رہ گئی تھی کہ نکلی نہیں۔ ویسے کسر تو کوئی رہ نہیں گئی تھی۔ اب حال اچھا تھا۔ مگر وہ جو خوشگوار احساس تھا کہ میں بالکل شفایاب ہو گیا ہوں وہ تو بس دو صبحوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ دوسری صبح بھی جو گھر واپسی کے بعد چڑھی تھی میں کتنا ہشاش بشاش اٹھا تھا۔ جیسے پہلے کی طرح صحت مند ہو گیا ہوں، بلکہ پہلے سے زیادہ۔ لیکن صبح کے ساتھ یہ کیفیت بھی زائل ہوتی چلی گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیفیت اتنی جلدی زائل کیسے ہو گئی۔ پہلے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنی جلد شفا کا یہ احساس پیدا کیسے ہوا۔ ممکن ہے اس خوشگوار ذہنی کیفیت کے جو شفا کے خیال سے پیدا ہوئی تھی زائل ہونے میں نعمت خان کا بھی ہاتھ ہو جس نے موقعہ پاتے ہی مجو بھائی سے آنکھ بچا کر مجھے ادھر ادھر کی تشویشناک خبریں یا افواہیں سنا ڈالی تھیں۔ بہرحال اس روشن صبح کے زوال کے ساتھ ہی مجھے اپنے اندر بھی صبح کے زوال کا احساس ہونے لگا۔ جیسے گئی ہوئی ذہنی کیفیت واپس آنے لگی ہو۔ جیسے پھر اسی رو میں بہنے لگا ہوں۔ مگر میں جلدی ہی چوکنا ہو گیا سوچا کہ ایسا نہ ہو کہ پھر اسی رو میں اسی طرح بہتے چلے جاؤ۔ اور پھر کہیں بالکل ہی نہ بہہ جاؤ۔ اپنے آپ کو اکٹھا کرو، سنبھالو، مدافعت کی طاقت پیدا کرو۔ پراگندہ خیالوں اور آوارہ یادوں پر بند باندھو۔ تو واقعی خلوت اس وقت میری ضرورت تھی۔ اور ہاں اب جو اچانک مجو بھائی نے ایک نیا شغلہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو یہ کہہ کر نبٹ گئے کہ ذہن پہ زور مت ڈالو۔ پھر کبھی جب وہ بات یاد آ جائے سنا دینا۔ مگر میں تو تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کیا واقعی میں نے اپنے اس عالم میں مجو بھائی کے سامنے کچھ اگل دیا تھا۔ مجو بھائی گول کر گئے۔ بتایا نہیں کہ میں نے کیا اگلا تھا۔ بلکہ یہ ظاہر کیا کہ جیسے اگلنے لگا تھا مگر اگلا نہیں۔ مگر، میں نے اپنے آپ کو ٹوکا، میرے پاس اگلنے کے لئے کیا ہے۔ شاید یہ بھی مجو بھائی کی کوئی چال تھی۔ بہرحال مجھے اپنے آپ کو ٹٹولنا تھا کہ مجھے اس عالم میں واقعی کوئی ایسی بات یاد آئی تھی اور میں نے مجو بھائی سے کہی تھی۔ تو اس سب کے لئے اپنے

آپ کو ٹٹولنے کے لئے خلوت اس وقت میری ضرورت تھی۔ مگر وہ نصیب کہاں ہوئی۔
مجو بھائی رخصت ہوئے ہی تھے کہ مرزا صاحب آن وارد ہوئے۔ "ارے بھائی، یہ تم
کس مصیبت میں پھنس گئے۔"

"آیئے مرزا صاحب۔" میں سنبھل کر بیٹھنے لگا۔

"نہیں نہیں لیٹے رہو۔ میں تو بس تمہاری خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ رفیق
صاحب سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ انہوں نے بتایا۔ میاں میں تو حق دق رہ گیا۔ گھر میں جا
کر بتایا تو وہ بھی سناٹے میں آگئیں۔ صبح سے تک تک کر رہی تھیں کہ جاؤ، خیریت معلوم
کر کے آؤ۔ تو بھائی کیسے ہو۔"

"اب اچھا ہوں۔"

"خدا کا شکر ہے۔ جان بچ گئی۔ بس آرام کرو۔ انشاء اللہ چند دن میں بالکل
ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مگر یہ واقعہ ہوا کیسے۔"

اب مجھے سب کچھ یاد آگیا تھا۔ یعنی اس مرحلہ سے نکل آیا تھا کہ دنیا جہان کی
باتیں یاد آرہی تھیں اور یہ ابھی کی بات یاد نہیں آرہی تھی اور یاد اگر آتی بھی تھی تو
اس طرح جیسے صدیوں پہلے کوئی حادثہ گزرا ہو۔ مگر اب میں تمام و کمال اس واقعہ کو سنا
سکتا تھا۔ مگر نقاہت زیادہ بات کرنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ پھر یہ بھی احساس
کہ کیا بار بار اس واقعہ کو دہراتا۔ بہر حال مرزا صاحب نے بھی رسماً ہی پوچھا تھا۔ رسمی
مزاج پرسی کے فوراً ہی بعد انہوں نے اپنی الما شروع کر دی۔ "اس شہر میں اب ہم
جیسوں کا گزارہ نہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھنے کے لئے کہاں سے جگر لائیں۔ میاں،
اب ہم مرنا چاہتے ہیں۔ کوئی یقین ہی نہیں کرتا۔ سمجھتے ہیں کہ بڑھاپے میں چل چل ہو گیا
ہے۔ نہیں میاں نہیں۔ بیں بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں۔ ارے ہم چلن ہار تو پہلے
ہی تھے۔ عمر تو پوری ہو چکی ہے نا۔ آخر اور کتنا جئیں گے۔ بہت دیکھ لی دنیا۔ اب دنیا کا
جو حال ہے اسے دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔ تو میاں اب ہم واقعی مرنا چاہتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ مرزا صاحب۔" میں نے یونہی رسماً ایک فقرہ کہہ
دیا۔

"لو تم بھی اعتبار نہیں کرتے۔ نہیں میاں نہیں۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ مگر

موت اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ ایک وہ تھے کہ جب دیکھا دنیا رہنے کے قابل نہیں رہی اعلان کر دیا کہ ہم جا رہے ہیں۔ اور چلے گئے۔ تکئے پہ سر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔ مرید سمجھ رہے ہیں کہ سو گئے۔ یہ خبر ہی نہیں کہ اب وہ ابدی نیند میں ہیں۔ سبحان اللہ کیا اختیاری موت ہے۔ ایک ہم ہیں۔ موت کے کوچے میں بسر کرتے ہیں۔ مگر مرتے نہیں۔ یقین جاننا ان گنہگار آنکھوں سے روز دو چار دو چار کو ٹھنڈا ہوتے دیکھتے ہیں۔ مگر کوئی گولی ادھر نہیں آتی۔ میاں ہوتا کیا ہے۔ گھر سے نکلتے ہیں تو گلی والے بتاتے ہیں کہ بس ابھی گولی چلنی بند ہوئی ہے۔ جب گھوم پھر کر گھر آ جاتے ہیں تو خبر ملتی ہے کہ گولی چلنی شروع ہو گئی ہے۔ اور میاں کل کی سنو۔ میں تو مسجد ہی میں جا کر نماز پڑھتا ہوں۔ کل مغرب کا ناغہ ہو گیا۔ اور کل ہی مسجد میں بم پھٹ گیا۔ ہماری محرومی پہ غور کرو مسجد میں مرتے تو شہادت کی موت میسر آتی۔ مگر کیسے میسر آتی۔ قدرت کو جو منظور نہیں تھا۔ پتہ نہیں کس طرح ہماری آنی لکھی ہے۔ پالنے والے، عزت کے ساتھ ہمیں لیجائیو۔"

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ بولنے کی بالکل خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی تھوڑی سی دلجوئی کے نقطۂ نظر سے میں نے کہا "مرزا صاحب، آخر جینے سے اتنی بھی بیزاری کیا۔"

"ٹھیک کہتے ہو میاں۔ زندگی تو عطیہ خداوندی ہے۔ جتنی لے کے آئے ہو اسے صبر شکر کے ساتھ بسر کرو۔ شاد یا ناشاد، بسر تو کرنی ہی ہے۔ مگر میاں ہم اپنے اندیشوں کو کہاں لے جائیں۔ آخر قدرت ہمیں کیا دیکھنے کے لئے زندہ رکھنا چاہتی ہے۔" رکے، پھر بولے "جواد میاں، ہماری دلی کہنے کو بائیس خواجہ کی چوکھٹ، مگر سات دفعہ اجڑی ہے۔ اور سات دفعہ بسی ہے۔ چھٹی بار کا اجڑنا ہمارے پرکھوں نے دیکھا تھا۔ ساتویں بار کا اجڑنا ہم نے دیکھا۔ ہاں دیکھا اور سہا۔ ہم نے اماں بی کی اماں بی سے سنا تھا کہ جب غدر پڑا تھا تو بارہ بارہ کوس تک چراغ جلتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور دلی بس شہر بے چراغ۔ کتے بلی کی ریل پیل۔ آدمی کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہم سنتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ ۴۷ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میاں میں محلّہ کو اچھا بھلا چھوڑ کر ذرا چاندنی چوک تک گیا تھا۔ جامع مسجد کے پاس سے گزرا۔ بازار جما ہوا تھا۔ سیڑھیوں پہ ویسا ہی ہجوم۔ بس ذرا دہمی سی تھی۔ مگر میں نے اس وقت اس پہ۔

دھیان نہیں دیا۔ چاندنی چوک میں قدم رکھا ہی تھا کہ بھگدڑ پڑ گئی۔ پوچھتا ہوں کہ یہ کیسی بھگدڑ ہے پر کوئی بتاتا ہی نہیں۔ خیر میں الٹے پیروں واپس ہولیا۔ جامع مسجد کے پاس سے جو گزرتا ہوں تو میاں یقین جاننا بالکل سناٹا۔ نہ دکاندار، نہ خریدار، نہ امام، نہ نمازی۔ ہاں بالائی سیڑھی پر ایک پنجرا پڑا رہ گیا تھا جس میں ایک تیتر بری طرح پھڑپھڑا رہا تھا اور شور مچا رہا تھا۔ مجھے اس پہ ترس تو آیا مگر ایسے میں وہاں رکنا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ میں آگے بڑھ لیا۔ مگر میاں مجھ سے رہا نہ گیا۔ پلٹا، لپک کر سیڑھیاں چڑھا اور واں پہ جا کے پنجرے کی کھڑکی کھول دی۔ تیتر ایک دم سے نکلا اور پھر سے اڑ گیا۔ میں شتابی سے نیچے اترا اور گھر کی طرف چلا۔ محلہ میں قدم رکھا تو وہاں تو قیامت اٹھی ہوئی تھی۔ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ بھاگ رہے تھے۔ میں نے ایک ایک سے پوچھا۔ جواب دینے کا کسے ہوش تھا۔ ایک بھلے ہمسائے نے بھاگتے بھاگتے کہا، مرزا صاحب حملہ ہونے والا ہے۔ بس نکل چلو۔ میں قدم مارتا اپنے گھر پہنچا۔ اہل خانہ سے کہا کہ بی چلو اٹھو۔ دلی سے ہمارا دانہ پانی اٹھ گیا۔ اب یاں جینے کا دھرم نہیں رہا۔ وہ بولیں، اے ہے کونسی قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم جدی پشتی یاں پہ بیٹھے ہیں۔ اٹھاؤ چولہا تھوڑا ہی ہیں کہ کپڑے جھاڑے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا کہ اے نیک بخت، قیامت ہی تو اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور دم کے دم میں پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ تو اس بی بی نے زمین پکڑی تھی اور میں غل مچا رہا تھا کہ کپڑے جھاڑو اور نکل چلو۔" رکے، بولے "سو میاں، ایسا وقت دیکھا ہے ہم نے۔ خدا ایسا وقت دشمن کو نہ دکھائے۔ پر میاں ہم نے تو دیکھا اور بھوگا۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ وہ ایسا ہی وقت تھا۔"

"اور پتہ ہے ہماری اہل خانہ نے کراچی آ کر پہلی شکایت کیا کی۔ اے ہے یاں پہ جمنا ندی تو ہے ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ نیک بخت، یاں سمندر ہے۔ کہا کہ اس بخت مارے سمندر کو دیکھ کے تو میرے دل میں ہولیں اٹھیں ہیں۔" رکے۔ پھر بولے "مگر بھائی رفتہ رفتہ ہم نے اس سمندری شہر میں بسر کرنا سیکھ لیا۔ اب تم سوچ رہے ہو گے کہ مرزا گڑے مردے اکھاڑ رہا ہے۔ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔ ارے ہم نے تو مردے کو داب کے سو من مٹی اس پہ ڈال دی تھی۔ سب کچھ بھلا کے یاں بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر

اب جانے کیوں وہ باتیں یاد آ رہی ہیں، جیسے ابھی کل کی بات ہو۔"

مرزا صاحب چپ ہو گئے۔ کتنی دیر تک چپ بیٹھے رہے۔ میں بھی چپ رہا۔ پھر افسردہ لہجہ میں بولے۔ "جواد میاں، یہ آج کی بات نہیں ہے۔ مسلمانوں نے کبھی اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ جب بہت دل دکھتا ہے تو میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ مرزا ولاور بیگ کس کی شکایت کرتے ہو۔ سوچو کہ تمہاری تاریخ میں کیا ہو تا رہا ہے۔ سچی بات ہے جواد میاں، ہم اپنی تاریخ کے ڈسے ہوئے ہیں۔ کسی سے نہیں ڈرتے ہم۔ بس اپنی تاریخ سے ڈرتے ہیں۔" چپ ہوئے۔ پھر بڑبڑانے لگے۔ "ایک ہمارے مولانا حالی تھے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ خوب مسدس لکھ گئے۔ ہمارے ابا حضور اسے پڑھ پڑھ کے رویا کرتے تھے۔

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے۔

اس مقام پہ آ کے ان کی بڑکی بندھ جاتی تھی۔ یہ بندۂ درگاہ کہتا ہے کہ وہاں جا کے کیوں دیکھے۔ ادھر عبرت کا سامان کم ہے۔ مگر کوئی دیکھے بھی۔ کمبختوں کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔" رکے۔ پھر بولے "ویسے میں یہ نہیں کہتا کہ ادھر نہ دیکھے۔ ضرور دیکھے۔ وہ بھی تو ہماری ہی تاریخ ہے۔ اور کیا عبرت بھری تاریخ ہے۔" لمبا ٹھنڈا سانس۔ "جواد میاں عبرت، اگر کوئی حاصل کرے تو۔ میں کہتا ہوں اندلسی بہت بدنصیب تھے۔ کیا عمارت کھڑی کی اور اپنے ہی ہاتھوں سے اسے ڈھا دیا۔"

مرزا صاحب رواں تھے اور مجھے وہ برس یاد آ رہے تھے جب میں مرزا صاحب کا مستقل سامع تھا۔ اپنی سارے سٹاف میں سے انہوں نے اپنے سامع کے طور پر جانے کیا دیکھ کر ایک مجھے چن لیا تھا۔ تاریخ کا یہ ورق تو انہیں ازبر تھا۔ دلی کے چھٹنے کا غم ابھی ان کے یہاں تازہ تھا۔ دلی کی عظمت رفتہ کا ذکر کس ولولہ اور کس حسرت سے کرتے تھے۔ اس ذکر میں قرطبہ اور غرناطہ کا حوالہ ہر پھر کر آتا تھا۔ اس حوالے کے ساتھ ہی زقند بھرتا اور اندلس میں نکل جاتا۔ وہ غم جب ماند پڑ گیا تو یہ حوالہ بھی ان کے یہاں سے غائب ہو گیا۔ یا ممکن ہے آتا ہو میں ان سے اب ملتا کہاں تھا۔ اس دفتر کو سلام کرنے کے بعد ان سے ملنا تو کبھی کبھار ہی کا رہ گیا تھا۔ اور اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں مجھ پہ مرزا صاحب ہی کا تو سایہ نہیں پڑ گیا۔ کمال ہے مجو بھائی کو تو تاڑ لینا چاہئے تھا۔ یہاں آ کر وہ

بھی چوک گئے۔ مگر نہیں۔ فوراً ہی میں نے اپنے اس وہم کی تردید کر ڈالی۔ میں ان کے پرسوز بیانات سن لیتا تھا، متاثر بالکل نہیں ہوتا تھا۔ بس جیسے اپنے دادا میاں کی باتیں سنتا تھا۔ مگر دادا میاں کی باتیں تو واقعی میں شوق سے سنتا تھا۔

"بھائی بندے علی، اندلسیوں کی تاریخ پڑھ کر بہت افسوس ہوتا ہے۔ عبرت کا دفتر ہے، عبرت کا دفتر۔"

"صحیح کہتے ہیں آپ۔"

"مگر بھائی بندے علی معجزے اس زمانے میں بہت ہوئے۔ کم نصیب مسلمان پھر بھی نہ سمجھے۔ ایک واقعہ تو کمال ہے۔"

بندے علی نے حقے کا گھونٹ لیا اور غور سے دادا میاں کو دیکھا "وہ کیا واقعہ ہے۔"

"کہتے ہیں کہ جب مسلمانوں کی کتابیں جلائی جا رہی تھیں۔"

"کتابیں بھی جلائی گئی تھیں۔ انہوں نے کیا قصور کیا تھا۔"

"یہ قصور کم تھا کہ مسلمانوں نے انہیں لکھا تھا۔ بھائی بندے علی، باب الرملہ کے مقام پر دس لاکھ کتابوں کا ڈھیر لگا کے ان میں آگ لگا دی گئی۔ کہتے ہیں کہ ان میں کلام پاک کا بھی ایک نسخہ تھا۔"

"کلام پاک بھی جلایا گیا۔" بندے علی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بدن میں رعشہ دوڑ گیا۔

"بھائی سنو تو سہی۔ جب سب کتابیں جل گئیں تو خلقت یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ایک کتاب راکھ کے ڈھیر میں پڑی الگ چمک رہی ہے۔ ذرا جو اس پہ آنچ آئی ہو۔ کھول کے جو دیکھا تو پتہ چلا کہ قرآن ہے۔"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ" بندے علی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اور اسی کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ مرزا صاحب اگر ہمارے دادا میاں کے زمانے میں ہوتے تو ان سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی۔ بس وہ بھی بندے علی کے برابر بیٹھے حقہ پیتے اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کا ورد کرتے نظر آتے۔ تو خیر آج زمانے بعد میں نے ان کی گفتگو میں یہ حوالہ دیکھا تھا۔ زمانے بعد ہی اس طرح اپنے مخصوص جذباتی

لہجہ میں گفتگو کرتے دیکھا تھا۔ آج وہ اکیلے بھی تو تھے۔ اچھی بی کے سامنے ان کا چراغ کہاں جلتا تھا۔ اس وقت اچھی بی نہیں تھیں تو انہیں اپنے لئے کھلا میدان مل گیا تھا۔ پھر مجو بھائی بھی نہیں تھے۔ اکیلا میں تھا۔ ایسا خاموش سامع شاید زمانے بعد ہی انہیں میسر آیا تھا۔ ابھی وہ اٹھنے پہ مائل تو نظر نہیں آتے تھے۔ ابھی تو وہ اپنے اصل موضوع پر آئے تھے۔ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ یہی تو ان کا مرغوب موضوع تھا۔ اس تاریخ کے کتنے ورق انہیں ازبر تھے۔ مجھے تو یہ ڈر کھائے جا رہا تھا کہ وہ کہیں مسدس سنانی شروع نہ کر دیں۔ مجھے تو پچھلا تجربہ یاد تھا مسدس کا ذکر آیا اور وہ ریشہ خطمی ہوئے۔ بس پھر شروع ہو جاتے تھے۔ کتنے بند زبانی یاد تھے۔ خیر ہوا یوں کہ بیچ بیچ میں میری آنکھیں مند جاتیں۔ اس سے شاید انہیں احساس ہو گیا کہ میں توجہ سے ان کی بات نہیں سن رہا یا شاید یہ احساس ہوا ہو کہ انہوں نے ایک مریض پر زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ ان کی شرافت تھی اور شائستگی کہ اس احساس کے بعد یعنی جو بھی انہیں احساس ہوا اس کے ساتھ ہی بس اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اچھا عزیز، میں نے تمہاری بہت سمع خراشی کی۔ اب تم آرام کرو۔ میں چلتا ہوں۔"

"ارے مرزا صاحب بیٹھئے نا۔ زمانے بعد تو آپ ادھر آئے ہیں۔"

"نہیں عزیز۔ بس تمہاری خیریت معلوم کرنی تھی۔ گھر میں مجھے ٹکا رہی تھیں کہ جاؤ خیریت معلوم کرو اور مجھے بھی پریشانی تھی سو میں آگیا۔ مریض کو زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہئے۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ شفا دینے والا اللہ ہے۔ ویسے بھی ماشاء اللہ اب تم رو بصحت ہو۔" تامل کیا۔ پھر بولے "ہاں ایک بات ہے۔ دیکھو یہ جو مجو بھائی ہیں وہ تمہارے جلے پاؤں کی بلی۔ انہیں تو لپکا ہے مارے مارے پھرنے کا۔ جب تک چار گھر نہ جھانک لیں انکا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ بھلا یہ زمانہ یوں گھومنے پھرنے کا ہے۔ یہ تو وہ زمانہ ہے کہ آدمی بس منہ چھپا کر گھر میں بیٹھ جائے۔ تو اب عزیز تمہیں برا لگے یا اچھا بہرحال ہمارا تمہیں مشورہ یہ ہے کہ تم ذرا احتیاط برتو۔ آرام کرو۔ جب اچھے ہو جاؤ اور انشاء اللہ جلدی ہی اچھے ہو گے اس کے بعد بھی نکلنے سے ذرا احتراز کرو۔ باہر کچھ ہوتا رہے تمہاری بلا سے۔ اللہ نے فضل کیا، جان بچ گئی۔ ان بدبختوں نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان کے لئے تو کلاشنکوف طمنچہ ہے۔ چلانے میں کوئی

باک ہی نہیں ہے۔ ارے ہم تو غلیل بھی اس بے تکلفی سے نہیں چلاتے تھے۔ غلے آخر کنکر پتھر تو نہیں تھے۔ انہیں تیار کرنے میں وقت لگتا تھا، محنت کرنی پڑتی تھی۔ تو یہ نہیں کہ کوئی گزسل، کوئی چڑیا دیکھی اور فوراً غلہ داغ دیا۔ پہلے سوچنا پڑتا تھا۔ ان لوگوں کی طرح نہیں کہ آدمی ان کے لئے چڑیاں طوطے ہیں اور کارتوس کنکر پتھر، کمبختوں کے ہاتھوں میں کھجلی ہوتی رہتی ہے۔ آدمی انہیں نظر آ جائے۔ کمبخت پھر رکتے تھوڑا ہی ہیں۔ آدمی کی جان اتنی سستی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بس خدا بری گھڑی سے بچائے۔" یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے مرزا صاحب آپ تو واقعی جا رہے ہیں۔"

"ہاں میرے عزیز، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ اور میرا معاملہ بھی یہ ہے کہ باہر ذرا دیر ہو جائے تو ہماری اہل خانہ کا دل ہولنے لگتا ہے۔ وہ بھی بچی ہیں۔ میاں زمانہ ہی ایسا ہے۔ ہمارے ہمسائے کی سنو۔ لکھنؤ کے ہیں، سید زادے ہیں۔ انہیں صدر جانا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی لیتے چلنا۔ ذرا بینک جانا ہے۔ مقررہ وقت سے ذرا دیر سے پہنچے۔ بولے قبلہ معاف کیجئے، اماں حضرت نے امام ضامن باندھنے میں دیر کر دی۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیوں، کیا لمبے سفر پہ جا رہے ہو۔ کہا کہ نہیں۔ بس حضور کو بینک پہ اتارنا ہے اور بندے کو صدر میں تھوڑا کام ہے۔ ہم نے پوچھا، پھر امام ضامن کس خوشی میں، بولے کہ جب سے حالات خراب ہوئے ہیں۔ اماں حضرت نے دستور یہ بنایا ہے کہ ہمارے دہلیز سے قدم نکالنے سے پہلے امام ضامن باندھتی ہیں اور کلام پاک کے نیچے سے ہمیں نکالتی ہیں۔ میں کہتا ہوں، بالکل ٹھیک کرتی ہیں۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔" چلتے چلتے رکے۔ بولے، "میاں ہماری ایک بات یاد رکھو۔ ہماری تم سے زیادہ عمر ہے۔ ہم نے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ زمانے کے آثار اچھے نہیں ہیں۔ یہ مسلمان، خدا انہیں عقل دے، کمبخت اپنی تاریخ کو دہرانے پہ تلے ہیں۔" یہ کہا اور تیزی سے نکل گئے۔

مرزا صاحب کے جانے کے بعد میں کتنی دیر تک آنکھیں موندے بے سدھ پڑا رہا۔ شاید باتیں سنتے سنتے تھک گیا تھا۔ مرزا صاحب لگاتار بولے تھے۔ نعمت خان یخنی لے کر آ گیا۔ پی کر بدن میں تھوڑی گرمی اور چستی آئی۔ مگر مرزا صاحب اپنی باتوں سے جو فضا پیدا کر گئے تھے۔ اس سے نکل نہیں پا رہا تھا۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ پھر اسی رو میں

بہہ چلا ہوں۔ خیال یہ تھا کہ خدا خدا کر کے خلوت میسر آئی ہے۔ خود کو یکجا کروں گا اور جس رو میں بکھرا بکھرا بہہ رہا ہوں اس پہ بند باندھوں گا۔ مگر مرزا صاحب اپنی باتوں سے ایسا سماں باندھ گئے، ارے ایسا ویسا سماں، یوں دلی کے اجڑنے کا ذکر اوتا اوتا ہی سا کیا تھا۔ مگر یہی تو ماہر فنکاروں کا کمال ہوتا ہے کہ چند خطوط کھینچ کر پوری تصویر بنا دیتے ہیں۔ مختصر فقروں میں پوری پوری تاریخ۔ جس سے ڈرتے ہیں اسی کی طرف کھنچتے ہیں۔ میاں ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔ بس اپنی تاریخ سے ڈرتے ہیں۔ عجب بات ہے، اچھی بی سمندر سے ڈرتی ہیں، مرزا دلاور بیگ تاریخ سے ڈرتے ہیں۔ کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے۔ اور اپنے کھنڈر، ہو حق کرتی جامع مسجد، سنسان سیڑھیاں، کہیں ایک سیڑھی پہ رکھا ہوا ایک پنجرہ، پنجرے میں پھڑپھڑاتا شور کرتا تیتر۔ بارہ بارہ کوس تک نہ آدمی نہ چراغ کی روشنی۔ جہان آباد شہر بے چراغ۔ غرناطہ میں چراغ ابھی ٹمٹما رہا تھا۔ عبداللہ کا تندور بھی اسی طرح گرم تھا کہ نان سنک سنک کر نکل رہے تھے اور ان کی سوندھی سوندھی باس حرارت بھری فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔ مگر ابن حبیب پر کوئی اثر نہیں تھا نہ حرارت کا نہ سوندھی باس کا۔ گم متھان بیٹھا تھا۔ عبداللہ نے غور سے اس کی صورت دیکھی اور یوں بولا کہ "اے یار عزیز، میں دیکھتا ہوں کہ آج تیرا طور کچھ بے طور ہے۔ میرے ہاتھ کے پکائے ہوئے نان کو بھی جسے کھا کر اہل غرناطہ ہونٹ چاٹتے ہیں تو نے آج یوں کھایا ہے جیسے وہ کوئی باسی روٹی ہے۔ اے عزیز، تیرے اس طور سے میں کیا سمجھوں۔ کچھ کہہ کہ تو آج اتنا پراگندہ خاطر کیوں ہے۔"

ابن حبیب نے تامل کیا۔ پھر بولا "اے یار، اب تو آئے دن ہی میں اس شہر میں ایسا کچھ دیکھتا ہوں کہ میری پراگندہ خاطری بڑھ جاتی ہے اور دل میں سو طرح کے اندیشے گزرتے ہیں۔ میں زمانے کے الٹ پھیر کو دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ یہ تیرا شہر ایک وقت میں میرے لئے آغوش مادر تھا اب خوف کا سمندر ہے۔ آج کا ماجرا سن۔ میں القیصریہ سے گزر رہا تھا کہ ناگاہ ایک مرد درویش کہ مجذوب معلوم پڑتا تھا کسی سمت سے بلند آواز سے ولا غالب الا اللہ کا ورد کرتا نمودار ہوا۔ خیابان کے بیچ کھڑے ہو کر آسمان کی سمت نگاہ کی اور بولا جیسے اعلان کر رہا ہو کہ **و تعزمن یشاء و تزل من یشاء** پھر تامل کر کے پکارا، افسوس، افسوس، افسوس۔ اس

شاد آباد کوچہ کے دلال، دوکاندار، بزاری بزاری، سوار پیادے یہ سن ٹھٹھکے اور دم بخود رہ گئے۔ ایک بزرگ نے ہمت کرکے استفسار کیا کہ اے مرد حق آگاہ، تو کس بات پر افسوس کرتا ہے۔ مرد درویش نے غور سے اس بزرگ کو دیکھا۔ پھر بولا " آگے کلام کی اجازت نہیں ہے۔" اور آگے بڑھ لیا۔ میں نے تیزی سے اس کا تعاقب کیا۔ مگر وہ قریب ہی کی پتلی ستلی ایسی گلی میں داخل ہوا اور چھلاوا بن گیا۔ میں نے ارد گرد کی ساری گلیاں چھان ماریں۔ مگر وہ نہ ملا۔ " ابن حبیب چپ ہو گیا۔ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر افسردہ لہجہ میں بولا " کسے ڈھونڈنے نکلا تھا اور کسے ڈھونڈنے لگا۔"

عبداللہ نے متجسس نظروں سے ابن حبیب کو دیکھا "اے یار یہ تو کیسی بات زبان پر لایا۔ تو کسے ڈھونڈنے نکلا تھا۔"

"اسے جسے میری نظریں سدا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔"

عبداللہ کا تجسس اس کلام سے اور زیادہ ہوا۔ "تیری نظریں کسے سدا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔"

ابن حبیب نے تامل کیا۔ پھر یوں گویا ہوا کہ "اے مرے یار جانی، اب تجھ سے کیا پردہ۔ جو زخم ابھی تک میں نے چھپا کر رکھا تھا وہ اب تجھے دکھاتا ہوں۔ وہ مہ لقا جس کا نام کلثوم ہے مرے دل کے نہاں خانے میں بسی ہے۔ بس یہ ترستی آنکھیں اسی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں۔"

"کلثوم، کون کلثوم۔ کچھ بتا کہ وہ اس شہر جمیل کے کس کوچے میں رہتی ہے۔ اتا پتہ دے تو میں تیری جستجو میں تیری مدد کروں۔"

ابن حبیب نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "کاش وہ اس شہر میں ہوتی۔ وہ چاند مالقہ کی خاک سے ابھرا تھا۔ دل و جان سے میں اس پر فدا تھا۔ اس کے دیدار کی آرزو میں دن دن بھر اس معنبر کوچے کا طواف کرتا۔ جب دیدار ہو جاتا تو دنوں اس تصور سے سرشار رہتا۔ کیا سراپا تھا۔ بھاری کولھے، بھری گات، زلف سیاہ جیسے کالی گھٹا۔ چہرہ جیسے کالی گھٹا کے بیچ چودھویں کا چاند۔ مالقہ سے عجب خلقت سراسیمہ نکل رہی تھی اس ہنگام میں وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئی۔ پچھلے دنوں مجھے گمان سا ہوا کہ شاید وہ اسی شہر میں یہیں کہیں ہے۔ تب سے بےقرار پھرتا ہوں۔ کوچہ کوچہ اسے ڈھونڈتا ہوں۔"

عبداللہ سن کر بولا کہ "مجھے پہلے ہی شک ہوا تھا کہ میرا یار عزیز دل زدہ ہے اور مجھ سے کچھ چھپاتا ہے۔"

"آج بھی یہی کچھ ہوا۔ میں اس کی تلاش میں کوچہ کوچہ کی خاک چھانتا پھرتا تھا کہ اس مرد درویش سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ پھر میں اس کے تعاقب میں چلا۔ القیصریہ سے نکل زنافتہ الوری میں آیا۔ وہاں سے باب الرملہ کی طرف نکل گیا۔ وہاں پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔"

"وہ کیوں۔"

"پتہ نہیں۔ مگر جب بھی میرا گزر باب الرملہ کی طرف ہوتا ہے جانے کیا ہوتا ہے کہ میں ٹھٹھک جاتا ہوں۔ خیر تو میں باب الرملہ سے نکلا اور چلتا چلتا اتنی دور جا نکلا کہ مدینتہ المرا کی برجیاں اور کنگرے نظر آنے لگے۔ اسی آن طائر کی وہی پراسرار پھڑپھڑاہٹ جیسے بہت قریب سے آئی ہو۔ مجھے ایک خوف نے آلیا۔ فوراً ہی پلٹ لیا۔"

ابن حبیب خاموش ہوگیا۔ عبداللہ کہ خاموشی سے سن رہا تھا اسی طور خاموش رہا اور ساکت بیٹھا رہا۔ دیر بعد اس نے زبان کھولی اور یوں گویا ہوا "اے ابن حبیب، خدا تیرے حال پہ رحم کرے، تیرے اندیشے سن سن کر میرے اندیشے جنہیں میں نے کوشش کرکے سلا دیا تھا جاگنے لگے ہیں۔ یہ ماجرا سن کر مجھے اہل بغداد سے سنی ایک روایت یاد آگئی۔"

"عزیز، وہ کیا روایت ہے۔"

"اے یار، وہ روایت اس طرح ہے کہ ایک دن جب دونوں وقت مل رہے تھے۔ ایک ٹیڑھے پنجوں اور مڑی ہوئی چونچ والا سیاہ رنگ طائر بغداد کے آسمان پر اس طرح نمودار ہوا جیسے کالی بدلی آگئی ہو۔ وہ قصر خلافت پر اترا اور سب سے اونچے کنگرے پر بیٹھ کر انسانی آواز میں پکارا۔ "اے اہل بغداد، اے اہل بغداد۔" تین مرتبہ وہ اس طرح پکارا جیسے خبردار کر رہا ہو اور نامعلوم سمت میں اڑ گیا۔ یہ پکار پورے بغداد میں سنائی دی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیسا پرندہ تھا اور کیسی اس کی پکار تھی۔ مگر سب دہل گئے۔ اور اس کے بعد جو ہوا کہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی وہ تو تو جانتا ہی ہے۔"

عبداللہ نے ٹھنڈا سانس لیا اور چپ ہوگیا۔ پھر دونوں ہی دیر تک چپ بیٹھے رہے اور تندور سے نکلتے شعلوں کو تکتے رہے۔ کتنی دیر تک وہ اسی طرح گم سم بیٹھے رہے تاآنکہ تندور کے بیچ دہکتے انگاروں پر راکھ جمتی چلی گئی اور بھوبھل دھیرے دھیرے کر کے ٹھنڈی ہوگئی۔ یہ دیکھ عبداللہ اور ابن حبیب دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل گئے۔

عبداللہ اور ابن حبیب تندور کے ٹھنڈا ہو جانے پر وہاں سے اٹھے تھے۔ مگر ان کے اندر جو ایک تندور بک رہا تھا۔ اس گرمی میں جس نے انہیں بکل کر رکھا تھا وہ چلتے چلتے جا رہے تھے۔ رات بھیگ چلی تھی۔ القیصریہ کی گلیاں اب خاموش تھیں۔ بڑے چوک میں بھی روشنیاں ماند ہوتی جا رہی تھیں۔ ساتھ میں چہل پہل بھی۔ عبداللہ اور ابن حبیب نے یہاں سے نکل کر باب الرملہ کی راہ لی۔ پھر رابطہ التوت سے گزر کر باب البنود کی طرف چلے۔ آگے مساجد الجوزہ تھی۔ اس طرف سے ہوتے ہوئے، حمام الجوزہ سے گزرتے ہوئے باب الوری کی سمت ہو لئے۔ لگتا تھا کہ آج کی شب وہ سارے غرناطہ کو کھوند ڈالیں گے۔ چلتے چلتے جب تھک گئے تو فج الوزہ کے قریب جا کر ٹھٹھکے۔ "اے یار عزیز، اب میری ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔" اور یہ کہتے کہتے عبداللہ ایک حوض کی کنارے سنگ مرمر کی شفاف نشست پر ایسے بیٹھا جیسے ڈھیر ہو گیا ہو۔

ابن حبیب بھی قریب آ کر بیٹھ گیا اور بولا "تو نے صحیح کہا۔ آج ہم نے لمبا گشت کیا ہے۔ میری ٹانگیں شل ہو چکی ہیں۔ مگر عجب بات ہے کہ دل اسی طرح بکل ہے اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔"

"جانے رات کی یہ کونسی گھڑی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ رات ڈھلنی شروع ہو گئی ہے۔" یہ کہتے کہتے عبداللہ نے آسمان پر نظر ڈالی جہاں دور تک پھیلے ستارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ "لگتا ہے کہ پورے مدینتہ الغرناطہ میں اس ساعت صرف دو نفوس بیدار ہیں اور بکل۔ باقی سب محو خواب ہیں۔"

"اے عزیز عبداللہ۔" ابن حبیب سوچتے ہوئے بولا "مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ تو بہت کچھ جانتا اور سمجھتا ہے مگر جانے کس باعث اپنے لب سی لئے ہیں۔ یا شاید تو مجھے

اس کا اہل نہیں جانتا۔"

تب پھر عبداللہ یوں لب کشا ہوا۔ "اے مرے یار عزیز' تو نے غلط قیاس کیا۔ میرے پاس بتانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ میں اگر جانتا ہوں تو بس اتنا کہ ایک وقت کشتیاں جلانے کا ہوتا ہے اور ایک وقت کشتی بنانے کا۔ وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا جب ہم سے اگلوں نے ساحل پر اتر کر سمندر کی طرف پشت کر لی تھی اور اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ اب بھرتا سمندر ہمارے پیچھے نہیں' ہمارے سامنے ہے۔ اور ہم نے کوئی کشتی نہیں بنائی ہے۔"

ابن حبیب یہ سن کر رویا اور بولا کہ "اے یار عزیز' میں نے صحیح جانا تھا کہ تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اور اے کاش میں یہ جاننے کی کوشش نہ کرتا کہ تو کیا جانتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ جب بھی تو زبان کھولتا ہے میں دہل جاتا ہوں۔ اے عبداللہ جان لے کہ میں ایک خوفزدہ روح ہوں۔ تیری باتیں سن کر میں زیادہ خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ اب مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ طائر ہیں کہیں اڑ رہا ہے۔ بس اچانک کسی گھڑی-----------"

"صاب جی' کھانا لاؤں۔"

"کیا۔" میں نے ہڑبڑا کے نعمت خان کو دیکھا۔

اصل میں مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب نعمت خان آیا۔ پہلے بھی وہ بہت آہستگی سے کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ اور اب شاید میرے آرام کے خیال سے وہ زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ دبے قدموں کمرے میں داخل ہوتا جیسے بتاشوں پہ چل رہا ہے۔ تو پتہ نہیں کس وقت وہ دبے قدموں آ کر میرے پلنگ کے برابر آن کھڑا ہوا تھا۔

"کھانا---------اچھا تیار ہو گیا-----------ہاں لے آؤ۔"

نعمت خان کی بات کا جواب دینے کے لئے مجھے کتنی دور سے واپس آنا پڑا۔ مگر واپس آ کر بھی شاید واپس نہیں آیا تھا۔ کھانا کھا ضرور رہا تھا مگر اس طرح کہ میکانکی انداز میں نوالہ منہ میں جاتا اور منہ چلنے لگتا۔ ادھر منہ چل رہا تھا ادھر اندر چکی سی چل رہی تھی۔ منہ اپنا کام کر رہا تھا' بھٹکتا دھیان اپنا کام کر رہا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ اندر بیٹھا دھنیا پھر اپنے کام سے لگ گیا تھا۔ دھنک دھنک روئی دھنی جا رہی تھی۔ میں حیران بھی ہوا کہ

کپاس تو تھوڑی ہی تھی۔ دھنے جانے کے ساتھ روئی کا کتنا انبار لگ گیا ہے۔ اصل میں ابھی تک وہی عمل چل رہا تھا کہ میری اپنی یادوں میں دنیا جہان کی یادیں آ ملی تھیں۔ اس وقت تو خیر میں نڈھال تھا۔ اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ پرائی یادوں کو اپنی یادوں میں رلنے ملنے سے روک سکوں۔ اب اتنا بے سکت تو نہیں تھا۔ حالت کافی بہتر تھی۔ کہاں رقیق چیزوں پر گزارہ تھا۔ کہاں اب شوربے کے ساتھ پھلکا کھا رہا تھا۔

"صاب، آپ نے بہت کم کھایا" نعمت خاں میری خوراک سے مطمئن نظر نہیں آتا تھا۔

"نعمت خاں، اور کتنا کھاؤں۔ اتنا تو کھا لیا۔ کئی دن کے بعد آج سیر ہو کر کھایا ہے۔"

"اصل میں جی، آپ کی بھوک کم ہو گئی ہے۔ خوراک پوری کھائیں گے۔ پھر جان آئے گی۔"

"اچھا پانی پلاؤ۔"

نعمت خان نے جلدی سے پانی کا گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں نے پانی پیا، اور فوراً ہی بیٹھے سے لیٹ گیا۔ بستر پہ بیٹھے بیٹھے ہی تو کھانا کھایا تھا۔ فوراً ہی آنکھیں مندنے لگیں۔ خیال تھا کہ نیند آ رہی ہے۔ سو جاؤں گا۔ مگر اندر کی دھنک دھنک نے سونے نہیں دیا۔ روئی کا انبار لگتا چلا جا رہا تھا۔ مگر ہاں میں کیا کہہ رہا تھا کہ اس وقت تو اتنی نقاہت تھی کہ دنیا جہان کی یادوں باتوں کو اپنی یادوں میں رلتے ملتے دیکھ رہا تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اتنا بے دم نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ عمل جاری تھا۔ شاید اب مجھے اس کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ کہاں کہاں کی واردات، کہاں کی بات۔

"میرے لال، کتنی دفعہ سنو گے وہ کہانی۔"

"پھوپھی اماں، ایک دفعہ اور۔"

"اچھا تو سنو۔ ایک تھی مینا۔ اس کا پڑوسی تھا ایک کوا۔ مینا تو گھر والی تھی۔ یہ بخت مارا نگھرا تھا۔ مینا روز شام پڑے اپنے گھونسلے میں گھس جاتی اور رات آرام سے گزارتی۔ کوا بیچارہ تھکا ہارا آتا اور مینا کے گھونسلے کے برابر والی ٹہنی پہ بیٹھ کے اونگھنے لگتا۔ ایک دن مینا نے طعنہ دیا کہ اے بھیا کوے، تم کب تک بے گھر بے در رہو گے۔

کوے کو مینا کی بات کھا گئی۔ سوچا کہ مجھے بھی گھر بنانا چاہئے۔ اور ایسا گھر ہو کہ مینا بھی اسے دیکھ کے عش عش کرے۔ تو بھیا اس کوے نے ایک بنئے کی دکان میں کول لگایا۔ بار بار اندر جاتا اور نمک کی ایک ڈلی چونچ میں دبا کے لے آتا۔ اس طرح اس نے بہت سا نمک جمع کر لیا۔ اس نمک سے اس نے اپنا گھر بنایا۔"

"پھوپھی اماں، نمک کا گھر۔" منّن کتنا حیران ہو رہا تھا۔

"ہاں بیٹا، نمک کا گھر۔ گرمی کی دوپہروں میں ایسا چمکے تھا جیسے نمک کا نہ ہو، شیشے کا گھر ہو۔ مگر اس کے بعد آگئی برسات اور لگ گیا جھکا۔ اے لو وہ مکان تو مینہ میں گھل گھلا کے ختم ہو گیا۔ مینا نے طعنہ دیا کہ اے بھیا، تم نے گھر بنایا بھی تو نمک کا۔ تمہیں پتہ نہیں تھا کہ موسم سدا ایک سا نہیں رہتا۔ گرمی کے بعد برسات تو آنی ہی تھی۔ نمک ہی تو تھا، گھل گیا۔ مینا کی بات کوے کو تیر بن کے لگی۔ اس نے سوچا کہ اب کے ایسے سامان سے گھر بناؤ جس پہ برسات اثر نہ کرے۔ بس یہی سوچ کے اس نے بہت سارا موم جمع کیا اور گھر بنانا شروع کر دیا۔ اس کا موم محل برسات میں دھل کے ایسا لگے تھا جیسے سنگ مرمر کا بنا ہوا ہو۔ برسات کے بعد جاڑے آئے کوے نے پورا موسم آرام سے گزارا۔ مگر بھیا اس کے بعد آگئی گرمی۔ اے بھیا دھوپ جو چمکی تو سارا موم پگھل گیا۔ کوے کا گھر پھر ڈھے گیا بلکہ بہہ گیا۔ کوا بہت اداس ہوا۔ ٹھنڈا سانس بھر کے بولا کہ مجھ کوے کی قسمت میں گھر نہیں۔ اور پھر پہلے کی طرح ٹہنی پہ بسیرا کرنے لگا۔"

میرا دھیان پھر ناگیشری رانی کی طرف چلا گیا۔ صحیح روئی تھی۔ پچھلا جنم یاد آنا تو ایک مصیبت ہے۔ حافظہ اپنے محدود دائرے میں گردش کرتا رہے بس اسی میں عافیت ہے۔ حافظہ کی بھی اپنی ایک لکشمن ریکھا ہوتی ہے۔ اس ریکھا سے قدم نکالا اور مصیبت میں پھنسے۔ آگے تو جنگل ہی جنگل ہے۔ ایسا جنگل جس کا کوئی اور چھور نہیں ہے۔ اور پھر راکشس۔ تو ناگیشری رانی صحیح روئی بلکہ اسے تو زیادہ ہی رونا پڑ گیا۔ اس کارن کہ راجہ کو بھی اپنا پچھلا جنم یاد آگیا۔ بلکہ راجہ کو تو اس سے بھی پچھلا جنم یاد آگیا۔ مصیبت در مصیبت۔ ایک جنم خوار ہونے کے لئے کیا کم ہوتا ہے۔ پھر دوسرا جنم کیوں۔ اور خالی دوسرا نہیں جنموں کا تو کوئی انت ہی نہیں۔ جنم جنم کی خواری۔ ناگیشری رانی سمجھ رہی تھی کہ جب وہ اور راجہ ہنس ہنسنی تھے اور مانسرو ور جھیل کے کنارے رہتے تھے۔ تب

بہت سکھی تھے۔ مگر وہ سکھ کتنے دن کا تھا۔ پھر آندھی چل پڑی۔ اس آندھی میں وہ پھر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ناگیشری رانی کو یہ بات ذرا بعد میں یاد آئی۔ وہ پھر دکھی ہو گئی۔ میمونہ کو دیکھو۔ اسے یہ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ پھوپھی اماں نے یہ کہانی کب سنائی تھی۔ جب اسے یاد آیا تو بالکل گم سم ہو گئی۔ پھر اسے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ آندھی میں بچھڑ کر پھر مل گئے تھے "کب ملے تھے؟ نہیں ملے تھے"

"ملے تھے" میں نے اصرار کیا اور کہانی کے بعد کے حصے کی کئی ایک تفصیلات اسے یاد دلائیں۔ مشکل سے اسے یاد آئیں "اچھا تو پھر مل گئے ہوں گے۔" ایسے کہا جیسے اسے ان کے ملنے کا اعتبار نہ آیا ہو۔ اور پھر ایسی چپ ہوئی کہ دیر تک بولی ہی نہیں اور سخت اداس۔

"بیچاری ہنسنی کی بپتا نے تمہیں اداس کر دیا۔" میں نے اسے چھیڑا کہ شاید اسی طرح کچھ بولے۔

"خیر وہ تو کہانی ہے" آخر وہ بولی "اصل میں مجھے اماں یاد آ گئیں۔"

اب میں اداس ہو گیا۔ پھوپھی اماں مجھے وہاں رہتے ہوئے ویسے تو مستقل یاد آ رہی تھیں۔ لیکن اس وقت میمونہ نے ان کا ذکر اس طرح کیا کہ میں افسردہ ہو گیا۔ ان کے نہ ہونے کا اس وقت کچھ زیادہ ہی شدت سے احساس ہوا۔ یہ بڑی بھابھی کے درمیان میں کود پڑنے سے پہلے کی بات ہے۔ بلکہ اس کے بعد تو اور شدت سے یہ احساس ہوا پھوپھی اماں ہوتیں تو پھر یہ صورت تھوڑا ہی پیدا ہوتی۔ وہ ہوتیں تو میمونہ بھلا مجھ سے اس کھڑنل انداز میں بات کرتی۔ خیر یہ بات تو درمیان میں یونہی آ گئی۔ ذکر تو یہ تھا کہ پھوپھی اماں نے مجھے کہانیاں کتنی سنائی تھیں اور ہنس ہنسنی کی تو جانے کتنی کہانیاں انہیں یاد تھیں۔ ہنس ہنسنی کا ملنا اور بچھڑنا، پھر ملنا پھر بچھڑ جانا، جیسے ہجر و وصال کی ازلی ابدی داستان اصل میں ہنس ہنسنی کی کہانی ہے اور یہ کونسی اقلیم سے اڑ کر آتے تھے۔ اڑتے اڑتے کبھی کسی جھیل پر اتر پڑے کبھی کسی محل کی دیوار پر آن اترے اس رنگ سے کہ محل میں بیٹھی شہزادی انہیں دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی ہے۔ کبھی تال تلیوں سے بے پروا بستیوں اور بنوں سے بے تعلق، محلوں دو محلوں سے بے نیاز آسمان کی بلندیوں میں یوں اڑتے نظر آتے جیسے کسی پاک صاف جھیل میں تیر رہے ہیں اور

آن کی آن میں او جھل ہو گئے اور ہمیشہ بعد میں یہی پتہ چلتا کہ یہ تو کسی دور دیس کے راجہ رانی ہیں یا راجکمار راجکماری کہ اس جنم میں آکر ہنس ہنسنی بن گئے ہیں اور یہ کہ اب ہنس ہنسنی ہیں اگلے جنم میں انہیں پھر راجہ رانی بن جانا ہے۔ اس وقت مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ ہنس ہنسنی کی یہ ساری کہانیاں کیوں میرے حافظے میں امنڈ رہی ہیں۔ کیوں میں کوشش کر رہا ہوں کہ میمونہ کو بھی یہ کہانیاں یاد آجائیں اور کیوں وہ ہر کہانی کے حوالے پر ہنس ہنسنی کے ملنے بچھڑنے کے تذکرے پر چپ اور اداس ہو جاتی ہے۔ جیسے وہ بھی کسی پچھلے جنم میں ---------- مگر یہ احساس تو مجھے ستا رہا تھا کہ جیسے میرا کوئی پچھلا جنم تھا اور میں ---------- خیر بہر حال جبھی تو وہ سادھو مجھے رہ رہ کر یاد آ رہا تھا جو کہتا تھا کہ مجھے اپنا پچھلا جنم یاد ہے۔ کتنی بار خیال آیا کہ اسے ڈھونڈھنا چاہئے کہاں ہے وہ۔ جیتا ہے یا مر گیا۔ کب مرا؟ پچھلے جنم کا حال سنانے کے بعد؟ ---------- اچھے زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ دوارکا میں ان دنوں بن برستا تھا۔ مگر نگر اور بستیوں کا سدا ایک طور نہیں رہتا۔ پتہ نہیں کب بن برستے برستے قیامت ٹوٹ پڑے۔ "ہے نریندر، میں نے جب ساگر کی اور دیکھا تو کیا دیکھا کہ ساگر میں سانپ ہی سانپ جیسے ساگر نہ ہو سانپ ساگر ہو میں ترنت ہی وہاں سے پلٹا آگے چلا تو کیا دیکھا کہ ایک برکش تلے بلدیو جی بیرا سن مارے، آنکھیں موندے بیٹھے ہیں۔ پر منہ ان کا بھٹ کے سمان کھلا ہوا۔ اور ہے متر میں نے دیکھا کہ بلدیو جی جو سورماؤں بلوانوں کے بیچ سانڈ سمان تھے گھٹ گھٹا کے تنک سے رہ گئے تھے۔ نری ہڈیاں کہ مٹھی میں آجاویں۔ ان ہڈیوں کے بیچ منہ جیسے بانبی اور بانبی کے بھیتر سے نکلتا سانپ کہ جوگیوں کے انگ پر ملے بھبھوت کے سماں سفید۔ متر میں بھوچک رہ گیا"

نریندر گنیش کا منہ تک رہا تھا۔ پھر بولا "ہے گنیش پھر تو یہ نگر سنکٹ میں ہے۔ کوئی گیانی ہی یہ بتائے گا کہ یہ کیا لیلا ہے۔ میں تو جانوں کہ ہم گورو شمبھو مہاراج کے پاس چلیں اور ان سے پوچھیں۔"

دونوں ترنت ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بھاگے دوڑے واں پہنچے۔ گورو کے چرن چھوئے، ڈنڈوت کیا، اور ہاتھ باندھ کے چپ بیٹھ گئے۔ گورو مہاراج نے کتنی دیر بعد آنکھیں کھولیں، بڑھی ہوئی سفید پلکوں کے بیچ سے انہیں دیکھا اور آنے کا کارن پوچھا۔

"ہے گورو مہاراج میں نے ایسی انہونی دیکھی ہے کہ بتاتے ہوئے جی کانپتا ہے۔"

"میرے شش، تو نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔"

"ہے گورو، نہ دیکھنے پر بھی اتنا کچھ دیکھ لیا۔ بلدیو جی کے منہ کو بانبی بنتے دیکھا۔ بانبی سے سانپ نکلتے دیکھا۔"

گورو مہاراج نے آنکھیں موند لیں۔ پھر آنکھیں کھولیں۔ بڑبڑائے اوم، تت ست۔ اوم تت ست۔" پھر گھور کر نریندر کو دیکھا "ہے متھر انگری کے باسی، تو یاں پہ کیا کر رہا ہے۔ جاتا کیوں نہیں۔"

"گورو مہاراج یہ نگر مجھے جانے نہیں دیتا۔"

"کیا کہت ہے۔"

"میں روز بھور بھئے اپنی گٹھری بغل میں داب نکلتا ہوں۔ پر جب نگر سے پاؤں باہر نکالنے لگتا ہوں تو سامنے کھڑے پیپل کی پھننگ سے ایک نیل کنٹھ پھڑپھڑا کے اڑتا ہے اور میرا رستہ کاٹ جاتا ہے۔ میں وہیں سے لوٹ آتا ہوں۔"

گورو مہاراج چپ رہے۔ پھر بولے "ہے مورکھ، متھرا کی اجڑی نگری میں دکھ تھوڑے تھے کہ تو یاں پہ کشٹ کھینچنے آگیا۔ جا اپنے نرک میں جاکے اپنے دکھ بھوگ۔ ہمیں اپنے نرک میں اپنے کشٹ کھینچنے دے۔

"اور مہاراج وہ نیل کنٹھ۔"

"نیل کنٹھ۔ وہ اب کہاں ہے۔ سانپ نے سب پنچھیوں کو نگل لیا۔"

"اور گورو مہاراج، ہم ------------ ہو سانپ تو ------------

"گنیش بولتے بولتے کانپ اٹھا اور چپ ہو گیا۔

گورو مہاراج نے جواب میں آنکھیں موند لیں اور بڑبڑانے لگے "اوم تت ست۔ اوم تت ست، اوم تت ست۔" ٹرر ٹرر، ٹرر ٹرر، ٹیلی فون کی گھنٹی "ہیلو۔ اچھا رفیق صاحب۔ جی ---------- مجو بھائی۔ انہیں تو پہلے آپ ہی کی طرف جانا تھا۔ یہی کہہ کر نکلے تھے کہ پہلے رفیق صاحب کی طرف جاؤں گا۔ انہیں ساتھ لے کر غازی صاحب کے جلسہ میں جاؤں گا۔"

"ہاں ہاں وہ ادھر آئے تو تھے۔ مگر میرے دماغ میں کیا پھوڑا نکلا تھا کہ غازی صاحب کا وعظ سننے جاتا۔ اتنا فالتو وقت تو مجو بھائی ہی کی پاس ہے۔ اصل میں میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ابھی گھر پہنچے ہیں یا نہیں۔ نہیں پہنچے ہیں تو میں نکلتا ہوں اور جاکر دیکھتا ہوں بھلا آج کل کے جلسوں میں شرفا کا کیا کام۔ پتہ نہیں وہاں کیا ہوا ہے۔"

رفیق صاحب کا گھبرایا ہوا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ جلسہ میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔

"کیوں، وہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"ہمارے علاقہ میں جلسہ ہو اور گڑبڑ نہ ہو۔ کچھ نہ کچھ ہوا ہی ہو گا۔ جاکر دیکھتا ہوں۔"

"رفیق صاحب۔" میں اب فکرمند ہو چلا تھا" آپ نے تو فکر میں ڈال دیا۔"

"نہیں یار زیادہ فکر کی بات نہیں ہے۔ یہاں یہی ہوتا رہتا ہے۔ گڑبڑ تھوڑی ہوتی ہے۔ یہاں ہماری گلی کے لوگ اپنی طرف سے اس میں کلی پھندنے ٹانک دیتے ہیں۔"

"مگر تشویش کی بات تو ہے۔"

"وہ تو ہر صورت میں ہے۔ بہر حال آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپس آکر فوراً آپ کو فون کروں گا۔"

"بلکہ میں یہ کروں گا کہ مجو بھائی کو وہاں سے لے کر سیدھا ادھر ہی آؤں گا۔"

"جلدی آیئے۔"

"جلدی ہی آؤں گا۔"

فون بند ہو گیا۔ ریسیور رکھ کر میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ نعمت خان کھڑا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ اس شخص کو کیا ہوا۔

پوچھنے لگا "کیا کہتے ہیں رفیق صاب جی۔"

"بتا رہے تھے کہ غازی صاحب کے جلسہ میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"جواد صاب جی، واں پہ تو بم پھٹا ہے۔ بہت جانیں گئی ہیں۔ اللہ رحم کرے۔"

میرے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ رفیق صاحب اتنے گھبرائے ہوئے کیوں تھے۔

"تم نے کس سے سنا۔ لوگ افواہیں بھی تو اڑاتے ہیں۔"

"نہیں جی۔ یہ افواہ نہیں ہے۔ سوسائٹی میں تو تہلکہ پڑا ہوا ہے۔"

"اچھا۔" بس اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اندر سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"بھلا مجو صاب جی واں پہ کیوں گئے تھے۔"

"ہونے والی بات کا پہلے سے کسی کو پتہ تو نہیں ہوتا۔"

"اللہ رحم کرے اور مجو صاب جی خیریت سے گھر آ جائیں۔"

"فکر نہ کرو اللہ رحم ہی کرے گا۔ رفیق صاحب انہیں لینے گئے ہیں۔ انہیں لے کر ادھر ہی آئیں گے۔"

"اچھا کس وقت تک آ جائیں گے۔"

"بس جلدی ہی آئیں گے۔"

نعمت خان تھوڑی دیر پریشان کھڑا رہا جیسے اب اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ آگے کیا بات کرے اور کیا پوچھے۔ پھر خاموشی سے وہاں سے سرک گیا۔ ادھر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ جو میں اپنے خیالوں میں غرق لیٹا تھا وہ ساری کیفیت ہی اب زائل ہو چکی تھی۔ دماغ جو ذرا سے اشارے پر بھٹکتا اور کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ اس وقت اپنی ساری چوکڑی بھول گیا تھا بس جیسے بن ہو گیا ہو۔ کتنی دیر تک میں بت بنا بیٹھا رہا۔ چونکا اس وقت جب نعمت خان نے آہستگی سے کھانا سامنے لا کر رکھ دیا۔ وہی اپنا پرہیزی کھانا۔ اس نے کہا میں نے کھانا شروع کر دیا۔ کیا کھایا کیا نہیں کھایا، پتہ ہی نہیں چلا۔ پھر اسی طرح گم صم۔

دیر بعد پھر نعمت خان نے کمرے میں جھانکا "اب تو بہت دیر ہو گئی۔ آئے نہیں۔"

"ہاں اب تک تو آ جانا چاہئے تھا" میں نے کوشش کی کہ میرے لہجے سے کسی قسم کی تشویش ظاہر نہ ہو۔

"اللہ خیر کرے۔" نعمت خان نے آہستہ سے کہا اور باہر نکل گیا۔ مگر زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ نعمت خان پھر آہستہ سے کمرے میں داخل ہوا۔ قریب آ کر پوچھا "کوئی فون بھی نہیں آیا۔"

"نہیں۔" میں نے خشک لہجہ میں کہا۔

"جانے کیا بات ہے کہ اتنی دیر لگا دی۔"

میں کتنی دیر سے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ مگر نعمت خان بار بار کمرے میں آتا بس کوئی ایک فقرہ کہتا مگر ایسا کہ اپنے آپ کو اطمینان دلانے کی میری ساری کوشش پہ پانی پھر جاتا۔ اب وہ میرے پلنگ کے قریب ہی آکر فرش پر اس طرح پسر گیا تھا کہ اس کا سر میری پٹی سے لگ رہا تھا۔ ٹھیک کہ ایسے وقت میں ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ مگر اسی صورت میں کہ بات کریں کہ جس سے جی بہلے، جہاں دھیان ہے وہاں سے دھیان ہٹے۔ مگر میری خاموشی کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے بھی جیسے منہ سی لیا ہو۔ تو وہ بھی چپ میں بھی چپ۔

"صاب جی" آخر اس نے زبان کھولی "آپ سو جائیں آپ کو تو ویسے بھی ڈاکٹر نے آرام کرنے کے لئے کہا ہے۔ تو آپ سو جائیں میں جاگ رہا ہوں۔ ٹیلی فون آیا تو بھی سن لوں گا۔"

"ٹھیک ہے سو جاؤں گا۔ نیند آئے تو سہی۔"

"طبیعت پریشان ہو تو نیند مشکل ہی سے آتی ہے" اس نے آہستہ سے کہا اور چپ ہو گیا۔

"آپ جی رفیق صاب جی کے گھر ٹیلی فون کر کے تو ذرا پوچھیں پتہ تو چلے کہ ---------------- وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

اس تجویز نے مجھے واقعی سوچنے پر مجبور کیا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ مگر پھر جلدی ہی میں نے فیصلہ کر لیا۔ سوچا کہ رفیق صاحب کی بیگم خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گی۔ میں نے نعمت خان کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ اتنی رات گئے گھر پر فون کرنا اور گھر والوں کو بے آرام کرنا کچھ مناسب بات نہیں ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے" وہ بڑبڑایا اور چپ ہو گیا۔

"صاب جی" کتنی دیر بعد اس نے زبان کھولی "ویسے تو میں جاگ رہا ہوں مگر نیند کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ یہ کمبخت تو سولی پہ بھی آجاتی ہے۔ تو اگر میری آنکھ لگ جائے اور دروازے کی گھنٹی بجے تو جی آپ دروازہ کھولیں نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی" میں اصل میں اس کی بات پر کچھ چکرا سا گیا تھا۔

"صاب جی آج کل کسی کا کوئی اعتبار نہیں لوگ تو دن کے وقت بھی کنڈی لگا کے بیٹھتے ہیں یہ تو رات کا ٹیم ہے۔ میں تو جی بھگت چکا ہوں۔"

"بھگت چکے ہو؟ کیا بھگت چکے ہو۔" مجھے کسی قدر تجسس ہوا۔ "وہ جی میں جو صاب جی کو جو بتا رہا تھا۔ پر پوری بات کہاں بتائی تھی۔ آپ تو دونوں ہسپتال میں تھے۔ میں گھر میں اکیلا۔ رات کا ٹیم رات کا منجھلا پہر ہو گا۔ دروازے کی گھنٹی بجی میں نے دل میں کہا کہ نعمت خان یہ تو گڑبڑ کی بات ہے اس ٹیم بھلا کون آدمی آئے گا۔ تو میں چپ رہا پھر گھنٹی بجی۔ پھر میں چپ تیسری دفعہ پھر گھنٹی بجی میں تو جی ایسے ہو گیا جیسے گھر میں ہوں ہی نہیں۔ اوپر کا سانس اوپر نیچے کا سانس نیچے۔ پھر گھنٹی نہیں بجی جیسے کوئی سیڑھیاں اتر رہا ہو۔ میں نے کہا نعمت خاں تم بچ گئے۔ جواد صاب جی وقت کو کوئی پتا نہیں ہوتا۔ اور یہ وقت تو ویسے ہی بہت خراب ہے۔"

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ جواب کوئی نہیں دیا۔ شاید اس بیان سے میں نے کوئی ایسا اثر بھی قبول نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اب میرے کان دروازے کی طرف تھے۔ جیسے اب گھنٹی بجی۔ دروازہ بے شک نہ کھولوں مگر پوچھوں گا تو سہی کہ کون ہے۔ یا یہ بھی نہیں پوچھنا چاہئے۔ یا ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ گھنٹی نہ بجائے بہت کان لگائے کہ قدموں کی آہٹ سنائی دے۔ کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔

"اصل میں جی مجھے اپنے باپ کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی" میری خاموشی سے فائدہ اٹھا کر وہ پھر جاری ہو گیا۔ "ہماری جی بہت چھوٹی سی بستی تھی۔ چاروں طرف جنگل ہی جنگل مجھے کام کے لئے شہر جانا پڑے ۔ لوٹتے ہوئے شام پڑ جاتی تھی کبھی کبھی بالکل ہی رات ہو جاوے تھی۔ ویسے تو جی میرے پاس لاٹھی ہووے تھی پر پھر بھی دل دھکڑ پکڑ کرتا رہوے تھا۔ ایک بات میرے باپ نے مجھ سے کہہ رکھی تھی کہ للا رات کو یا سناہٹی دوپہر میں اگر کوئی تجھے پکارے اور دکھائی نہ پڑے تو پلٹ کے جواب مت دیجیو۔ ایک بیری ایسا ہی ہوا۔ شہر سے لوٹ رہا تھا بیچ جنگل میں تھا کہ رات پڑ گئی۔ لاٹھی پٹختا اور کھنکھارتا چلا جا رہا تھا۔ کہ ایسا لگا کہ کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ کان لگائے۔ وہ تو جی سچ مچ کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ نعمت خان میں نے جیسے کانوں میں کڑوا تیل ڈال لیا

ہو۔ جواب میں ہنکارا بھی نہیں بھرا۔ بس دل ہی دل میں قل پڑھنی شروع کردی۔ بس پھر آواز نہیں آئی۔ اس وقت تو جی قل مجھے پوری یاد تھی۔ روز جو پڑھنی پڑھتی تھی۔ اب بہت دن سے پڑھی نہیں تھی تو یاد نہیں رہی۔ آپ جی مجھے یاد کرادیں۔" رکا پھر کہنے لگا" اس وقت تو جی ایسا تھا کہ جب بھی جنگل میں رات پڑ جاتی کچھ نہ کچھ ہو ہی جاوے تھا۔ بس پھر قل ہی کام اوے تھی۔ ایک بیری تو ایسا ہوا جی کہ میں بہت ہی ڈر گیا۔ گھنی رات ہو گئی۔ میں بیچ جنگل میں۔ پیڑ ایسے لگیں جیسے بھوت کھڑے ہیں۔ چلا جا رہا تھا کہ ایک پیڑ کی ٹہنیوں میں چھپا ہوا کوئی پرندہ تھا۔ ایک دم سے پھڑپھڑایا۔ پھڑپھڑاہٹ اور پھر لمبی قائیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بس فوراً ہی قل پڑھنی شروع کردی" نعمت خان نے جھرجھری لی اور چپ ہو گیا۔

پرندہ خود دکھائی نہ دے بس رات کے سناٹے میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے اور قائیں کی لمبی آواز جس سے فضا گونج جائے۔ ڈرنے کی بات تو ہے۔ مگر ابن حبیب نے اس کی آواز کبھی نہیں سنی۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی نہیں۔ بس شہپروں کی سنسناہٹ جیسے کوئی بڑا پرندہ تیزی سے اڑتا ہوا برابر سے نکل گیا ہے۔ بس اسی سے ایک انجانا ڈر اس کے اندر سما گیا تھا۔ کتنے وسوسے اس کے اندر پل بڑھ رہے تھی کہ کبھی کبھی پورا شہر ہی اسے کھانے کو آتا ہے۔

"اے عبداللہ یہ تیرا شہر عجب ہے کہ مجھے جس شدت سے رجھاتا ہے اسی شدت سے ڈراتا ہے۔ مسجدوں، حماموں اور باغوں سے معمور یہ شہر کتنی آہستہ سحر بن کر مجھ پر چھاتا چلا گیا، میرے اندر اتر گیا۔ کتنی دفعہ مجھے گمان ہوا کہ بھاری کولھوں والی وہ میری مہ لقا یہیں کہیں ہے۔ اس کے لئے میں نے اس شہر کو کتنا کھوندا ہے۔ مگر شاد آباد کوچوں میں مہکتے حماموں کے قریب سے گذرتے ہوئے، شہتوتوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں چلتے ہوئے کبھی کبھی عجب سا احساس ہوتا ہے۔ کہ جیسے میں خرابے میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ اور اے عبداللہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اشبیلیہ جسے میں بھول چلا تھا۔ میرے خوابوں میں واپس آگیا ہے۔" ابن حبیب چپ ہوا تامل کیا۔ پھر افسردہ لہجہ میں بولا "مگر رات میں نے عجب خواب دیکھا۔ جسے میں وہاں گیا ہوں اور شاداں و فرحاں پھر رہا ہوں۔ جیسے وہی گھر ہے، وہی ہمارے جد امجد والا۔ میں خوش ہوں۔ پھر چونکتا ہوں۔

پوچھ رہا ہوں کہ وہ جو کنوئیں کے برابر کھجور کھڑی تھی۔ وہ شجر سایہ دار یہاں سے کہاں غائب ہو گیا۔ مگر کوئی جواب ہی نہیں دے رہا ہے۔ میں پریشان ہوں پھر کیا دیکھتا ہوں کہ دیوار پہ بیٹھی ایک بلی مجھے گھور رہی ہے۔ میں ڈر جاتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ وہ جو ہماری بزرگ بلی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"صاب جی ٹیلی فون بج رہا ہے۔"

میں نے ہڑبڑا کر خاموش رکھے ٹیلی فون پر نظر ڈالی "نہیں کوئی نہیں بج رہا ہے۔"

نعمت خاں نے جماہی لی اور سوچتے ہوئے بولا "اچھا پر مجھے ایسا ہی لگا تھا۔ بس مجھے جھونکا آ گیا تھا۔ اور پھر لگا کہ ٹیلی فون بج رہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔" پھر اس نے ایک جماہی لی اور نیند بھری آواز میں بولا "اب میں جانوں پچھلا پہرا ہے۔ بس صبح ہونے کو ہے۔"

اس کے یہ کہنے سے مجھے احساس ہوا کہ واقعی یہ تو بیٹھے بیٹھے پوری رات گذر گئی۔ اور اسی کے ساتھ مجھے ایک دم سے نیند کا ایک جھونکا سا آیا۔ بیٹھے بیٹھے میں تھوڑا کھسکا اور لیٹ گیا۔ بس تکئے پہ سر رکھا اور فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی اور آنکھ لگی سو لگی۔ ذرا جو پتہ چلا ہو کہ کب چڑیاں بولیں۔ کب مرغے نے بانگ دی۔ کب اذان ہوئی بس پھر ٹیلی فون کی گھنٹی ہی سے میری آنکھ کھلی۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ریسیور اٹھانے لگا تھا کہ بند ہو گیا۔ جانے کتنی دیر سے بج رہا تھا اور کتنی دیر بج بج کر خاموش ہو گیا۔ نعمت خان کمرے میں نہیں تھا۔ ممکن ہے اپنی کوٹھری میں جا کے سو گیا ہو۔ آخر کسی نہ کسی وقت اسے بھی تو نیند آنی تھی اور اس نے ٹھیک کہا کہ کمبخت نیند ایسی چیز ہے کہ سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ تو فون بند ہو چکا تھا اور مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ ساری رات جاگ کر اسی وقت سونا تھا اور سو بھی گیا تھا تو اس طرح کیوں سویا کہ سرہانے رکھے فون کی گھنٹی بجتی رہی اور کمبخت آنکھ نہیں کھلی۔ اسی فون کا تو ساری رات انتظار رہا تھا اور اسی کے آنے کے ہنگام آنکھ لگ گئی۔ مگر خیر فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا "ہیلو کون رفیق صاحب۔ ہاں جلدی سے بتائیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خیریت تو ہے نا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں ہاں آئیے مگر مجو بھائی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیوں

---------- تو آپ اکیلے ---------- مگر کیوں مجو بھائی کیوں
---------- اچھا پھر میں انتظار کر رہا ہوں۔"

مجو بھائی نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا۔ یہی کہتے رہے کہ آرہا ہوں، میرا انتظار کرو۔ پھر بھی بہت کچھ واضح ہو گیا۔ مگر واضح ہونے کے باوجود میں آس اور یاس کے بیچ معلق تھا۔ جان حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔ رفیق صاحب جلدی سے آئیں۔ کسی طرح اس تذبذب سے تو نجات ملے۔

نعمت خان جانے کس وقت کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے جب نظر اٹھائی تو وہ خاموش کھڑا مجھے تک رہا تھا۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہا کہ "رفیق صاحب آرہے ہیں۔ جلدی پہنچنے والے ہیں۔ چائے بناؤ"

"اچھا جی۔ کہتے کیا ہیں۔"

"آتو رہے ہیں۔ چائے بناؤ"

نعمت خان مطمئن تو کیا ہوتا۔ اب شاید زیادہ ہی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مزید کوئی سوال کرے یا چلا جائے۔ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر کہتے کہتے رک گیا اور باہر چلا گیا۔

رفیق صاحب نے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ مگر میں ان کے آتے آتے آس اور یاس کے دوراہے سے گذر لیا تھا اور اپنے سارے اضطراب سے فارغ ہو لیا تھا۔ سو جب وہ آئے تو مجھے یہ جاننے کی کوئی پریشانی نہیں تھی کہ وہ کیا کہیں گے۔

"رات تو اتنی افراتفری تھی" رفیق صاحب بیٹھتے ہوئے کہنے لگے "کہ کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ کہ کس کے ساتھ کیا گذری اور کون کہاں ہے۔ کس عالم میں ہے۔ اموات تو ہوئی ہیں مگر زخمی زیادہ ہوئے ہیں۔ تو بہر حال توقع تو یہی ہے ----------
ہسپتال کے اندر باہر عزیزوں رشتہ داروں کا بہت ہجوم تھا۔ مگر کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اتنی جلدی کیسے پتہ چل سکتا تھا۔ ہسپتال کا عملہ بھی اپنی جگہ سچا تھا" رفیق صاحب کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ دلجوئی زیادہ کر رہے ہیں۔ حقیقت حال کم بیان کر رہے ہیں۔ وہ بول رہے تھے اور میں خاموش ان کا منہ تک رہا تھا۔ میرے پاس کرنے کے لئے کوئی سوال نہیں تھا۔ ظاہر کرنے کے لئے کوئی اضطراب بھی نہیں تھا۔ رفیق صاحب نے بولتے بولتے

مجھے دیکھا پھر وہ بھی چپ ہو گئے۔

نعمت خان چائے لے کر آ گیا۔ اس نے خود ہی چائے بنائی۔ چائے بنا کر ایک ایک پیالی ہم دونوں کے سامنے سرکا دی۔ پھر سر جھکا کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ چائے واقعی بہت گرم تھی۔ دونوں پیالیوں سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ پھر بھاپ بیٹھ گئی۔ چائے ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔ ہم اسی طرح گم صم بیٹھے رہے۔ نہ کوئی بات کی نہ پیالی کو ہاتھ لگایا۔

چائے ٹھنڈی ہوتے ہوتے بالکل ہی ٹھنڈی ہو گئی۔ سمجھئے کہ برف ہو گئی۔ ہم اسی طرح گم بیٹھے تھے، اتنے گم کہ جنبش تک نہیں کی۔ بس جیسے ساکت ہو گئے ہوں۔ دو خاموشی کے تودے بیچ میں ٹھنڈی چائے سے لبریز دو پیالیاں۔

کتنی دیر کے بعد رفیق صاحب نے جنبش کی۔ اٹھ کھڑے ہوئے "اچھا میں چلتا ہوں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ تکلیف تو اب نہیں ہے۔"

"نہیں"

"ہاں ٹھیک ہے۔ مگر زیادہ ہلیں جلیں نہیں۔ زخم مندمل ہونے میں وقت لے گا۔ بس آرام کریں۔" پھر چلتے چلتے جھجکتے ہوئے کہا "ویسے ابھی میں مایوس نہیں ہوں۔ پھر ادھر ہی جا رہا ہوں۔ کیا خبر ہے کہ ---------" میں چپ رہا۔

رفیق صاحب کمرے سے نکل رہے تھے کہ نعمت خان آہستہ سے قریب آیا اور مرے لہجہ میں بولا "رفیق صاب جی اب کیا ہو گا۔"

"نعمت خان تمہیں تو اللہ پر بہت بھروسہ ہے۔"

"ہاں جی، اور کس پر بھروسہ کریں۔"

"تو بس اس پر بھروسہ رکھو۔ میں پھر ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

رفیق صاحب چلے گئے۔ ان کے ساتھ ہی نعمت خان بھی کمرے سے نکل گیا۔ دروازے تک انہیں چھوڑنے گیا ہو گا۔ مگر پھر واپس میری طرف نہیں آیا۔ گھر ہی میں ہو گا۔ مگر ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ بھی جا چکا ہے۔ اب میں اکیلا تھا۔ بالکل اکیلا۔ جیسے رات پڑ گئی ہو اور میں اکیلا جنگل میں چلتا ------------ چلنا کیا معنی، میں تو بیٹھا بیٹھا تھا۔ جہاں بیٹھا تھا۔ بس وہیں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اب میں یہاں سے ہل نہیں

سکتا۔ جگہ نے جہاں میں بیٹھا ہوں مجھے باندھ لیا ہے۔ میں بندھا بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک وقت کا احساس باقی رہا ہوتا تو اندازہ ہوتا کہ کتنی دیر تک میں یوں دم بخود بیٹھا رہا۔

کتنی دیر بعد میں نے پھریری لی۔ بچہ بنے کب تک بیٹھے رہو گے۔ دل ہی دل میں اپنے اپ کو کتنی ملامت کی۔ ایک دوست ڈھونڈنے کے لئے نکلا ہوا ہے۔ واقعی، کیا خبر ہے کہ ------ زندگی بہت ارزاں ہو گئی ہے مگر سخت جان بھی ہے اور پھر زندگی میں معجزے بھی تو ہوتے ہیں۔ تو میں نے کیوں اتنی جلدی فرض کر لیا اور صبر کر لیا۔ مجھے بھی ڈھونڈنے کے لئے نکلنا چاہئے ایک پھریری سی آئی کہ برقی رو کی مثال پورے جسم میں دوڑ گئی۔ میں یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

دہلیز سے قدم نکالتے نکالتے میں ٹھٹھکا۔ یہ کونسا شہر ہے۔ وہی شہر۔ تو پھر میں وہی نہیں ہوں۔ اس جانے بوجھے شہر میں اچانک میں اجنبی بن گیا تھا۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سامنے جنگل پھیلا ہوا تھا، اور رات پڑ چکی تھی۔ پھر؟ کب تک یوں ڈانواڈول کھڑا رہوں گا۔ ہمت باندھی۔ اپنے تذبذب پہ قابو پایا۔ ان قدموں نے اس شہر کے کوچوں کی بہت خاک چھانی ہے۔ خود ہی راستہ تلاش کر لیں گے۔

کتنی دیر تک چلتا رہا۔ میں نہیں۔ قدم خود ہی راستہ تلاش کرتے رہے، بڑھتے رہے، مسجدیں، حمام، درخت شہتوت کے، زیتون کے، کھجور کے، ان رستوں کو تو میں پہنچانتا ہوں۔ یہ حمام الجوزہ ہے اور یہ رابطہ التوت ہے۔ یہ زناقتہ الوری آ گیا۔ اس راہ پہ گیا تو مدینتہ الحمرا میں جا کر نکلوں گا۔ یہاں سے میں القیصریہ کی طرف مڑ گیا۔ رحبات المسجد الاعظم۔ مسجد الاعظم اتنی خاموش۔ نمازی کہاں گئے۔ جامع التابعین کی طرف سے گزرا تو اسے بھی خاموش پایا۔ باب النبود سے گذر کر مسجد القطانین کی طرف ہو لیا۔ عبداللہ کے تندور کے پاس سے گزرا تو حیران رہ گیا تندور ٹھنڈا پڑا تھا اور عبداللہ۔ وہ کہاں گیا۔ حیران و پریشان باب الزیاد کی راہ پہ پڑ لیا۔ چلتے چلتے اچانک ٹھٹھک گیا۔ یہ کونسے کوچے میں نکل آیا ہوں یہ تو باب الرملہ ہے۔ مگر باب الرملہ اور اتنا خاموش۔ دونوں وقت مل رہے تھے، مل کر جدا ہو رہے تھے پھر چراغ کیوں روشن نہیں ہوئے۔ آگ بجھ چکی تھی۔ خلقت کہ یہاں امنڈی ہوئی تھی۔ تتر بتر ہو چکی تھی۔ باب الرملہ

بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ راکھ بہت اڑ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں کوئی ادھ جلا ورق کسی دیوان کا، کسی صحیفہ کا، کسی فیلسوف کے مخطوطے کا، کسی صوفی کے ملفوظات کا، باقی سکوت تھا۔ صرف ایک بلی بیچ راہ میں بیٹھی اپنی کنجے ایسی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

انتظار حسین

مجموعہ:
- جنم کہانیاں
- قصہ کہانیاں

ناول:
- بستی
- تذکرہ
- چاند گہن
- آگے سمندر ہے

افسانے:
- خیمے سے دور
- زمین اور فلک اور
- آخری آدمی
- کنکری
- دن اور داستان
- خالی پنجرہ
- گلی کوچے
- کچھوے
- شہر افسوس

تراجم:
- گھاس کے میدانوں (ناول) چیخوف
- فلسفہ کی نئی تشکیل (فلسفہ) جان ڈیوی
- An unwritten Epic other stories

ISBN 969-35-0616-2